ملک العلما شاہ محمد ظفر الدین قادری رضوی علیہ الرحمہ

مرتب اعزازی

نبیرۂ ملک العلما ڈاکٹر طارق مختار

ترتیب و تقدیم

ساحل سہسرامی (علیگ)

ترغیب و تشویق

پیرزادہ اقبال احمد فاروقی ایم اے

ایڈیٹر جہانِ رضا لاہور

ملک العلما شاہ محمد ظفر الدین قادری رضوی علیہ الرحمہ

مرتب اعزازی
نبیرۂ ملک العلما ڈاکٹر طارق مختار

ترغیب وتشویق
پیرزادہ اقبال احمد فاروقی ایم اے
ایڈیٹر جہان رضا لاہور

ترتیب وتقدیم
ساحل سہسرامی (علیگ)

نام کتاب: نافع البشر فی فتاوٰی ظفر (۱۳۴۹ھ)

فتاوٰی ملک العلماء (۲۰۰۵ء)

مصنف: ملک العلماء الشاہ محمد ظفر الدین رضوی قادری (م ۱۹۶۲ء)

موضوع کتاب: فتاوٰی بہ فقہ حنفیہ

سال تصنیف: ۱۳۴۹ھ

سال طباعت: ۱۴۲۶ھ۔ ۲۰۰۵ء

ترتیب وتقدیم: علامہ ساحل شہسرامی (علیگ)

ترغیب وتشویق: پیرزادہ اقبال احمد فاروقی

مقدمہ وکلمات تکریم: ڈاکٹر مختار الدین احمد (علی گڑھ)

ناشر: ارشاد احمد رضوی ساحل شہسرامی۔ المجمع الرضوی بریلی شریف

تعداد: ۱۱۰۰

صفحات: ۵۱۲

قیمت: ۳۰۰روپے

تقسیم کاران کتاب

المجمع الرضوی: ۱۸۲ محلہ سوداگراں بریلی شریف

مکتبہ نعیمیہ: مٹیا محل جامع مسجد دہلی

کتب خانہ امجدیہ: ۴۲۵ مٹیا محل جامع مسجد دہلی

مکتبہ نبویہ: گنج بخش روڈ لاہور پاکستان۔

ادارہ تحقیقات امام احمد رضا: ریگل چوک کراچی پاکستان

پاکستان میں رابطہ آفس

مکتبہ نبویہ۔ گنج بخش روڈ۔ لاہور

0300-4235658

شرف انتساب

فقہائے احناف خصوصاً

☆ سراج الامۃ امام اعظم ابو حنیفہ نعمان ابن ثابت رضی اللہ عنہ
☆ عطائے رسول خواجہ سید معین الدین حسن چشتی حنفی رضی اللہ عنہ
☆ امام اہل سنت اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری حنفی قدس سرہٗ
☆ فقیہ اعظم ہند علامہ مفتی محمد شریف الحق امجدی حنفی علیہ الرحمہ

کی بارگاہِ قدس میں نذر گدایانہ

چہ از صفائے ارادت زنم بمہر تو دم
ضمیر پاک ، دل روشنت گواہِ من است

گدائے بے نوا

ساحل

تقریظ جلیل

تاج الشریعہ علامہ مفتی محمد اختر رضا خان قادری ازہری

قائم مقام مفتیٔ اعظم ہند، بریلی شریف

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

پیش نظر فتاویٰ ملک العلما حضرت علامہ شاہ مفتی محمد ظفر الدین قادری رضوی علیہ الرحمہ کے ہیں۔ حضرت ملک العلما میرے جدامجد اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خاں قادری برکاتی بریلوی قدس سرہ کے خاص فیض یافتہ تلمیذ، مسترشد اور خلیفہ ہیں جنھوں نے اپنی پوری زندگی اعلیٰ حضرت کے مسلک عشق ومحبت یعنی سنیت کی ترویج واشاعت میں گذاری۔ اعلیٰ حضرت قدس سرہ نے بھی حضرت ملک العلما کے ساتھ ہمیشہ خصوصی شفقت کا معاملہ رکھا۔ اپنے مشہور قصیدہ ''الاستمداد'' میں فرماتے ہیں۔

میرے ظفر کو اپنی ظفر دے

اس سے شکستیں کھاتے یہ ہیں

آج ملک العلما کے مرتب فتاویٰ دیکھ کر دل ودماغ میں ان کی یاد پھر سے تازہ ہوگئی اور دل کو بے حد مسرت کا احساس ہوا۔ اپنی علالت کے سبب اس مجموعۂ فتاویٰ کو خود تو پڑھ نہ سکا لیکن ان فتاویٰ کے مرتب عزیز القدر مولانا ارشاد احمد رضوی مصباحی ساحل شہسرامی سلمہ سے کچھ اقتباسات اور ذیلی عنوانات سنے۔ جس قدر فتاویٰ میں نے سنے، خوب ہیں۔ مرتب نے مجھے بتایا کہ بیشتر فتاویٰ اس دور کے ہیں، جب ملک العلما بریلی شریف میں قیام رکھتے تھے۔ حضرت ملک العلما کے چھ گراں قدر فقہی رسالے بھی اس میں شامل ہیں جو اس مجموعے کی افادیت کو دو چند کرتے ہیں۔

ملک العلما کے ان چند منتشر فتاویٰ کو مرتب سلمہٗ نے بہت کاوش سے مرتب کیا ہے اور اس پر ایک مبسوط تقدیم بھی تحریر کی ہے جو فقہ کی تعریف، تاریخ وغیرہ اور ملک العلما کی فقاہت کے گوشوں کو محیط ہے۔ یہ تقدیم بہت معلوماتی اور شائقین فقہ کے لیے کارآمد ہے۔

اللہ تعالیٰ مرتب موصوف کو اس فقہی خدمت پر جزائے خیر دے اور دین وسنیت کی مزید خدمت کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور مجموعۂ فتاویٰ کو مقبول عام اور مفید انام بنائے۔ آمین بجاہ سید المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم

الفقیر محمد اختر رضا القادری الازہری غفرلہ

الفقیر محمد اختر رضا القادری الازہری غفرلہ

کلمات تکریم

پروفیسر مختار الدین احمد
وائس چانسلر مظہر الحق عربی فارسی یونیورسٹی، پٹنہ
وسابق صدر شعبۂ عربی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

والد ماجد ملک العلما حضرت مولانا شاہ محمد ظفر الدین قادری رضوی علیہ الرحمہ علم وفضل، زہد وتقویٰ میں معاصرین ایک ممتاز شناخت رکھتے تھے۔ انہیں یہ امتیاز بارگاہ الٰہی سے عطا ہوا تھا اور اس کے حصول میں ان کے مربی اور مرشد امام اہل سنت اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان علیہ الرحمہ کی بابرکت صحبت اور تربیت کا خاصا دخل تھا۔ فاضل بریلوی کی ممتاز ترین شناخت ان کی فقاہت اور فتویٰ نویسی ہے۔ میرا خیال ہے کہ ان کی بیشتر تصانیف کسی نہ کسی استفتا کا جواب ہیں۔ اس لئے والد ماجد بھی ان کے فیض یافتہ ہونے کی وجہ سے فقاہت کا خاص رنگ اور فتویٰ نویسی کی گہری بصیرت رکھتے تھے۔ دنیا انہیں ایک ماہر ہیئت داں، محدث، خطیب اور مناظر کی حیثیت سے پہچانتی رہی لیکن ان کی فقیہانہ بصیرت کی روشن دستاویز باضابطہ طور سے آج پہلی بار منظر عام پر آرہی ہے۔

والد ماجد علیہ الرحمہ نے فتویٰ نویسی کا آغاز اپنی طالب علمی کے زمانے سے ہی کر دیا تھا۔ ان کا سال فراغ ۱۳۲۵ھ ہے اور انہوں نے پہلا فتویٰ ۸ رمضان المبارک ۱۳۲۲ھ کو تحریر فرمایا، جب وہ فاضل بریلی کی بارگاہ میں حاضر ہو کر درس حدیث لینے اور فتویٰ نویسی سیکھنے میں مصروف تھے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد والد ماجد کی علمی مصروفیات میں گوناگوں اضافہ ہوگیا لیکن فتویٰ نویسی سے رشتہ اخیر دم تک قائم رہا، گرچہ وقفے کے ساتھ ہی سہی۔ لیکن قیام بریلوی کے ابتدائی سالوں کے علاوہ دنوں کے فتاویٰ کی نقلیں محفوظ نہ رکھی جاسکیں۔ اس میں ملک العلما کی نقل مکانی کا دخل رہا۔ وہ بریلی اور پٹنہ دو جگہ ہی زیادہ رہے، ورنہ اور سالوں میں قریب قریب سیمابی کیفیت رہی۔ بعد کے زمانے کے صرف وہی فتاویٰ محفوظ رہ سکے جو کتاب اور رسالے کی صورت اختیار کر گئے۔ چنانچہ زیر نظر مجموعے میں بھی شامل کئی رسائل بعد کے زمانوں کی یادگار ہیں۔

والد ماجد کے فتاویٰ کے دو رجسٹر ناچیز نے اپنے ذوق وشوق سے نوعمری کے زمانے میں نقل کئے تھے جب میں عربی فارسی کی ابتدائی درجات کا طالب علم تھا اور ہنوز مدرسے میں داخل نہیں ہوا تھا۔ اس کے ابتدائی صفحات میں حضرت ملک العلما نے جابجا اپنے قلم سے اصلاحات دی ہیں۔ جہاں جہاں مجھ سے الفاظ اور جملے نہیں پڑھے گئے، وہاں میں نے سادہ جگہ چھوڑ دی تھی۔ بعد میں جب شعور پختہ ہوا اور ان مقامات کی درستگی کی جانب توجہ کی تو والد ماجد کے دست مبارک کا تحریر فرمودہ اصل مسودہ مجھے دستیاب نہ ہو سکا جس سے میں نے یہ رجسٹر تیار کئے تھے۔ اس لئے وہ سادہ مقامات جوں کے توں رہ گئے۔ بعد میں کوئی مناسب آدمی نہ مل سکا جو ان کو درست کر کے

مرتب کرتا۔ بالآخر عزیز گرامی مولانا ارشاد احمد رضوی ساحل شہسرامی، ریسرچ اسکالر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے نام اس کارِ سعید کا قرعۂ فال نکلا اور انہوں نے بڑی جانفشانی اور خوبی کے ساتھ اس ''ہفت خواں'' کو طے کرلیا۔ اس سلسلے میں ان کے سپروائزر برخوردار ڈاکٹر طارق مختار سلمہٗ نے بھرپور تعاون کیا اور مسودات ومواد کی فراہمی میں ان کی قدم قدم پر رہنمائی کی۔

مجھے بے حد مسرت ہے کہ والد ماجد کی یہ قیمتی یادگار ان کے وصال کے چالیس سال بعد گوشۂ گمنامی سے نکل کر منظر عام پر آرہی ہے۔ اس گرامی کارنامے پر میں صمیم قلب کے ساتھ اپنے دونوں عزیزوں کو مبارک باد پیش کرتا ہوں اور بارگاہِ رب العزت میں دعا کرتا ہوں کہ مولیٰ تعالیٰ ان کی گرامی خدمات کو قبول فرمائے اور مزید در مزید سعادتوں کی توفیق بخشے۔ آمین!

مختار الدین احمد
ناظمہ منزل ۴/۲۸۶، سول لائن
امیر نشاں روڈ، علی گڑھ

تقریب

مفتی محمد نظام الدین رضوی مصباحی
صدر شعبۂ افتا، جامعہ اشرفیہ، مبارک پور

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حامداً ومصلیاً ومسلماً

جامع علوم عقلیہ ونقلیہ، ملک العلما، ابوالبرکات، حضرت مولانا ظفر الدین قادری رضوی علیہ الرحمۃ والرضوان اہل سنت وجماعت کے ممتاز عالم، جلیل القدر محدث، زبردست مناظر، بلند پایہ محقق، نامور مصنف، بالغ نظر فقیہ اور ماہر مفتی تھے۔ ان خوبیوں کی وجہ سے آپ ملک کے صفِ اول کے علما میں شمار کیے جاتے ہیں۔

فقہ وفتویٰ نویسی میں آپ کی ثقاہت ومہارت کے ثبوت کے لئے یہ سند کافی ہے کہ آپ نے عالم اسلام کے عبقری فقیہ اور فقید المثال مفتی اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خاں رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے زیر سایہ رہ کر فتویٰ نویسی کی تربیت حاصل کی اور پچپن سال تک اپنے فتاویٰ کے ذریعہ آپ خلقِ خدا کو فیضیاب کرتے رہے۔

مقدمہ صحیح البہاری میں ہے: ''مولانا (ظفر الدین رحمۃ اللہ علیہ) نے فاضل بریلوی سے صحیح بخاری شریف پڑھنی اور فتویٰ نویسی سیکھنی شروع کی''۔ (۱/۷)

اسی میں ہے: ''ان کی (حضرت ملک العلما کی) تدریسی زندگی کا آغاز بھی مدرسہ منظر اسلام بریلی ہی سے ہوا، جہاں ان کی تعلیم کی تکمیل ہوئی۔ تقریباً چار سال تک وہ وہاں درس دیتے رہے اور فاضل بریلوی کی ہدایت پر فتویٰ نویسی کی خدمات بھی انجام دیتے رہے۔ اس زمانے میں جو فتاویٰ انہوں نے لکھے، ان میں سے کچھ کی نقلیں نافع البشر فی فتاویٰ ظفر میں موجود ہیں''۔ (۱/۸)

اعلیٰ حضرت علیہ الرحمہ اپنے ایک مکتوب میں رقم طراز ہیں: ''مولانا مولوی ظفر الدین صاحب قادری سلمہٗ فقیر کے یہاں کے اعز طلبہ سے ہیں اور میرے بجان عزیز۔ ابتدائی کتب کے بعد یہیں تحصیل علم کی اور اب کئی سال سے میرے مدرسہ میں مدرس اور اس کے علاوہ کارِ افتاء میں میرے معین ہیں (۱) سنی خالص مخلص، نہایت صحیح العقیدہ، ہادی مہدی ہیں (۲) عام درسیات میں بفضلہٖ تعالیٰ عاجز نہیں (۳) مفتی ہیں (۴) مصنف ہیں (۵) واعظ ہیں (۶) مناظرہ بعونہٖ تعالیٰ کر سکتے ہیں (۷) علمائے زمانہ میں علم توقیت سے تنہا آگاہ ہیں''۔

(مقدمہ صحیح البہاری، پروفیسر مختار الدین احمد دام مجدہم، ص ۱،۲)

ایک مفتی کو درج ذیل اوصاف کا حامل ہونا ضروری ہے

(۱) مذہب کے متون، شروح، فتاویٰ پر اس کی گہری نظر ہو، ساتھ ہی استحضار ہو

(۲) عرفِ ناس وحالات زمانہ سے باخبر ہو

(۳) سوال فہم ہو، سائل کے خلجان اور اس کی الجھن کو سمجھ سکے

(۴) جواب تحقیق کے ساتھ لکھے اور مذہب کے جزئیات مفتیٰ بہا سے استناد کرے

(۵) جواب مسئلہ کے تمام ضروری گوشوں کو حاوی و محیط ہو

(۶) اس بات پر بھی نظر رکھے کہ سائل یا کوئی بدمذہب اس کے فتوے سے غلط فائدہ حاصل نہ کر سکے

ان امور کی روشنی میں جب ہم حضرت کے فتاویٰ کا جائزہ لیتے ہیں تو آپ ان تمام اوصاف کے جامع نظر آتے ہیں اور کیوں نہ ہو کہ آپ اعلیٰ حضرت علیہ الرحمۃ والرضوان کی درسگاہ کے تربیت یافتہ ہیں۔ یہ شواہد اس امر کی دلیل ہیں کہ حضرت ملک العلما رحمۃ اللہ علیہ اپنے وقت کے ایک ذمہ دار مفتی تھے اور آپ کے فتاویٰ ہمارے لئے سند و حجت ہیں۔

حضرت علیہ الرحمہ کے مشاغل علمیہ مختلف انواع کے تھے۔ زیادہ وقت درس و تدریس کی مصروفیات میں گزرا۔ اسی میں کچھ وقت نکال کر فتویٰ نویسی کی خدمت بھی انجام دیتے، اس لئے آپ کے فتاویٰ کی تعداد کوئی زیادہ نہیں، لیکن جو کچھ بھی ہے وہ بجائے خود اہم اور معتمد و مستند ہے۔ آپ کے انہیں فتاویٰ کا ایک مختصر مجموعہ بنام ''فتاویٰ ملک العلما'' عزیز اسعد جناب مولانا ارشاد احمد رضوی مصباحی (ساحل شہسرامی، علیگ) صاحب دام مجدہم کی مساعی جمیلہ سے نظارۂ خلق ہو رہا ہے۔

اس مختصر مجموعے میں بارہ فقہی ابواب ہیں:

(۱) کتاب الطہارۃ -۳ (۲) کتاب الصلوٰۃ -۳۲ (۳) کتاب الزکوٰۃ -۵ (۴) کتاب الصوم -۶ (۵) کتاب النکاح -۲۱ (۶) کتاب الطلاق -۹ (۷) کتاب السیر -۵ (۸) کتاب الوقف -۴ (۹) کتاب القضا -۱ (۱۰) کتاب الاضحیہ -۸ (۱۱) کتاب الحظر والاباحۃ -۲۶ (۱۲) کتاب الفرائض -۶ (۱۳) ضمیمہ -۴ = ۱۳۰

اس میں حضرت ملک العلما کے چھ فقہی رسالے بھی شامل ہیں، جو یہ ہیں:

(۱) تنویر المصباح للقیام عند حیّ علی الفلاح (۱۳۳۰ھ)

(۲) عید کا چاند (۱۳۷۰ھ)

(۳) تحفۃ الاحباب فی فتح الکوۃ والباب (۱۳۳۶ھ)

(۴) اعلام الساجد بصرف جلود الاضحیۃ فی المساجد (۱۳۲۵ھ)

(۵) نصرۃ الاصحاب باقسام ایصال الثواب (۱۳۵۴ھ)

(۶) مواہب ارواح القدس لکشف حکم العرس (۱۳۲۴ھ)

کتاب کے آغاز میں فاضل مرتب کا طویل مقدمہ شامل ہے۔ جس میں حضرت ملک العلما کے حالات طیبات، فقہ وافتا کی اجمالی تاریخ اور ترتیب کی تقریب کا تذکرہ ہے۔ اس کے ذیلی عناوین سے اندازہ ہوا کہ فاضل مرتب سلمہ، نے اس مقدمہ کو بڑی جانفشانی کے ساتھ قلم بند کیا ہے اور اسے جامع اور خوب سے خوب تر بنانے کی کوشش کی ہے۔

فتاویٰ ملک العلما کے مرتب اور مقدمہ نگار محب مکرم جناب مولانا ارشاد احمد رضوی صاحب زید علمہ، ملک کی مشہور درسگاہ جامعہ اشرفیہ مبارک پور کے فاضل، ایک باصلاحیت عالم دین ہیں۔ کئی سال تک جامعہ اشرفیہ کے مدرس ومفتی رہے پھر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ چلے گئے۔ یہاں انہیں حضرات سادات مارہرہ مطہرہ☆ کے زیر سایہ مزید پروان چڑھنے کا موقع نصیب ہوگیا۔ یہ ان حضرات کی برکت ہے کہ چند سالوں میں انہوں نے کئی ایک قابل قدر کارنامے☆☆ انجام دئے۔ انہیں میں سے ایک فتاویٰ ملک العلما کی ترتیب بھی ہے۔

مولانا ایک اچھے قلم کار ہونے کے ساتھ ساتھ فتویٰ نویسی کا ذوق اور تجربہ بھی رکھتے ہیں۔ اس لئے انہیں فتاویٰ کو مرتب کرنے کا بجا طور پر حق تھا اور قارئین محسوس کریں گے کہ مولانا نے حق ترتیب بخوبی ادا کیا ہے۔

دعا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے محبوب رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے صدقے مولانا کی یہ سعی مشکور فرمائے، انہیں صحت وعافیت کے ساتھ شاد وآباد رکھے، ان کے علم، عمر، فضل، اقبال، اشغال میں برکتیں دے اور ان سے بیش از بیش دین حنیف کی خدمات جلیلہ مقبولہ لے اور جملہ اہل سنت کی طرف سے انہیں فتاویٰ ملک العلما کی ترتیب واشاعت کے صلے میں جزائے خیر عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین!

محمد نظام الدین الرضوی

۳؍ جمادی الآخرہ ۱۴۲۴ھ/۳؍ اگست ۲۰۰۳ء (دوشنبہ)

☆ مارہرہ مطہرہ میں بلگرام کے زیدی سادات کی ایک شاخ دسویں صدی ہجری کے اخیر میں آکر سکونت پذیر ہوئی۔ تاجدار سلسلۂ برکاتیہ سید شاہ برکت اللہ عشقی پیمی مارہروی قدس سرہ کے قدوم میمنت لزوم کی برکت سے اس خطۂ پاک کو عالمگیر شہرت حاصل ہوئی۔ اس خاندان ذیشان کے فرد جلیل خاتم الاکابر سید شاہ آل رسول احمدی قدس سرہ کے دست اقدس پر امام اہل سنت اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہ بیعت ہوئے۔ عصر رواں میں قادری سلسلے کی اس عظیم خانقاہ کی نمائندگی سید شاہ آل رسول حسنین میاں نظمی، پروفیسر سید شاہ محمد امین میاں قادری سجادہ نشینان خانقاہ برکاتیہ اور سید محمد اشرف قادری برکاتی دامت برکاتہم القدسیہ فرما رہے ہیں۔ ناچیز انہیں بزرگوں کے سایۂ کرم میں سعادتوں کے ذخیرے سمیٹ رہا ہے۔ ۱۲ ساحل

☆☆ ۲۰۰۱ء کے وسط سے ۲۰۰۳ء کے اخیر تک حضرت امین ملت کی سرپرستی میں ناچیز کو درج ذیل تصانیف وتراجم رقم کرنے کی توفیق ارزانی ہوئی، فالحمدللہ علیٰ ذالک۔

۱.	شاہ حقانی کا اردو ترجمہ وتفسیر قرآن، ایک تنقیدی وتحقیقی جائزہ	صفحات ۶۰۰
۲.	مولانا سید شاہ غیاث الدین حسن شریفی۔ حیات اور شاعری	” ۲۴۸
۳.	حضرات محدثین کے اخلاق کریمانہ	” ۱۲۰
۴.	حضرت صادق شہسرامی۔ حیات اور شاعری	” ۲۰۰
۵.	کاشف الاستار شریف (ترجمہ وتقدیم)	” ۷۰۰
۶.	النور والبہاء لاسانید الحدیث وسلاسل الاولیا (ترجمہ)	” ۸۰
۷.	ایم اے عربی کی نصابی نظموں کا ترجمہ	” ۴۰۰
۸.	فتاویٰ ملک العلما (ترتیب وتقدیم)	” ۵۱۲

حضرت ملک العلما اوران کے فتاویٰ

ساحل شہرامی (علیگ)

ملک العلما حضرت مولانا شاہ محمد ظفر الدین قادری برکاتی رضوی قدس سرہٗ (۱۳۰۳ھ-۱۳۸۲ھ) اپنے عہد کے ممتاز عالم دین، اسلامی دانشور، تدبر آشنا فقیہ، نکتہ سنج مفتی، دقیقہ رس مصنف، ماہر مدرس اور سراپا خلوص، مرتاض پیشوائے طریقت تھے۔ بچپن ہی سے آثار کرامت آپ کی پیشانی سعادت پر درخشاں تھے۔ پھر جب اس گلستان فکر کو امام احمد رضا کی فضائے نو بہار میسر آ گئی تو اس کی شادابی اور درخشانی میں کچھ اور اضافہ ہو گیا۔

حضرت ملک العلماء کے مورث اعلیٰ سید ابراہیم بن سید ابوبکر غزنوی ملقب بہ مدار الملک ومخاطب بہ مَلِک بیا ہیں۔ ان کا نسب نامہ ساتویں پشت میں حضرت محبوب سبحانی قطب ربانی حضرت شیخ عبد القادر جیلانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ تک پہنچتا ہے۔ سید ابوبکر غزنی کے رہنے والے تھے، آپ غزنی سے تین فرہنگ کے فاصلے پر مقام بت نگر میں مدفون ہیں۔ سید ابراہیم غزنی سے سلطان فیروز شاہ کے عہد (۷۵۲-۷۹۰ھ) میں ہندوستان پہنچے اور یہاں آکر شاہی فوج میں ملازم ہو گئے۔ وہ عمر بھر جنگی سرگرمیوں میں حصہ لیتے رہے اور بالآخر ۱۳ر ذوالحجہ ۷۵۳ھ کو قلعۂ رہتاس (شاہ آباد، شہسرام، بہار) کی جنگ میں شہید ہوئے۔ قصبۂ بہار شریف کی ایک بلند پہاڑی پر سید صاحب کا مقبرہ ہے جس پر قدیم عالی شان گنبد تعمیر ہے۔ سید ابراہیم کا سلسلہ چھ واسطوں سے حضرت غوث اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ تک اس طرح پہنچتا ہے:

۱- سید ابوبکر غزنوی بن ۔ ۲- سید ابو القاسم عبد اللہ بن ۔ ۳- سید محمد فاروق بن ۔ ۴- ابو المنصور عبد السلام بن ۔ ۵- سید عبد الوہاب بن ۔ ۶- غوث الثقلین حضرت سیدنا الشیخ محی الدین عبد القادر حسنی حسینی جیلانی قدست اسرارہم۔

(حیات اعلیٰ حضرت ا/و)

حضرت ملک العلما کی ولادت مبارکہ ۱۰ر محرم الحرام ۱۳۰۳ھ/ ۱۹ر اکتوبر ۱۸۸۰ء کو صبح صادق کے وقت موضع رسول پور میجرا ضلع نالندہ، بہار میں ہوئی۔ والد ماجد ملک عبد الرزاق اشرفی علیہ الرحمۃ نے خاندانی طرز کے مطابق چار سال، چار مہینہ، چار دن کی عمر (۱۳۰۷ھ) میں اپنے مرشد گرامی شاہ چاند بیتھوی کے دست مبارک سے آپ کی بسملہ خوانی کرائی۔ ابتداءً والد ماجد کی آغوش تربیت میں رہے پھر قرآن حکیم اور اردو فارسی کی کتابیں حافظ مخدوم اشرف، مولوی کبیر الدین اور مولوی عبد اللطیف سے پڑھیں۔ پھر اپنے نانیہال موضع بین ضلع پٹنہ کے مدرسہ غوثیہ حنفیہ میں ۱۳۱۲ھ میں داخلہ لیا جہاں تفسیر جلالین اور میر زاہد تک کی کتابوں کا درس لیا۔ مدرسہ غوثیہ حنفیہ کے اساتذہ نے آپ کی ذہانت دیکھتے ہوئے بہت شفقت کے ساتھ آپ کی تعلیم کا نظم فرمایا۔ آپ وہاں ان اساتذہ کے زیر تربیت رہے:

۱- مولانا شیخ محی الدین اشرف۔ ۲- مولانا شیخ بدر الدین اشرف۔ ۳- مولانا مہدی حسن میجروی۔ ۴- مولانا فخر الدین حیدر۔ ۵- مولانا محمد منعم۔ ۶- مولانا معین اظہر رئیس موضع بین۔ ۷- مولوی محمد ابراہیم۔ ۸- حافظ محمد

اسماعیل بہاری۔ ۹-منشی اکرام الحق۔

قاضی عبدالودود کے والد ماجد قاضی عبدالوحید صدیقی فردوسی رئیس لودی کٹرہ وخلیفۂ امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہما (۱۲۸۹ھ-۱۳۲۶ھ) نے ۱۳۱۸ھ میں پٹنہ کی سرزمین پر ایک عظیم الشان کانفرنس بلائی جو تحریک ندوہ کے اسلام مخالف نظریات کا تردیدی پس منظر رکھتی تھی۔ اس کانفرنس میں امام احمد رضا قادری برکاتی بنفس نفیس شرکت کے لئے پٹنہ تشریف لے گئے جہاں دیگر اکابر علمائے اہلِ سنت بھی جلوہ افروز تھے۔ اسی موقع سے قاضی عبدالوحید فردوسی علیہ الرحمۃ نے ایک سنی ادارے کی داغ بیل ڈالی، نام رکھا مدرسہ حنفیہ۔ اس ادارے کے لئے قابل اساتذہ کا انتخاب کیا جن میں مسند وقت حضرت علامہ شاہ وصی احمد محدث سورتی قدس سرہٗ (متوفی ۱۳۳۴ھ) بھی شامل تھے۔ مرحوم فردوسی نے اسی ادارے سے ایک علمی رسالہ "تحفۂ حنفیہ ملقب بہ مخزن تحقیق" جاری کیا جو عرصۂ دراز تک علم وفن اور دین وسنیت کی گرانقدر خدمات انجام دیتا رہا۔

حضرت ملک العلما نے جب اس مدرسے کی شہرت اور حضرت محدث سورتی کا چرچا سنا تو ۲۵ر جمادی الآخرہ ۱۳۲۰ھ کو پٹنہ چلے آئے اور محدث سورتی کی خدمت میں رہ کر مسند امام اعظم، مشکوٰۃ شریف اور ملّا جلال پڑھی۔ کچھ دنوں کے بعد ہی محدث سورتی اپنی علالت سے مجبور ہوکر اپنے وطن پیلی بھیت تشریف لے گئے تو حضرت ملک العلما بھی وہاں سے رخصت ہوکر کانپور پہنچے اور وہاں کے تین مدارس سے بیک وقت علمی فیوض حاصل کئے۔ ۱-مدرسہ امداد العلوم، بانس منڈی۔ ۲- مدرسہ احسن المدارس۔ ۳- دار العلوم ...... یہاں کے اساتذہ میں شہرۂ آفاق عالم مولانا احمد حسن کانپوری (متوفی ۳ر صفر ۱۳۲۲ھ) اور مولانا عبید اللہ پنجابی (متوفی ۶ر جمادی الاولیٰ ۱۳۴۳ھ) قابل ذکر ہیں۔ حضرت ملک العلما کانپور سے دوبارہ اپنے ممتاز استاذ حضرت محدث سورتی کی خدمت میں پیلی بھیت حاضر ہوگئے اور ان سے درس حدیث لیا۔ پھر ۱۳۲۱ھ میں بانس بریلی حاضر ہوئے اور مدرسہ مصباح التہذیب میں مولوی غلام یٰسین دیوبندی کے درس میں شریک ہوئے لیکن یہاں کی سنیت بیزار فضا سے جلد ہی اوب کر سرچشمۂ علم وادب اور مصدر عشق ومحبت، اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور پھر ان سے ایسے مانوس ہوئے کہ انہیں کے ہوکر رہ گئے بلکہ پوری زندگی ان کے مشن کی ترویج واشاعت کے لئے وقف کردی۔

حضرت ملک العلما کے ذوق علم کی برکت ہے کہ امام احمد رضا نے آپ کے اصرار پر ۱۳۲۲ھ/۱۹۰۴ء میں مدرسہ منظر اسلام قائم فرمایا جس کا افتتاح ان دو طالب علموں سے ہوا:

۱- ملک العلما مولانا ظفر الدین قادری رضوی۔ ۲- مولانا سید عبدالرشید عظیم آبادی۔ حضرت ملک العلما نے امام احمد رضا سے بخاری شریف، اقلیدس کے چھ مقالے، تشریح الافلاک، تصریح، شرح چغمینی کا درس لیا اور فتویٰ نویسی کے آداب سیکھے اور اسی طرح علم ہیئت، توقیت، جفر، تکسیر اور ریاضی جیسے نادر فنون میں کمال حاصل کیا۔ اعلیٰ حضرت قدس سرہٗ سے سلوک کی ظاہری اور باطنی منزلیں بھی طے کیں۔ تصوف کی مشہور کتابیں رسالہ قشیریہ اور عوارف المعارف

کا سبقاً سبقاً درس لیا، ذکر بالجہر، پاس انفاس کے باطنی آداب سیکھے۔ بالآخر آپ کی صفائے باطن سے متاثر ہوکر اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری قدس سرہٗ نے سال فراغ کے اخیر میں آپ کو سلسلۂ عالیہ قادریہ برکاتیہ رضویہ کی اجازت وخلافت مرحمت فرمائی۔

سال فراغ کے فوراً بعد حضرت ملک العلما نے منظر اسلام، بریلی شریف میں تدریس، تصنیف اور افتا نویسی کا سلسلہ شروع کردیا۔ زیر نظر مجموعۂ فتاویٰ میں بیشتر فتاویٰ اسی زمانے کے ہیں۔ ۱۳۲۹ھ میں معززین شملہ کے اصرار پر شملہ تشریف لے گئے پھر علی الترتیب ان مدارس کی فضاؤں میں آپ کے پاکیزہ افادات گونجتے رہے۔

۱- مدرسہ حنفیہ، آرہ، بہار (۱۳۲۹ھ تا ۱۳۳۰ھ)۔ ۲- مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ، پٹنہ (۱۳۳۰ھ تا ۱۳۳۴ھ)۔ ۳- مدرسہ خانقاہ کبیریہ، شہسرام (۱۳۳۴ھ تا ۱۳۳۸ھ)۔ ۴- مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ، پٹنہ (۱۳۳۸ھ/۱۹۱۹ء تا ۱۹۵۰ء)

اخیر الذکر مدرسہ کے آپ ۱۹۴۸ء میں پرنسپل ہوئے اور ۱۹۵۰ء میں ریٹائر ہوئے۔ ریٹائرمنٹ کے ڈیڑھ دو سال بعد شاہ شاہد حسین درگاہی میاں سجادہ نشین بارگاہ عشق، میتن گھاٹ پٹنہ کی استدعا پر ۱۳۷۱ھ میں کٹیہار، بہار میں جامعہ لطیفیہ بحر العلوم کا افتتاح فرمایا اور اپنی کوششوں سے اسے کافی فروغ بخشا۔ جب یہ ادارہ مستحکم ہوگیا تو آپ ربیع الاول شریف ۱۳۸۰ھ میں اپنے دولت کدے "ظفر منزل" شاہ گنج پٹنہ آگئے۔

پچپن سال کے طویل تدریسی ایام میں ہزاروں تلامذہ آپ کے سرچشمۂ فیض سے سیراب ہوئے اور ایک عالم کو فیض یاب کیا۔ آپ نے اس دوران فتویٰ نویسی، وعظ وتلقین، تصنیف وتالیف، بیعت وارشاد، مناظرہ اور قضا جیسے گوناگوں مشاغل سے رابطہ رکھا۔ ان کثیر مصروفیات کے ہجوم میں صوفیانہ اذکار کے لئے بھی آپ نے اوقات خاص کر رکھے تھے۔ قادر مطلق نے آپ کے اوقات میں عجب برکتیں دے رکھی تھیں لیکن اس ذیل میں آپ کے اوقات کی منضبط تقسیم کا بھی خاصا دخل تھا۔

حضرت ملک العلما عرصے سے فشار الدم کے مرض میں مبتلا تھے جس کی وجہ سے کافی نحیف ہوگئے تھے۔ اس عالم نقاہت میں بھی آپ کے معمولات شب وروز میں کوئی فرق نہ آیا۔ ریاضتوں کے وہی سلسلے تھے اور علمی مصروفیات بھی اپنی جگہ تھیں۔ بالآخر یکشنبہ کا دن گذار کر دوشنبہ کی شب میں ۱۹ر جمادی الآخرۃ ۱۳۸۲ھ/ ۱۸ر نومبر ۱۹۶۲ء کو اسم ذات کا ذکر بالجہر کرتے ہوئے اس طرح پرسکون انداز میں اپنے محبوب حقیقی کے حضور حاضر ہوگئے کہ حاضرین کو کچھ دیر تک اس بات کا احساس بھی نہ ہوسکا کہ آپ لذت وصال سے شادکام ہوچکے ہیں۔ دوسرے دن حضرت شاہ محمد ایوب شاہدی رشیدی سجادہ نشین خانقاہ اسلام پور ضلع پٹنہ (متوفیٰ ۱۹۶۷ء) نے، جن سے حضرت کو فردوسی، شطاری وغیرہ سلاسل کی اجازت حاصل تھی، آپ کی نماز جنازہ پڑھائی اور درگاہ شاہ ارزاں (متوفیٰ ۱۰۲۸ھ) کے قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔

☆☆☆☆☆

حضرت ملک العلما علامہ محمد ظفر الدین قادری برکاتی رضوی قدس سرہٗ علم وفن کی بیشتر شاخوں پر دسترس رکھتے تھے خصوصاً علوم اسلامیہ میں امام احمد رضا کے علمی اور فکری جانشین تھے۔ علوم قرآن، تفسیر، اصول تفسیر، تجوید وقرأت، علوم حدیث، حدیث، اصول حدیث، فقہی علوم، فقہ، اصول فقہ، عقائد وتصوف، بلاغت، عروض، ادب، لغت، نحو وصرف، معانی وبیان، فلکیاتی علوم، نجوم، ہیئت، توقیت، تکسیر، جفر، رمل، عقلی علوم منطق، فلسفہ، ریاضی جیسی علمی شاخوں سے آپ کو نہ صرف واقفیت بلکہ ان پر دسترس حاصل تھی۔ اس وسعت علمی پر ان کی تحریریں بہترین شہادت ہیں جن میں مذکورہ سبھی علوم کی چاندنی پھیلی ہوئی ہے اور ایسا کیوں نہ ہو دبستان رضا کے خوشہ چیں جو ٹھہرے۔ آپ کی اس علمی لیاقت کا اکرامی اعتراف خود آپ کے مربی اور مشفق، استاذ اور مرشد، عبقری الشرق اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ نے فرمایا ہے۔ چنانچہ اعلیٰ حضرت، انجمن نعمانیہ لاہور کو ۵؍شعبان المعظم ۱۳۲۸ھ کے ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:

''مکرمی مولانا مولوی محمد ظفر الدین صاحب قادری سلمہٗ فقیر کے یہاں کے اعز طلبا سے ہیں اور میرے بجان عزیز۔ ابتدائی کتب کے بعد یہیں تحصیل علوم کی اور اب کئی سال سے میرے مدرسہ میں مدرس اور اس کے علاوہ کار افتا میں میرے معین ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ جتنی درخواستیں آئی ہوں، سب میں یہ زائد ہیں مگر اتنا ضرور کہوں گا:

''سنی، خالص، مخلص، نہایت صحیح العقیدہ، ہادی مہدی ہیں۔ عام درسیات میں بفضلہ تعالیٰ عاجز نہیں، مفتی ہیں، مصنف ہیں، واعظ ہیں، مناظرہ بعونہ تعالیٰ کرسکتے ہیں، علمائے زمانہ میں علم توقیت سے تنہا آگاہ ہیں......... فقیر آپ کے مدرسے کو اپنے نفس پر ایثار کر کے انہیں آپ کے لئے پیش کرتا ہے''۔

(حیات ملک العلما ص ۷-۸ مطبوعہ لاہور)

ان تمام علوم میں چند شاخیں آپ کی خاص پہچان تھیں۔ ۱- علوم حدیث۔ ۲- فقہ وتصوف۔ ۳- عقائد ومناظرہ۔ ۴- ہیئت وتوقیت۔ ۵- اور سوانحی ادب۔

فقہ وتصوف پر آپ کو کس قدر عبور حاصل تھا، اس کی قدرے وضاحت کے لئے تو یہ مقدمہ ہی تحریر کیا جارہا ہے۔ باقی گوشوں پر بھی ایک اجمالی نگاہ ڈالتے چلتے ہیں۔

علوم حدیث:

حضرت ملک العلما نے بریلی شریف کے علاوہ جہاں بھی منصب تدریس سنبھالا وہاں علمی صدارت کی شہ نشین آپ کی خدمت میں ہی پیش کی گئی۔ اسی لئے صحاح ستہ کا درس بھی ہمیشہ آپ کے ذمہ رہا۔ اس طور سے درس حدیث کی آپ نے پوری زندگی گرانقدر سعادت حاصل کی۔ وعظ وتذکیر میں کثرت کے ساتھ آپ حدیث شریف تلاوت کرتے اور اس کے قیمتی نکات بیان فرماتے۔ فتاویٰ اور مختلف تصانیف میں بھی آپ نے جس کثرت کے ساتھ احادیث طیبہ کے حوالے پیش کئے ہیں، وہ آپ کی اس علم شریف پر دسترس کا کافی ثبوت ہیں لیکن اس فن شریف میں

آپ کی سب سے انمول یادگار ہے ''جامع الرضوی معروف بہ صحیح البہاری''۔ چھ جلدوں میں آپ نے مذہب حنفی کی مؤید احادیث کا ذخیرہ تیار کرنے کا منصوبہ بنایا اور ہر جلد میں دس ہزار احادیث کا اوسط رکھا۔ مصنف کی حیات میں اس کی صرف دوسری جلد چار قسطوں میں شائع ہوسکی جس کے اندر تقریباً دس ہزار احادیث مبارکہ کا ذخیرہ موجود ہے۔

اس عظیم الشان خدمت حدیث کو اہل علم کے ہر طبقے نے بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھا اور اسے ایک مہتم بالشان علمی کارنامہ قرار دیا۔ اس گرانقدر علمی کارنامے کو خراج تحسین پیش کرنے والوں میں محدث سورتی مولانا وصی احمد پیلی بھیتی، مولانا عبدالقدیر پروفیسر حدیث وصدر شعبۂ دینیات جامعہ عثمانیہ حیدرآباد، مولانا سید حیدر ولی اللہ قادری ناظم دارالعلوم لطیفیہ خانقاہ حضرت قطب ویلور کرناٹک، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالماجد دریا آبادی، غیر مقلد عالم ثناء اللہ امرتسری جیسی شخصیات شامل ہیں۔

اس کتاب کے مطالعہ کے بعد ہر شخص حضرت ملک العلما کی علم حدیث میں مہارت اور اس کے مختلف گوشوں پر دسترس کی بھرپور شہادت دے گا۔ خاص طور سے ۲۵ رصفحات پر پھیلا ہوا اس کتاب کا گرانقدر مقدمہ، اصول حدیث کا شاندار گلدستہ ہے جسے پڑھ کر ہر باذوق قاری جھوم اٹھتا ہے۔ حضرت کے یہ سارے حدیثی افادات محدث بریلی اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ کے بحر علم کی چند قیمتی موجیں ہیں جس کا اعتراف خود حضرت ملک العلما نے ان کلمات سے کیا ہے:

”ھذا نھر اصغر من البحر الاکبر من بحار علوم سیدی و شیخی نفعنا ببرکاته فی الدنیا والآخرة“ (صحیح البھاری، کتاب الصلوٰة، ۱/۲۶)

عقائد ومناظرہ:

حضرت ملک العلما کا دور معتقداتی معرکہ آرائیوں کا گرما گرم دور تھا۔ اہل سنت کی وحدت پارہ پارہ ہورہی تھی اور لوگ نت نئے خیموں میں داخل ہوتے جارہے تھے۔ ابن عبدالوہاب نجدی کے مسموم عقائد اسمٰعیل دہلوی کی تقویت الایمان کے ذریعہ متحدہ ہندوپاک کے خطوں میں پھیل رہے تھے۔ اس لئے ملت کے پاسبان بھی شیرازۂ ملی کو سمیٹنے کی کوششوں میں مصروف تھے۔ اس خصوص میں اسمٰعیل دہلوی کے ہم درس اور مکتب شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے خاص فیض یافتہ علامہ فضل حق خیرآبادی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ آپ نے حمایت حق اور باطل کی سرکوبی کا جو مستحکم سلسلہ شروع کیا تھا اسی کی کڑیاں ملاتے ہوئے اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری نے بھی حق کی حمایت اور باطل کے خلاف محاذ آرائی کا سلسلہ چھیڑ رکھا تھا جس نے باطل کے منہ زور بڑھتے سیلاب پر کامیاب بند باندھا۔ حضرت ملک العلما بھی مکتب رضا کے فیض یافتہ تھے اس لئے آپ نے بھی باطل سے مختلف محاذ پر لوہا لیا اور انہیں فاش شکستیں دیں۔ آپ کے مناظرے کی خصوصیت یہ تھی کہ آپ حریف کو اسی کے اسلحے سے اس شائستگی سے زیر کرتے تھے کہ ذوق لطیف پر ذرا سی بھی خراش نہ آتی۔ شائستہ اور متین تنقید آپ کی پہچان کہی جاسکتی ہے۔

آپ نے وہابیت کی جملہ شاخوں غیر مقلدیت، دیوبندیت اور آریوں، مسیحی مشنریوں کے مبلغوں سے بہت کامیاب بحثیں کیں اور انہیں شکست سے دوچار کیا۔ آپ کا دور تو دیوبندیت اور وہابیت پر داروگیر کا خاص دور تھا، اس لئے ان سے رزم آرائیاں تو تھیں ہی، آریہ سماجیوں اور عیسائی مشنریوں نے بھی بھولی بھالی عوام کو پھانسنے کے لئے جال پھیلا رکھا تھا۔ اس لئے علمائے اسلام ان کے خلاف بھی صف آرا ہوتے۔ ملک العلما نے بھی اس محاذ پر اسلام کی پاسبانی کے حقوق ادا کئے۔ آپ جہاں کہیں حمایت حق کے لئے تشریف لے گئے، نصرت خداداد آپ کی رفیق رہی۔ آپ کی اسی فاتحانہ شوکت کو شفیقانہ تحسین پیش کرتے ہوئے آپ کے شفیق مربی اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ نے فرماتے ہیں۔

میرے ظفر کو اپنی ظفر دے　　　اس سے شکستیں کھاتے یہ ہیں

ملک العلما کے صاحبزادے پروفیسر مختار الدین احمد لکھتے ہیں:

''مجھے یاد آتا ہے کہ میرے بچپن میں وہ (حضرت ملک العلما) آریہ سماجیوں اور مسیحی مبلغین سے مناظرے کے لئے جلسوں میں بھی تشریف لے جایا کرتے تھے۔ غیر مقلدین وغیرہم سے مناظرے کے لئے بھی وہ دور دراز کے علاقوں سے مدعو کئے جاتے تھے۔ ایک مناظرے کے لئے وہ برما بھی تشریف لے گئے تھے۔ (حیات ملک العلما ص ۱۶)

حضرت ملک العلما، اعلیٰ حضرت قدس سرہٗ کے حکم پر فیروز پور میوات کے علاقے موضع جھرکا میں دیابنہ سے مناظرے کے لئے تشریف لے گئے اور فتح یاب ہوکر بریلی شریف واپس ہوئے۔ ''اس موقع پر اعلیٰ حضرت نے ایک اونی جبہ عنایت فرمایا اور ارشاد فرمایا: یہ مدینہ طیبہ کا ہے۔ میں نے اسے دونوں ہاتھوں سے لے کر سر پر رکھا اور آنکھوں سے لگایا''۔ (حیات اعلیٰ حضرت ۱/۵۵)

اس مناظرے کی پوری روداد آپ کے مرتبہ رسالہ ''شکست سفاہت'' (۱۳۲۶ھ) میں موجود ہے۔ اس کے علاوہ اس موضوع پر اور بھی کئی رسالے آپ نے تصنیف فرمائے:

۱- الحسام المسلول علیٰ منکر علم الرسول (۱۳۲۳ھ)۔ ۲- سجم الکنزہ علیٰ الکلاب المطرۃ (۱۳۲۸ھ)۔ ۳- النبراس لدفع ظلام المنہاس (۱۳۲۹ھ)۔ ۴- رفع الخلاف من بین الاحناف (۱۳۳۲ھ)۔ ۵- کشف الستور عن مناظرۂ رامپور (۱۳۳۴ھ)۔ ۶- ظفر الدین الجید (۱۳۲۳ھ)۔ ۷- گنجینۂ مناظرہ (۱۳۳۴ھ)۔ ۸- ظفر الدین الطیب وغیرہ رسائل بھی مناظراتی تحریریں ہیں۔ زیر نظر مجموعے میں بھی کئی فتاویٰ مناظراتی انداز کے ہیں جن پر گفتگو ابھی آتی ہے۔ یہ تمام چیزیں حضرت ملک العلما کے مناظراتی معیار فن کو متعین کرتی ہیں اور معتقداتی پہلوؤں اور تقابل ادیان کے وسیع اور متنوع علوم میں آپ کی دسترس کے شواہد فراہم کرتی ہیں۔

ہیئت وتوقیت:

یہ فنون حضرت ملک العلما کی پہچان تھے اور آپ ان میں معاصرین کے درمیان یکتائے روزگار۔ اس امتیاز

کے لئے امام احمد رضا کی یہ شہادت کافی ہے:

''(مولانا محمد ظفر الدین قادری) علمائے زمانہ میں علم توقیت سے تنہا آگاہ ہیں۔ امام ابن حجر مکی نے زواجر میں اس علم کو فرض کفایہ لکھا ہے اور اب ہند بلکہ عام بلاد میں یہ علم، علما بلکہ عام مسلمین سے اٹھ گیا۔ فقیر نے بتوفیق قدیر اس کا احیا کیا اور سات صاحب بنانا چاہے، جس میں بعض نے انتقال کیا، اکثر اس کی صعوبت سے چھوڑ بیٹھے۔ انہوں نے بقدر کفایت اخذ کیا اور اب میرے یہاں کے اوقات طلوع وغروب ونصف النہار ہر روز وتاریخ کے لئے اور جملہ اوقات ماہ رمضان شریف کے لئے بھی بناتے ہیں''۔ (حیات اعلیٰ حضرت ۱/۲۴۴)

حضرت ملک العلما نے اس علم کو اعلیٰ حضرت قدس سرہٗ کی بارگاہ میں رہ کر سیکھا اور اس میں مکمل مہارت حاصل کی۔ ہندوپاک کے دائمی اوقات صلوٰۃ تخریج کیے۔ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ کے زبانی افادات اور اپنی ذاتی توضیحات کو یکجا کر کے کئی رسائل ترتیب دیئے:۔ ۱-الجواہر والیواقیت فی علم التوقیت معروف بہ توضیح التوقیت (۱۳۳۰ھ)۔ ۲-بدر الاسلام لمیقات کل الصلوٰۃ والصیام معروف بہ موذن الاوقات (۱۳۳۵ھ)-۳-توضیح الافلاک معروف بہ سلم السماء (۱۳۴۰ھ)۔ ۴-مشرقی اور سمت قبلہ/ مشرقی کا غلط مسلک (۱۳۵۸ھ) جیسی حضرت کی قیمتی تحریریں انہیں فنون سے تعلق رکھتی ہیں۔

توضیح التوقیت کی ترتیب کے سلسلے میں ملک العلما اپنے ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:

اعلیٰ حضرت قبلہ نے علم توقیت کے قواعد کتابی شکل میں مدون نہیں فرمائے۔ بلکہ میری تعلیم کے زمانے میں قواعد زبانی فرمایا کرتے تھے جس کو میں اردو زبان میں لکھ لیتا اور میرے دوست وہم سبق حکیم سید عزیز غوث صاحب بریلوی فارسی میں لکھ لیا کرتے اور شرکائے درس میں کوئی ان سے، کوئی مجھ سے سیکھا کرتا۔ بہرکیف! ایک زمانے تک وہ سب ردی پرزے کی شکل میں رہے۔ اس کے بعد میں نے بعض احباب کی فرمائش سے ان سب کو کتابی شکل میں جمع کر دیا اور اس کو آسان سے آسان تر کرنے کے لئے مثالوں کے علاوہ تشریح مقامات متعلقہ کے عنوانات سے ہر قاعدے کو اتنا واضح کر دیا کہ اس کتاب کو پیش نظر رکھ کر ہر شخص اس فن کو بہ آسانی گھر بیٹھا سیکھ سکتا ہے۔ کہیں شبہہ ہو تو بذریعہ خط دریافت کر لینا کافی ہے''۔ (حیات ملک العلما ص ۲۹)

حضرت نے نہ صرف یہ کہ اس علم کے افادات تحریری شکلوں میں عام کئے بلکہ اسے سفینوں کے ساتھ ساتھ سینوں میں بھی منتقل کیا اور کئی ایک نامور تلامذہ پیدا کئے۔ بہتیرے شائقین اس فن میں آپ سے خطوط کے ذریعہ استفادہ کرتے۔ ان مستفیدین میں مولانا حاجی محمد ظہور نعیمی مراد آباد اور مولانا مفتی سید محمد عمیم الاحسان ڈھاکہ خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ ان میں اول الذکر نے متحدہ ہندوپاک کے سارے مشہور مقامات کے اوقات صوم وصلوٰۃ ''ظہور الاوقات'' کے نام سے تخریج کئے ہیں۔ اس کتاب کا خاص وصف یہ ہے کہ اس میں ہر مقام کا سمت قبلہ بھی تحریر ہے۔ یہ اس قابل ہے کہ کوئی ادارہ اسے نئے انداز سے ایڈٹ کر کے شائع کرے۔

ان فنون میں آپ کے باضابطہ تلامذہ میں مولانا حافظ عبد الرؤف بلیاوی نائب شیخ الحدیث جامعہ اشرفیہ

مبارک پور (متوفی ۱۹۷۱ء)، مفتی نظام الدین بلیاوی الہ آباد، اور مولانا یحییٰ بلیاوی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

سوانحی ادب:

حضرت ملک العلما بہت شستہ اور نکھرا ادبی ذوق رکھتے تھے۔ آپ کی تحریریں چاہے جس موضوع سے تعلق رکھتی ہوں، بیان کی شائستگی اور لہجے کی شگفتگی سے آراستہ ہوتی ہیں۔ مناظرانہ اور تنقیدی تحریروں میں بھی کہیں سوقیانہ لب و لہجے کا دور دور تک پتہ نہیں چلتا۔ اسی شگفتہ نثر میں سیرت و سوانح کے موضوع پر بھی آپ نے قیمتی تحریریں چھوڑی ہیں۔

۱-شرح الشفا للقاضی عیاض (نامکمل)۔ ۲-مولود رضوی (۱۳۶۰ھ)۔ ۳-مبین الہدیٰ فی نفی امکان مثل المصطفیٰ (۱۳۲۴ھ)۔ ۴-تنویر السراج فی ذکر المعراج (۱۳۵۳ھ)۔ ۵-اعلام الاعلام باحوال العرب قبل الاسلام (۱۳۴۱ھ)۔ ۶-خیر السلوک فی نسب الملوک (۱۳۳۳ھ)۔ ۷-جواہر البیان فی ترجمۃ خیرات الحسان (۱۳۳۳ھ)۔ ۸-حیات اعلیٰ حضرت/مظہر المناقب (۱۳۶۹ھ)۔ ۹-چودھویں صدی کے مجدد (۱۳۶۷ھ)۔ المجمل المعدّ لتالیف المجدّد (۱۳۲۷ھ) یہ ساری تحریریں آپ کے سوانحی ادب کا شاہکار ہیں۔

یوں تو حضرت کی ساری تصانیف اخلاص اور عقیدت کے جذبے سے سرشار ہو کر معرض تحریر میں آئیں لیکن مذکورہ بالا تصانیف میں عشق رسول اور محبت رضا کے شیریں جذبے کچھ زیادہ ہی نمایاں ہیں۔

شفائے قاضی عیاض کی عربی حاشیہ نگاری کا آغاز ۱۴ ربیع الاول شریف ۱۳۲۴ھ بروز چہار شنبہ ہوا۔ اس کے آغاز میں لکھتے ہیں:

"انی نذرت للرحمن انہ لما تمت ھذہ الحاشیۃ اصلی مائۃ رکعۃ ان شاء اللہ"

''میں نے خدا کے حضور نذر مانی ہے کہ جب یہ حاشیہ پایۂ تکمیل کو پہنچے گا، اس وقت سو رکعت نمازیں شکرانہ نفل کی پڑھوں گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔ ۱۲ ساحل

مجدد ملت، اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ سے آپ کو بہت گہری عقیدت تھی۔ آپ نے امام احمد رضا کے اتباع رسول اور عشق مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثنا کی خوشبوؤں میں بسے شب و روز دیکھے، ان کی شفقتیں، ہمدردیاں، انسانیت نوازی اور اعلیٰ اخلاقی قدروں کا مشاہدہ کیا، علم و فن اور فکر و قلم کی عبقریت ملاحظہ کی۔ اس لئے ان سے شیفتگی کے والہانہ جذبات انتہا کو پہنچے ہوئے تھے۔ "من احب شیئا اکثر ذکرہ"۔ محبوب کے ذکر سے روح کو بالیدگی ملا کرتی ہے۔ اس لئے امام احمد رضا کا ذکر بھی حضرت ملک العلما کی تسکین روح کا سامان تھا۔ جلوت و خلوت ہر جگہ امام احمد رضا کا ذکر جمیل حرز جاں رہتا۔ آپ کے خواجہ تاش، خلیفۂ امام احمد رضا، مولانا سید شاہ غیاث الدین حسن شہرامی جب کبھی ''ظفر منزل'' پٹنہ تشریف لاتے تو پوری پوری رات اعلیٰ حضرت کے ذکر جمیل میں گذر جاتی۔ پروفیسر مختار الدین احمد کے لفظوں میں:

''رات کے کھانے کے بعد اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کا والہانہ ذکر شروع ہوتا اور ان کے فضائل

ومناقب میں پوری رات گذر جاتی تھی۔ درمیان میں کبھی کبھی اعلیٰ حضرت رحمت اللہ علیہ کی تصانیف، تحریرات کے دفتر بھی کھل جاتے تھے اور عبارتیں پڑھی جاتی تھیں اور ان کے محاسن پر گفتگو ہوتی تھی۔ دونوں امام احمد رضا رحمۃ اللہ علیہ کے عاشق جو ٹھہرے''۔ (ماہنامہ جہان رضا، لاہور۔ جون ۱۹۹۹ء ص ۶۱)

جب تک اعلیٰ حضرت حیات ؒ سے رہے، ملک العلما نے ہمہ دم خود کو ان کی ہر ممکن علمی خدمت کے لئے مستعد رکھا۔ کارافتا میں معین رہے، منظر اسلام کی تدریسی ذمہ داری سنبھالی، حضرت صدر الشریعۃ اور ملک العلما نے بڑی تندہی سے اعلیٰ حضرت کی تصنیفات کی حفاظت اور اشاعت کی جانب توجہ فرمائی۔ اعلیٰ حضرت قدس سرہٗ کی رحلت کے بعد حضرت مفتیِ اعظم شاہ مصطفےٰ رضا قادری برکاتی نوری قدس سرہٗ کی خواہش پر ملک العلما بریلی شریف تشریف لے گئے اور تین چار مہینے کی جانکاہ محنت کے بعد اعلیٰ حضرت قدس سرہٗ کی ڈھیروں تصانیف کے مبیضے تیار کئے، منتشر اوراق کی شیرازہ بندی کی اور یوں بہتیری تصانیف رضا کو ضائع ہونے سے بچالیا، لیکن ایک شیفتۂ رضا کی یہ جاں نثارانہ خدمات کچھ تنگ نظر حضرات کو ایک آنکھ نہ بھائی اور وہ ان تصانیف رضا کی اشاعت میں تاخیر کرنے کے حیلے کرنے لگے۔ اس سے کبیدہ خاطر ہو کر حضرت ملک العلما بریلی شریف کے ایک دوست کے نام مکتوب میں لکھتے ہیں:

''میں نے تین مہینے کس جانفشانی سے کام کیا اور خدا کا شکر ہے کہ اعلیٰ حضرت کی تصانیف کو ضائع ہونے سے بچالیا مگر جو قدر دانی کی گئی، وہ آپ کے اور سب کے پیش نظر ہے۔ اگر تصنیفات کی اشاعت ہی کا سلسلہ جاری ہوتا تو دینی فائدہ کثیر ہوتا۔'' (حیات ملک العلما ص ۲۷)

مولانا امجد رضا خاں نوری کو ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:

''اس وقت اعلیٰ حضرت قدس سرہٗ العزیز کی جملہ تصنیفات وتالیفات وتحریرات چھپ جائیں تو سینیوں کو کسی دوسری کتاب کی ضرورت نہ ہوگی۔ تفسیر، حدیث، فقہ، تصوف، عقائد، اخلاق کے علاوہ تاریخ، جغرافیہ، ہیئت، توقیت، حساب، جبر ومقابلہ، تکسیر، جفر، زائچہ، کون سے علوم ہیں جن میں اعلیٰ حضرت کی تصنیف نہیں۔ جس وقت یہ کتابیں جناب کی ہمت ومحنت وتوجہ سے چھپ جائیں گی، اس وقت لوگوں کی آنکھیں کھلیں گی کہ اعلیٰ حضرت کیا تھے۔'' (حیات ملک العلما ص ۲۶)

احسان شناسی کے جذبوں سے لبریز حضرت ملک العلما کی ذات گرامی نے اپنے سارے محسنوں کے حقوق محبت ادا کئے۔ آپ کے ذخیرۂ مکاتیب اور قلمی یادداشتوں کے مجموعے اس کی تصدیق کے لئے کافی سے زائد مواد فراہم کرتے ہیں۔

آپ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ کے سب سے زیادہ منت کش تھے، اس لئے ہمیشہ ان کی یادوں میں مگن اور ان کے ذکر جمیل میں رطب اللسان رہے۔ پوری زندگی ان کے فکری مشن کی اشاعت کے لئے وقف رکھی، ان کی نگارشات کے تحفظ اور طباعت کے لئے حضرت صدر الشریعہ اور ملک العلما یکساں طور سے مضطرب نظر آتے ہیں۔ آپ اپنے دامن سے وابستہ حضرات کو ''ظفری'' کے بجائے ''رضوی'' لکھنے کی تاکید فرماتے۔ اعلیٰ

حضرت کی تصانیف کی سب سے پہلی شیرازہ بندی کا سہرا آپ کے سر رہا۔ "المجمل المعدد لتالیف المجدد" میں سب سے پہلے آپ نے امام احمد رضا کی تقریباً آٹھ سو تصانیف کی موضوعاتی فہرست پیش کی ہے۔ امام احمد رضا کے حوالے سے آپ کا سب سے عظیم کارنامہ "حیات اعلیٰ حضرت" کی تدوین ہے۔

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ کا وصال شریف ۱۳۴۰ھ/ ۱۹۲۱ء میں ہوا۔ آپ کے وصال کے سترہ سال بعد تک آپ کی حیات وخدمات پر کوئی کام نہ ہوسکا۔ چند مقالات، تاثرات یا مختصر کتابچے ظاہر ہے مشرق کے اس عبقری کا کیا تعارف کرا سکتے تھے۔ اس راہ میں کئی چیزیں حائل ہوئیں۔ ۱۹۲۱ء کا زمانہ خلافت موومنٹ اور نان کواپریشن تحریک کی شورشوں سے لبریز زمانہ تھا۔ پھر سلطنت عثمانیہ کے سقوط، ۱۹۲۵ء سے آریہ سماج کا شدھی سنگٹھن اور پھر ۱۹۳۰ء سے دوقومی نظریے میں آئی شدت اور قیام پاکستان کے تصورات نے ایسا ماحول پیدا کردیا تھا جس نے اسلامیان ہند کے دل ودماغ ہلا کر رکھ دیئے تھے۔ ماحول کی ابتری اور دینی اور سیاسی قائدین کی غیر ذمہ دارانہ حرکتوں نے ذہنوں میں قنوطیت کی ایسی برف جمار کھی تھی کہ فکریں قریب قریب شل ہوچکی تھیں۔ رفتہ رفتہ حالات نے سنبھالا لیا اور برف پگھلنے لگی اور پھر امام احمد رضا کے حوالے سے اس جمود کے حصار سے جوذات گرامی سب سے پہلے نکلی وہ منظور نگاہ اعلیٰ حضرت، حضرت ملک العلما کی ذات کریم تھی۔ آپ نے ہی سب سے پہلے کمر ہمت کسی اور اس "ہفت خواں" کو طے کرنے کی ٹھانی۔ اس راہ میں وابستگان رضا میں سے جاں نثار اعلیٰ حضرت، مولانا سید ایوب علی قادری رضوی نے آپ کا پورا پورا تعاون کیا بلکہ انہوں نے بے مثل ایثار کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے پاس موجود سارا سوانحی مواد حضرت ملک العلما کے حوالے کردیا۔ بارہ سال کی محنت کے بعد چار جلدوں میں یہ تصنیف مکمل ہوئی۔ ۱۹۵۵ء میں اس کا صرف پہلا حصہ شائع ہوا۔ دوسری جلد اب تک دستیاب نہ ہوسکی، تیسری اور چوتھی جلد پہلی جلد کے ہمراہ نصف صدی طے کرنے کے بعد اب شائع ہونے جارہی ہے۔ اس طور سے دیکھا جائے تو حضرت ملک العلما نے سوانحی ادب پر بھی خاصے علمی آثار چھوڑے ہیں۔

فقہ وتصوف:

"مَنْ تَفَقَّهَ وَلَمْ يَتَصَوَّفْ فَقَدْ تَفَسَّقَ وَمَنْ تَصَوَّفَ وَلَمْ يَتَفَقَّهْ فَقَدْ تَزَنْدَقَ" (امام مالک)

"جس نے عالم شریعت ہونے کے ساتھ ساتھ طرز صوفیا کی پیروی نہ کی، وہ بے عمل ٹھہرا اور جس نے صرف زہد اختیار کیا اور شریعت کے علم سے بے بہرہ رہا، اس کے ایمان کا بھی بھروسہ نہیں"۔ ۱۲ ساحل

اس ارشاد مالکی کی روشنی میں فقہ اور تصوف کا آپس میں گہرا ربط نظر آتا ہے بلکہ ابتدا میں دونوں ایک ہی دائرۂ علم میں آتے تھے۔

علامہ محب اللہ بہاری "مسلم الثبوت" میں تحریر فرماتے ہیں:

"ان الفقه فی الزمان القديم كان متناولا لعلم الحقيقة وهی الالهيات من مباحث الذات

والصفات وعلم الطریقة وھی مباحث المنجیات والمہلکات وعلم الشریعة الظاھرة"

"زمانۂ قدیم میں علم فقہ، علم حقیقت کے مباحث پر مشتمل ہوتا تھا جسے علم الٰہیات کہتے ہیں اور جس میں خدائے تعالیٰ کی ذات وصفات سے بحث ہوتی ہے۔ یونہی نجات بخش اور ہلاکت آمیز چیزوں کے علم، علم طریقت اور شریعت مطہرہ کے ظاہری علوم بھی اس علم کے دائرے میں آتے تھے" ۱۲-ساحل

بعد کے زمانوں میں تمدن کے پھیلاؤ نے جب علم کی شاخوں کو ضرب دینا شروع کیا تو فقہ اور تصوف دونوں نے اپنی الگ الگ ممتاز شناختیں بنالیں لیکن ہزار دوری کے باوجود قدیم رفاقت کا اثر تو رہنا ہی تھا۔ اسی لئے حضرت امام غزالی ایک فقیہ کو تصوف کے رنگ میں ہی رنگا دیکھنا چاہتے ہیں۔ فقیہانہ اوصاف کی یہ غزالی تشریح دیکھئے۔ فرماتے ہیں:

"فقیہ وہ ہے جو دنیا سے دل نہ لگائے اور آخرت کی طرف ہمیشہ راغب رہے، دین میں کامل بصیرت رکھتا ہو، طاعات پر مداومت اپنی عادت بنالے، کسی حال میں بھی مسلمانوں کی حق تلفی برداشت نہ کرے، مسلمانوں کا اجتماعی مفاد ہر وقت اس کے پیش نظر ہو، مال کی طمع نہ رکھے، آفات نفسانی کی باریکیوں کو پہچانتا ہو، عمل کو فاسد کرنے والی چیزوں سے بھی باخبر ہو، راہ آخرت کی گھاٹیوں سے واقف ہو، دنیا کو حقیر سمجھنے کے ساتھ ساتھ اس پر قابو پانے کی قوت بھی اپنے اندر رکھتا ہو، سفر وحضر اور جلوت وخلوت میں ہر وقت دل پر خوفِ الٰہی کا غلبہ ہو۔" (احیاء العلوم)

فقہ اور فقیہ کی ان تشریحات کی روشنی میں ہم دیکھتے ہیں تو حضرت ملک العلما قدس سرہٗ ایک ممتاز فقیہ اور پرسوز صوفی نظر آتے ہیں۔ تصوف پر آپ کی کوئی باضابطہ تصنیف تو نہیں ملتی لیکن آپ کی جملہ فقہی اور دینی تصنیفات میں حضرات صوفیہ کی رواداری اور اخلاص کے جذبے رونق افروز ملتے ہیں۔ آپ کی پاکیزہ زندگی کے شب وروز معمولات صوفیہ اوراد واشغال سے معمور دکھائی دیتے ہیں۔ تعصب اور تنگ نظری سے کوسوں دور، قلبی پاکیزگی اور طہارت باطن کا نگارخانہ تھی آپ کی ذات گرامی۔ معاند سے بھی کبھی آپ کو سوقیانہ کلام کرتے نہ دیکھا گیا۔ تحریروں کی شائستگی اور جذبوں کی سادگی کہتی ہے کہ یہ کسی مرد خدا کے بول لگتے ہیں۔ زیر نظر مجموعۂ فتاویٰ کے کتاب الحظر والاباحۃ میں کئی صوفیانہ فتاویٰ شامل ہیں۔ حضرت امام غزالی نے ایک فقیہ کے جو اوصاف بیان فرمائے ہیں، وہ سارے اوصاف حضرت ملک العلما کی پاکیزہ، تقویٰ شعار، خداترس اور سراپا اخلاص ذات گرامی میں موجود ملتے ہیں۔

حضرت کی فقیہانہ شان پر کچھ گفتگو کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ فقہ وافتا کے تعلق سے بھی کچھ بنیادی معلومات اور ان کے مختلف مراحل کا اجمالی تعارف پیش کر دیا جائے تاکہ قارئین، کتاب کے مندرجات اور خود صاحب کتاب کی شان کمال کا اندازہ کرسکیں۔

☆☆☆☆☆

انسان جستجو اور دریافت کا پیکر اور ایک دوسرے کے تعاون کا محتاج ہے۔ اس لئے ابتدائے آفرینش سے ہی اس کی جستجو کا سفر جاری ہے اور اس کے ساتھ متوازی طور پر باہمی مفاہمت کا عمل بھی۔ تحقیق وجستجو اور مفاہمت کے اسی سلسلے کو فقہ (یعنی فہم) وافتا (یعنی باہمی دریافت) کی معزز اصطلاحات سے موسوم کرتے ہیں۔ اس طور سے یہ دونوں

چیزیں ابتدائے تخلیق سے چلی آرہی ہیں۔ قرآن حکیم، احادیث طیبہ میں بھی اس کی واضح ہدایات اور فضیلتیں وارد ہیں۔ قرآن کریم کی یہ آیت کریمہ " فَاسْئَلُوْا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ۔ (النحل: ۴۳) (تو اے لوگو! علم والوں سے پوچھو اگر تمہیں علم نہیں) مفتی اور مستفتی دونوں کی اہمیت واضح فرما رہی ہے۔ سارے انبیاء و مرسلین، دُعاۃ و مبلغین اپنی امتوں اور ماتحتوں کو اسلامی احکام بتاتے چلے آئے اور ساری امتیں اپنے پیغمبروں اور رہنماؤں سے شرعی احکام دریافت کرتی رہیں، اس لئے عمومی تناظر میں سبھی رہنما فقیہ اور مفتی اور سارے متبعین مستفتی نظر آتے ہیں۔ لیکن ہماری گفتگو امت محمدی کے مخصوص عرفی فقہاء تک محدود ہے، اس لئے ان الفاظ کے وہی معانی بیان ہوں گے جو ان کے معروف اصطلاحی مفہوم کے گرد گھومتے نظر آئیں۔

فقہ و افتا مفہوم کے اعتبار سے قریب قریب مساوی ہیں۔ البتہ افتا فقیہ کی ایک مخصوص اور ممتاز حیثیت ہوتی ہے۔ علامہ زمخشری فقیہ کی تعریف ان لفظوں میں کرتے ہیں:

" الفقیه : العالم الذی یشق الاحکام و یفتش عن حقائقها "

''فقیہ ایسے عالم دین کو کہتے ہیں جو احکام شریعت کی تہیں کھولتا اور ان کے حقائق کی تفتیش کرتا ہے''۔

ابتدائی زمانہ میں یہ لفظ مجتہد مطلق کے تعلق سے استعمال کیا جاتا تھا لیکن اب ایسے ناقل فتویٰ کو مفتی اور فقیہ کہتے ہیں جو فقہائے کرام کے مختلف طبقات پر گہری نظر رکھتا ہو اور راجح اور مرجوح، مفتیٰ بہ میں امتیاز کی صلاحیت رکھتا ہو۔

حضرت علامہ سید محمد ابن عابدین شامی قدس سرہٗ" رد المحتار علی الدر المختار "میں تحریر فرماتے ہیں:

" المفتی هو المجتهد فاما غیر المجتهد ممن یحفظ اقوال المجتهد فلیس بمفت و الواجب علیه إذا سئل ان یذکر قول المجتهد کالامام علیٰ وجه الحکایة فعرف ان ما یکون فی زماننا من فتوی الموجودین لیس بفتویٰ بل هو نقل کلام المفتی لیاخذ به المستفتی۔ (رد المحتار ۱/ ۴۷)

''مفتی تو مجتہد ہوتا ہے۔ جو شخص مجتہد نہ ہو، صرف کسی مجتہد کے اقوال کو یاد رکھتا ہو، وہ مفتی نہیں ہوتا۔ ایسے شخص پر لازم ہے کہ جب اس سے کچھ پوچھا جائے تو کسی مجتہد جیسے حضرت امام اعظم کا قول بطور حکایت بیان کردے۔ اس وضاحت سے معلوم ہو گیا کہ ہمارے زمانے کے اصحاب فقہ کے فتاویٰ درحقیقت فتویٰ نہیں ہوتے بلکہ وہ کسی حقیقی مفتی کے اقوال کی نقل ہوتی ہے تاکہ مستفتی اس کی روشنی میں حکم شریعت اخذ کر سکے''۔

اسی لئے لوئیس معلوف نے المنجد میں مفتی کی موجودہ تشریح یہ بیان کی ہے:

" المفتی: الفقیه الذی یعطی الفتویٰ و یجیب عما ألقی علیه من مسائل المتعلقة بالشریعة "

''مفتی ایسے اسلامی دانشور کو کہتے ہیں کہ جب اس کے سامنے شریعت سے متعلق مسائل پیش کئے جاتے ہیں تو وہ ان کے جواب دیتا ہے اور شرعی فیصلہ صادر کرتا ہے''۔ (المنجد ص ۹۸)

عبقری فقیہ، اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ رسالہ مبارکہ "اجلی الاعلام ان الفتویٰ مطلقاً علیٰ قول الامام " (۱۳۳۴ھ) میں چند بنیادی مقدمات بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"الرابعة : الفتوىٰ حقيقية وعرفية۔ فالحقيقية هو الإفتاء عن معرفة الدليل التفصيلي واولئك الذين يقال لهم اصحاب الفتوىٰ ويقال "بهذا افتى الفقيه ابو جعفر والفقيه ابو الليث واضرابهما رحمهم الله تعالىٰ ۔ والعرفية: اخبار العالم باقوال الامام جاهلا عنها تقليدا له من دون تلك المعرفة كما يقال فتاوىٰ ابن نجيم والغزى والطورى والفتاوىٰ الخيرية وهلم تنزلا زمانا ورتبة الى الفتاوىٰ الرضوية جعلنا الله تعالىٰ مرضية مُرضية۔ امين"۔

''چوتھا مقدمہ: فتویٰ کی دو قسمیں ہیں: عرفی اور حقیقی۔ حقیقی یہ ہے کہ دلیل تفصیلی کی معرفت کے بعد فتویٰ دیا جائے۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کو اصحاب فتویٰ کہا جاتا ہے۔ کہتے ہیں: یہی فتویٰ دیا ہے فقیہ ابو جعفر، فقیہ ابو اللیث اور ان کے امثال نے۔ اور عرفی فتویٰ یہ ہے کہ عالم لوگوں کو امام کے اقوال بتادے۔ وہ دلیل کو نہ جانتا ہو، محض تقلید کے طور پر ایسا کرے۔ جیسے کہا جاتا ہے: فتاویٰ ابن نجیم، فتاویٰ غزی، فتاویٰ طوری اور فتاویٰ خیریہ وغیرہ اور بعد کے زمانہ میں فتاویٰ رضویہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کو پسندیدہ اور راضی کرنے والا بنادے۔ آمین!'' (الفتاویٰ الرضویۃ۔ مترجم۔ ۱/۱۰۹)

اس کا ذکر پہلے ہو چکا کہ افتا کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے جتنی انسان کی۔ شریعت محمدی کے نزول سے اس کا شاندار اور ممتاز دور شروع ہوتا ہے۔ سرکار دوعالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بعثت اور نزول قرآن سے اسلامی تعلیمات کا دائرہ مکمل ہونا شروع ہوا۔ حضرات صحابہ وصحابیات بارگاہ رسالت میں حاضر ہوکر اسلامی تعلیمات کا درس لیتے، درپیش آنے والے مسائل دریافت کرتے۔ استفتا اور افتا کا یہ سب سے مستند، قیمتی اور زریں دور ہے جو قیامت تک کے پیش آمدہ مسائل کے حل کے لئے سرچشمۂ فیض کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس دور میں رسول کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ذات والاصفات ہر مسئلہ کا مکمل، مقدس اور تشفی بخش حل پیش کرتی۔ اس تقدس مآب دور اولین کے بعد اب تک فقہ وافتا کے چار شاندار دور گزر چکے ہیں۔

فقہ وافتا کا دوسرا دور: (۱۰ھ تا ۴۱ھ)

اس جہان رنگ وبو سے خورشید رسالت کا جب ظاہری رخ روپوش ہوگیا تو اکابر صحابہ کرام نے امت کی زمام قیادت سنبھالی۔ حضرات خلفائے راشدین نے اسلامی سلطنت کی سرحدیں وسیع کیں تو عجمی تمدن نے نت نئے مسائل درآمد کئے۔ جن کے اسلامی حل کے لئے گروہ صحابہ کے صاحبان تدبر اور والیان تفقہ نے کتاب وسنت کی روشنی میں اپنے تدبر اور تائید الٰہی کے سہارے فیصلے صادر فرمائے جو بعد کی نسلوں کے لئے استناد کا درجہ رکھتے ہیں۔ اس دور میں جو ۱۰ھ سے لے کر ۴۱ھ تک محیط ہے، حضرات خلفائے راشدین، حضرت عبداللہ بن مسعود (م ۳۲ھ) حضرت ابو موسیٰ اشعری (م ۵۲ھ) حضرت معاذ بن جبل (م ۱۸ھ)، حضرت ابی بن کعب، حضرت زید بن ثابت، ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ (م ۵۷ھ) رضی اللہ تعالیٰ عنہا وعنھم اجمعین کے فقیہانہ فیصلے اور فتاویٰ بہت شہرت رکھتے تھے۔

تیسرا دور :(۴۱ھ تا ۱۰۰ھ)

اکابر صحابہ کی صفیں خالی ہونے کے بعد اصاغر صحابہ کرام اور کبار تابعین نے امت کی قیادت سنبھالی۔ اس دور میں اسلامی سلطنت کی وسعتیں شرق وغرب اور جنوب وشمال کی وسعتوں کو اپنے دامن میں سمیٹ چکی تھیں۔ تمدن کی وسعت، علم کی گرم بازاری، اور عرب وعجم کے اختلاط نے اجتہادی جذبوں میں بڑی تیز گامی پیدا کردی تھی۔ مدینہ منورہ، مکہ معظمہ، کوفہ، بصرہ، شام، مصر اور یمن میں فقہائے مجتہدین کی کثیر صفیں آراستہ تھیں، اور ہر ایک کے درس وافادہ کی اپنی ایک الگ ہی دھوم تھی۔ چند اسمائے گرامی پیش ہوتے ہیں۔

۱-ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا (م ۵۷ھ)۔ ۲-حضرت عبد اللہ بن عمر (م ۷۳ھ) ۳-حضرت ابوہریرہ (م ۵۸ھ)۔ ۴-حضرت سعید بن مسیب مخزومی (م ۹۴ھ) ۵-حضرت عروہ بن زبیر بن عوام اسدی (م ۹۴ھ)۔ ۶-حضرت ابوبکر بن عبد الرحمٰن (م ۹۴ھ)۔ ۷-حضرت امام زین العابدین علی بن حسین (م ۹۴ھ)۔ ۸-حضرت قاسم بن محمد بن ابوبکر (م ۱۰۶) ۹-حضرت سالم بن عبد اللہ بن عمر (م ۱۰۶ھ)۔ ۱۰-حضرت سلیمان بن یسار (م ۱۰۷ھ)۔ ۱۱-حضرت نافع (م ۱۱۷ھ)۔ ۱۲-حضرت ابن شہاب زہری (م ۱۲۴ھ)۔ ۱۳-حضرت امام محمد باقر محمد بن علی بن حسین (م ۱۱۴ھ)۔ ۱۴-حضرت امام جعفر بن محمد بن علی بن حسین (م ۱۴۸ھ)۔ ۱۵-حضرت ابوالزناد عبد اللہ بن ذکوان (م ۱۳۱ھ) رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین مدینہ طیبہ میں جلوہ افروز تھے۔

۱۶-حضرت عبد اللہ بن عباس (م ۶۸ھ)۔ ۱۷-حضرت مجاہد بن جبیر (م ۱۰۳ھ)۔ ۱۸-حضرت عکرمہ ابن عباس (م ۱۰۷ھ) مکہ معظمہ کے نامور فقیہ تھے۔

۱۹-حضرت علقمہ بن قیس (م ۶۲ھ)۔ ۲۰-حضرت مسروق بن اجدع (م ۶۳ھ)۔ ۲۱-حضرت عبیدہ بن عمرو سلمانی (م ۹۲ھ)۔ ۲۲-حضرت اسود بن یزید نخعی (م ۹۵ھ)۔ ۲۳-حضرت قاضی شریح بن حارث کندی (م ۹۵ھ)۔ ۲۴-حضرت سعید بن جبیر (م ۹۵ھ)۔ ۲۵-حضرت عمرو بن شرحبیل (م ۱۰۴ھ) کے فقہی افادات کی کوفہ میں دھوم تھی۔

۲۶-حضرت انس بن مالک (م ۹۳ھ)۔ ۲۷-حضرت ابوالعالیہ رفیع بن مہران (م ۹۰ھ)۔ ۲۸-حضرت ابوالشعثاء جابر بن یزید (م ۹۳ھ)۔ ۲۹-امام التعبیر والرویا حضرت محمد بن سیرین (م ۱۳۱ھ) ۳۰-حضرت قتادہ بن دعامہ (م ۱۱۸ھ) کے جلوؤں سے بصرہ کی سرزمین جگمگا رہی تھی۔

۳۱-حضرت عبد الرحمٰن بن غنم اشعری (م ۷۸ھ)۔ ۳۲-حضرت ابوادریس خولانی (م ۸۰ھ)۔ ۳۳-حضرت قبیصہ بن ذویب (م ۸۱ھ)۔ ۳۴-حضرت رجاء بن حیوۃ کندی (م ۱۱۲ھ)۔ ۳۵-حضرت عمر بن عبد العزیز (م ۱۰۱ھ) ملک شام کے نامور فقہاء میں شمار ہوتے تھے۔

۳۶-حضرت عبد اللہ بن عمرو بن عاص (م ۶۵ھ)۔ ۳۷-حضرت ابوالخیر مرشد بن عبد اللہ (م ۹۰ھ) حضرت یزید بن ابی حبیب (م ۱۲۸ھ) نے مصر کے علمی ایوانوں میں اجالا کر رکھا تھا۔

۳۹۔حضرت طاؤس بن کیسان جندی (م ۱۰۶ھ)۔۴۰۔حضرت وہب بن منبہ صنعانی (م ۱۱۴ھ)۔۴۱۔ حضرت یحییٰ بن کثیر نے یمن کی بزم علم میں برکتیں بکھیر رکھی تھیں۔

اس مختصر ترین فہرست سے ہی اندازہ کیجئے کہ اس دور میں اس فن نے کتنی وسعت اختیار کر لی تھی۔اس کثیر پھیلاؤ کی باضابطہ شیرازہ بندی ہوتی ہے چوتھے دور میں۔

چوتھا دور:

اس دور کا دائرہ دوسری صدی ہجری کی ابتدا سے لے کر چوتھی صدی ہجری کے وسط تک پھیلا ہوا ہے۔اسی دور میں سیدنا امام اعظم ابو حنیفہ نعمان بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسی جلیل الشان ذات گرامی معجزۂ سرور کائنات کی صورت میں جلوہ گر ہوئی جنہوں نے اپنے چالیس برگزیدہ تلامذہ کے ساتھ مل کر اس فن کی باضابطہ شاندار تدوین فرمائی جو قیامت تک کے مسائل حیات حل کرنے کے لئے سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔حضرات محققین نے خوب فرمایا:

''فقہ کی کاشت سیدنا عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمائی، حضرت علقمہ نے اس کی آبیاری کی، حضرت ابراہیم نخعی نے اس کھیتی کو کاٹا، حضرت حماد نے اس کی بھوسی اتاری، حضرت امام اعظم نے اسے باریک پیسا، حضرت امام ابو یوسف نے اسے گوندھا اور حضرت امام محمد بن حسن شیبانی نے اس کی روٹیاں پکائیں۔اب ساری امت ان روٹیوں سے شکم سیر ہو رہی ہے''۔

اس دور میں امام الائمہ، سراج الامۃ حضرت امام اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ (۸۰-۱۵۰ھ) کے علاوہ بہت سارے ائمہ کے فقہی مکاتب کی بنیاد پڑی۔مدینہ طیبہ میں حضرت امام مالک بن انس (۹۳ھ-۱۷۹ھ)، مصر میں حضرت امام محمد بن ادریس شافعی (۱۵۰ھ-۲۰۴ھ)، بغداد میں حضرت امام احمد بن حنبل (۱۶۴ھ-۲۴۱)، کوفہ میں حضرت سفیان ثوری (م ۱۶۱ھ) مصر میں امام لیث (م ۱۷۵ھ)، بغداد میں امام ابو ثور (م ۲۴۰ھ)، اندلس اور دمشق میں امام عبد الرحمٰن بن عمرو دمشقی اوزاعی (۸۸ھ-۱۵۷ھ) کے مذاہب پھیلے۔لیکن چار مشہور فقہی مذاہب حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی۔کے سوا کسی دوسرے فقہی مکتب کو بقائے دوام نہ مل سکی۔

یہی وہ دور ہے جس میں فقہ کی باضابطہ اصولی تدوین ہوئی، مختلف مذاہب پھیلے، ہر مذہب کی ترجمان کثیر کتابیں لکھی گئیں، فقہی مباحثات کی روش عام ہوئی، یہاں تک کہ عالم میں صرف چار فقہی مذاہب کے اثرات ہی محفوظ رہ سکے۔ان چاروں مذاہب میں جو عروج اور قبول عام، فقہ حنفی کو نصیب ہوا اسے محض فضل الٰہی، امام الائمہ، سراج الامۃ، کاشف الغمہ سیدنا امام اعظم ابو حنیفہ نعمان بن ثابت کوفی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طہارت باطن، فکری گہرائی اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں آپ کی مقبولیت کا ثمرہ ہی کہا جا سکتا ہے۔امام جلیل حضرت ملا علی قاری حنفی (م ۱۰۱۴ھ) کے بیان کے مطابق پوری امت کا دوتہائی حصہ حنفی ہے۔(مرقات ۲/۲۴)۔اپنے تو خیر اپنے ٹھہرے، غیروں نے بھی آپ کی عظمت، جلالت اور مقبول بارگاہ الٰہی ہونے کی شہادت دی ہے۔سیدنا امام شافعی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ قول کافی شہرت رکھتا ہے:

الناس فی الفقه عیال علی ابی حنیفة :لوگ فقہ میں ابوحنیفہ کے دست نگر ہیں۔

بہت ممتاز شافعی ہندی محدث اور فقیہ علامہ محمد طاہر فتنی (م۹۸۶ھ) صاحب ''مجمع البحار'' ''المغنی'' میں بہت سچی بات تحریر فرماتے ہیں:

فلو لم یکن لله سر خفی فیه لما جمع له شطر الاسلام او ما یقاربه علی تقلیده حتی عبد الله بفقهه وعمل برائه الی یومنا ما یقارب اربع مائة وخمسین سنة وفیه دلیل علیٰ صحته "۔ (المغنی ص ۸۰)

''اگر اس مذہب حنفی میں اللہ تعالیٰ کی قبولیت کا راز پوشیدہ نہ ہوتا تو نصف یا اس کے قریب مسلمان اس مذہب کے مقلد نہ ہوتے۔ ہمارے زمانے تک، جس کو امام صاحب سے تقریباً ساڑھے چار سو برس کا عرصہ ہوتا ہے، ان کی فقہ کے مطابق اللہ وحدہٗ کی عبادت ہو رہی ہے اور ان کی رائے پر عمل ہو رہا ہے۔ یہ اس مذہب کے عند اللہ مقبول اور صحیح ہونے کی شاندار دلیل ہے۔'' (تاریخ علم فقہ۔ مفتی سید عمیم الاحسان، مطبوعہ مکتبہ برہان، دھلی۔ ص ۷۷)

فقہ حنفی کی ایجاد کو بارہ سو سال سے زائد کا عرصہ بیت چکا ہے۔ اس طویل عرصے میں لاکھوں فقہا اور ارباب فتاویٰ پیدا ہوئے، ان کی لسانی اور قلمی یادگاریں تلامذہ اور تصانیف کی صورت میں منظر عام پر آتی رہیں۔ اسلام بحر و بر کی وسعتوں پر محیط ہو چکا ہے۔ کسے یارا ہے کہ ان کے اجمالی حالات بلکہ صرف اسمائے گرامی ہی شمار کر سکے۔ اس لئے مزید تفصیل میں نہ جا کر فقہائے احناف کے طبقات، فقہ حنفی کی مستند کتابوں کی درجہ بندیاں اور چند ممتاز ترین کتب فتاویٰ کی تفصیل پر اکتفا کی جاتی ہے۔

ماہرین فقہ نے حضرات فقہا کو سات طبقوں میں تقسیم کیا ہے۔

۱- مجتہد فی الشرع/ مجتہد مطلق مستقل:

یہ فقہائے اسلام کا وہ طبقہ ہے جنہیں اصولی قواعد کی تاسیس، کتاب وسنت، اجماع اور قیاس سے فرعی احکام کے استنباط کی ذاتی سطح پر استعداد حاصل ہو اور وہ اصول وفروع میں کسی کی تقلید کے محتاج نہ ہوں۔ جیسے سراج الامۃ امام اعظم ابو حنیفہ (م۱۵۰ھ)، امام مالک (م۱۷۹ھ)، امام شافعی (م۲۰۴ھ)، امام احمد بن حنبل (م۲۴۱ھ) وغیرہ۔

۲- مجتہد فی المذہب/ مجتہد مطلق غیر مستقل:

یہ ایسے فقہاء ہوتے ہیں جن میں مجتہد مطلق کی ساری صلاحتیں موجود ہوتی ہیں لیکن وہ خود کو اصول میں کسی مجتہد مطلق کا تابع رکھتے ہیں اور ان کے بنائے ہوئے اصول کی روشنی میں کتاب وسنت، اجماع اور قیاس سے مسائل کے استخراج کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ یعنی اصول میں مقلد ہوتے ہیں اور فروع میں مجتہد۔ جیسے حضرت امام ابو یوسف (م۱۸۳ھ)، امام محمد (م۱۸۹ھ)، امام عبد اللہ بن مبارک (م۱۸۱ھ) وغیرہ تلامذۂ امام اعظم قدست اسرارہم۔

۳- مجتہد فی المسائل/ مجتہد مقید:

ایسے فقہاء اس زمرے میں آتے ہیں جو اصول وفروع دونوں میں مجتہد مطلق کے تابع ہوں اور ان کے وضع

کردہ اصول وفروع کی روشنی میں ایسے مسائل کا استنباط کر سکتے ہوں جن کے بارے میں ائمہ مذہب سے کوئی روایت نہیں ملتی۔ جیسے امام ابوبکر خصاف (م۲۶۱ھ)، امام ابوجعفر طحاوی (م۳۳۱ھ)، امام ابوالحسن کرخی (م۳۴۰ھ)، شمس الائمہ حلوانی (م۴۵۶ھ)، شمس الائمہ سرخسی (م۵۰۰ھ)، امام فخر الاسلام بزدوی (م۴۸۲ھ)، امام فخر الدین قاضی خاں (م۵۹۳ھ)۔

۴- اصحاب تخریج :

حضرات فقہاء کا یہ طبقہ اجتہاد واستنباط مستقل کی قدرت نہیں رکھتا، البتہ ائمۂ مذہب کے وضع کردہ سارے اصول وفروع پر گہری نگاہ ہوتی ہے، جس کی روشنی میں یہ مجمل کی تشریح محتمل کی تعیین مثالوں کے حوالے سے کر سکتے ہیں۔ حضرت امام ابوبکر احمد بن علی رازی (م۳۷۰ھ) اسی طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔

۵- اصحاب ترجیح :

یہ حضرات اصحاب تخریج سے کمتر فقاہت کے حامل ہوتے ہیں اور ائمۂ مذہب سے منقول روایات میں سے اصول وفروع کی روشنی میں بعض کو بعض پر ترجیح دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ جیسے امام ابوالحسن قدوری (م۴۲۸ھ)، صاحب ہدایہ امام ابوالحسن علی بن ابی بکر فرغانی مرغینانی (م۵۹۳ھ) وغیرہ۔

"ھذا اولیٰ، ھذا اصح، ھذا اوضح، ھذا اوفق للقیاس" جیسے اقوال ان کی پہچان ہوتے ہیں۔

۶- اصحاب تمیز :

فقہاء کا یہ گروہ مذہب کے قوی اور ضعیف، مقبول اور مردود اقوال میں تمیز کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ ظاہر الروایہ اور نادر روایات کے درمیان امتیاز کی قدرت ان میں موجود ہوتی ہے، جیسے اصحاب متون معتبرہ مثلاً صاحب مختار، صاحب وقایہ، صاحب مجمع وغیرہ۔

۷- مقلد محض :

جن میں مذکورہ بالا کوئی صلاحیت موجود نہ ہو۔ ایسے حضرات کا ذاتی قول قابل عمل نہیں ہوتا۔ بس یہ ائمۂ مذہب کے اقوال نقل کر سکتے ہیں جیسے موجودہ دور کے صاحبان فقہ۔

حنفی فقہاء کی طرح کتب احناف کے بھی طبقات ہیں۔ علماء نے ان کے تین طبقے بیان کئے ہیں۔ ۱- کتب اصول۔ ۲- کتب نوادر۔ ۳- کتب واقعات۔

۱- کتب اصول:

کتب اصول ہی کو ظاہر الروایہ بھی کہتے ہیں۔ اس طبقے میں وہ کتابیں اور روایات شامل ہیں جو اصحاب مذہب سے منقول ہیں۔ حنفی ائمۂ ثلٰثہ سیدنا امام اعظم ابوحنیفہ، امام ابویوسف، اور امام محمد کی مرویات اسی ذیل میں آتی

ہیں۔ان میں امام زفر، امام حسن بن زیاد وغیرہ تلامذۂ امام اعظم کی روایات کا بھی شمار ہوتا ہے۔لیکن عموماً ظاہر الروایۃ کا اطلاق حضرت امام محمد بن حسن شیبانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ان چھ تصانیف مبارکہ پر ہوتا ہے:

۱-مبسوط ۔۲-جامع صغیر ۔۳-جامع کبیر ۔۴-سیر صغیر ۔۵-سیر کبیر ۔۶-زیادات ۔ یہ کتابیں ظاہر الروایۃ اس لئے کہلاتی ہیں کہ انہیں تواتر کے ساتھ ثقہ راویوں نے روایت کیا ہے۔موجودہ دور میں مسائل اصول جن کتابوں میں جمع ہیں، ان میں حاکم شہید کی کتاب الکافی اور شمس الائمہ سرخسی کی مبسوط نہایت معتمد ہیں۔

۲- کتب نوادر :

اس کے ذیل میں اصحاب مذہب کی وہ روایات آتی ہیں جو مذکورہ بالا چھ کتابوں میں نہ ہوں جیسے حضرت امام محمد کی کیسانیات، ہارونیات، جرجانیات، رقیات، زیادۃ الزیادات (امالی امام محمد بروایت ابن رستم) کے مسائل اور روایات۔حضرت امام ابو یوسف کی کتب الامالی، حضرت امام حسن بن زیادہ کی المحرر وغیرہا۔

۳- کتب واقعات :

ان میں وہ مسائل آتے ہیں جنہیں ائمہ ثلٰثہ کے بعد والے طبقے نے تصنیف یا روایت کیا ہو جیسے فقیہ ابو اللیث سمرقندی کی کتاب النوازل، دیگر حضرات کی مجموع النوازل، واقعات الناطفی، واقعات صدر الشہید۔واقعات دراصل فتاویٰ یا قضایا کے مجموعے ہوتے ہیں۔اسی صنف سے زیر نظر کتاب کا خاص تعلق ہے۔

موجودہ دور میں فقہ حنفی کی ماخذ کے طور پر استعمال ہونے والی مستند کتابیں یہ ہیں:

۱-اصول بزدوی۔امام علی بن محمد بزدوی (م ۴۸۲ھ)۔۲-المبسوط۔شمس الائمہ سرخسی (م ۵۰۰ھ)۔۳-بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع شرح تحفۃ الفقہا۔ملک العلما امام ابو بکر بن مسعود بن احمد کاسانی (م ۵۸۷ھ)۔۴-فتاویٰ قاضی خاں۔امام فخر الدین حسن بن منصور اوز جندی فرغانی معروف بہ قاضی خاں (م ۵۹۲ھ)۔۵-الھدایہ۔امام ابو الحسن علی بن ابی بکر فرغانی مرغینانی (م ۵۹۳ھ)۔۶-البحر الرائق شرح کنز الدقائق، شیخ زین بن ابراہیم معروف بہ ابن نجیم صاحب الاشباہ والنظائر (م ۹۷۰ھ)۔۷-درمختار شرح تنویر الابصار۔علامہ محمد علاء الدین بن علی حصکفی (م ۱۰۸۸ھ)۔۸-ردالمحتار علی الدر المختار۔ علامہ سید محمد امین ابن عابدین شامی (م ۱۲۵۲ھ)۔۹-حاشیۃ الطحطاوی علی الدر المختار۔علامہ سید احمد طحطاوی (م ۱۳۰۲ھ)۔۱۰-طحطاوی علی مراقی الفلاح۔علامہ سید احمد طحطاوی۔۱۱-فتاویٰ عالمگیری۔مفتی نظام الدین وعلما کا بورڈ۔۱۲-العطایا النبویۃ فی الفتاویٰ الرضویۃ۔اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی (م ۱۳۴۰ھ) قدست اسرارہم۔

متوسطین فقہا نے کتب احناف کی ایک درجہ بندی اور کی ہے یعنی ۱-متون ۔۲-شروح ۔اور ۳- فتاویٰ۔ سب سے مقدم اور اہم متون ہیں پھر شروح پھر فتاویٰ۔چند مستند متون، شروح اور فتاویٰ یہ ہیں .

مستند متون :

۱-مختصر امام طحاوی ۔۲-مختصر امام کرخی ۔۳-مختصر امام قدوری ۔۴-کنز الدقائق ۔۵-وافی ۔۶-وقایہ ۔۷-نقایہ ۔۸-اصلاح ۔۹-مختار ۔۱۰-مجمع البحرین ۔۱۱-مواہب الرحمٰن ۔۱۲-ملتقی ۔

مستند شروح :

۱-مذکورہ بالا مختصرات کی شرحیں ۔۲-کتب اصول ستہ (جامع کبیر، جامع صغیر، مبسوط، زیادات، سیر کبیر، سیر صغیر) کی شرحیں ۔۳-مبسوط امام سرخسی ۔۴-بدائع الصنائع ۔۵-تبیین الحقائق ۔۶-فتح القدیر ۔۷-عنایہ ۔۸-بنایہ ۔۹-غایۃ البیان ۔۱۰-درایہ ۔۱۱-کفایہ ۔۱۲-نہایہ ۔۱۳-حلیہ ۔۱۴-غنیۃ ۔۱۵-البحر الرائق ۔۱۶-النہر الفائق ۔۱۷-درر احکام ۔۱۸-در مختار ۔۱۹-جامع المضمرات ۔۲۰-جوہرہ نیرہ ۔۲۱-ایضاح ، وغیرہ ۔

امام احمد رضا کے نزدیک انہیں میں محققین کے حواشی بھی داخل ہیں جیسے غنیۂ شرنبلالی، حواشی خیر الدین رملی، رد المحتار، منحۃ الخالق، فتاویٰ خیریہ، العقود الدریہ للشامی، الفتاویٰ الرضویہ اور اس جیسی دوسری کتابیں ۔ المجتبیٰ، جامع الرموز، شرح ابی المکارم، سراج وہاج، شرح ملا مسکین کا شمار شروح میں نہیں ۔

مستند فتاویٰ :

۱-خانیہ ۔۲-خلاصہ ۔۳-بزازیہ ۔۴-خزانۃ المفتیین ۔۵-جواہر الفتاویٰ ۔۶-محیطات (محیط نام کی متعدد کتابیں) ۔۷-ذخیرہ ۔۸-واقعات ناطفی ۔۹-واقعات صدر الشہید ۔۱۰-نوازل فقیہ ۔۱۱-مجموع النوازل ۔۱۲-ولوالجیہ ۔۱۳-ظہیریہ ۔۱۴-عمدۃ ۔۱۵-کبریٰ ۔۱۶-صغریٰ ۔۱۷-تتمۃ الفتاویٰ ۔۱۸-صیرفیہ ۔۱۹-فصول عمادی ۔۲۰-فصول استروشنی ۔۲۱-جامع صغار ۔۲۲-تاتارخانیہ ۔۲۳-ہندیہ/فتاویٰ عالمگیری ۔۲۴-الاشباہ والنظائر ۔۲۵-منیہ ، وغیرہ ۔

قنیہ، رحمانیہ، خزانۃ الروایات، مجمع البرکات، برہان کا شمار فتاویٰ میں نہیں ۔ فتاویٰ طوری، فتاویٰ محقق ابن نجیم نا قابل اعتماد ہیں ۔ (فتاویٰ رضویہ ملخصاً متفرق جلدیں)

☆☆☆☆☆

اب ایک اجمالی نظر خاص صنف فتاویٰ کی تاریخ پر ۔

تحفظ اور اطلاع کی راہ سے سب سے پہلا مجموعۂ فتاویٰ حضرت مولائے کائنات کا ہے جس کی نقلیں لوگوں نے محفوظ کیں ۔ یونہی حضرت زید بن ثابت کے فتاویٰ کے تحریری مجموعے کا بھی تذکرہ ملتا ہے (مقدمۂ فتاویٰ مظہریہ ص ۵۲) ۔ عرب اپنی بے پناہ قوت حافظہ کی بنا پر باتیں ضبط تحریر میں لانے کو عار سمجھتے تھے اور اپنی قوت حفظ پر ہی زیادہ انحصار کرتے تھے ۔ اس لئے فقہائے صحابہ کی کثرت کے باوجود ان کے فتاویٰ اور فیصلے ضبط تحریر میں نہ لائے جاسکے یا لائے گئے لیکن ان کی باضابطہ حفاظت اور تدوین کا اہتمام نہ ہوسکا ۔ خود احادیث کریمہ کی باضابطہ تدوین تیسری صدی کے آغاز کی چیز ہے

تو پھر فتاویٰ اور قضایا جو وقتی ضرورتیں پوری کرتے ہیں، ان کی تدوین نہ ہو سکی تو یہ کوئی تعجب خیز بات نہیں۔ اس ترقی یافتہ دور میں بھی سیکڑوں اصحاب فتاویٰ ایسے ملیں گے جن کے فتاویٰ محفوظ نہیں رہ پاتے اور رہے بھی تو ان کی ترتیب واشاعت کی نوبت نہیں آتی۔ پھر بھی بعد کی صدیوں میں دوسرے فنون کی کتابوں کی طرح مرتب فتاویٰ کی شرح بھی بڑھتی گئی۔ تدوین کی راہ میں سب سے پہلا مجموعۂ فتاویٰ حضرت فقیہ ابواللیث سمرقندی کا ہے ''کتاب النوازل''۔

صدی کی ترتیب سے چند مشاہیر فتاویٰ ذکر کئے جاتے ہیں:

۱- فتاویٰ ابی بکر۔ ۲- فتاویٰ ابی القاسم (تیسری صدی ہجری)۔ ۳- فتاویٰ ابن قطان۔ ۴- فتاویٰ ابی اللیث۔ ۵- فتاویٰ ابن الحداد (چوتھی صدی)۔ ۶- فتاویٰ ابن الصباغ۔ ۷- فتاویٰ اسبیجابی۔ ۸- فتاویٰ خواہر زادہ۔ ۹- فتاویٰ خجندی (پانچویں صدی)۔ ۱۰- فتاویٰ تمرتاشی۔ ۱۱- فتاویٰ حسام الدین۔ ۱۲- فتاویٰ سراجیہ۔ ۱۳- فتاویٰ ظہیریہ۔ ۱۴- فتاویٰ قاضی خاں۔ ۱۵- فتاویٰ کبریٰ۔ ۱۶- فتاویٰ صغریٰ (چھٹی صدی)۔ ۱۷- فتاویٰ ابن رزین۔ ۱۸- فتاویٰ صوفیہ۔ ۱۹- فتاویٰ ولوالجیہ (ساتویں صدی)۔ ۲۰- فتاویٰ ابن عقیل۔ ۲۱- فتاویٰ زرکشی۔ ۲۲- فتاویٰ سبکی (آٹھویں صدی)۔ ۲۳- فتاویٰ قاری الہدایۃ۔ ۲۴- فتاویٰ حمادیہ۔ ۲۵- فتاویٰ ابن شلبی۔ ۲۶- فتاویٰ ابی السعود۔ ۲۷- فتاویٰ زینیہ (دسویں صدی)۔ ۲۸- الفتاویٰ الخیریۃ لنفع البریۃ۔ ۲۹- العقود الدریۃ فی تنقیح الفتاویٰ الحامدیۃ (تالیف ۱۲۳۸ھ)۔ ۳۰- فتاویٰ جامع البرکات۔ ۳۱- فتاویٰ نقشبندیہ۔ یہ معدودے چند اسمائے فتاویٰ تھے جو کشف الظنون سے انتخاب کئے گئے۔

ہندوستانی فتاویٰ کی تاریخ بھی اتنی ہی پرانی ہے جتنی ہندوستانی اسلام کی۔ ہند کی سرزمین مسلمانوں کے قدم سے عہد فاروقی میں ہی سرفراز ہو چکی تھی۔ جب سلاطین اسلام نے ہندوستان میں قدم جمائے اور اس کفرستان میں اسلام کی پرچم کشائی ہوئی تو اسلامی احکام کے نفاذ اور دریافت کا ایک سلسلہ چل پڑا۔ خود سلاطین اسلام، اسلامی دانشور ہوا کرتے تھے اور فقہی معاملات سے گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ اس ذیل میں سلطان محمود غزنوی، ظہیر الدین محمد بابر، سلطان عالمگیر اورنگ زیب کے نام خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ محمود غزنوی نے خود فقہ پر شاندار کتاب تصنیف کی ''التفرید فی الفروع''۔ دیگر سلاطین نے بھی فتاویٰ کے مجموعے مرتب کرائے۔ اس ذیل میں فتاویٰ عالمگیری کو عالمگیر شہرت حاصل ہوئی جس کی تدوین پر اس زمانے میں دولاکھ روپے صرف ہوئے۔ یہ کتاب عجب اخلاص اور دیانت کی پاکیزہ ٹھنڈی چھاؤں میں مرتب ہوئی کہ صدیوں کی گرد بھی اس کی مقبولیت اور افادیت پر ذرہ برابر اثر انداز نہ ہو سکی بلکہ آئے دن اس کی مقبولیت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ اب تک کئی بین الاقوامی زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ فتاویٰ عالمگیری کے علاوہ ۲- فتاویٰ فیروز شاہی۔ ۳- فتاویٰ ابراہیم شاہی۔ ۴- فتاویٰ اکبر شاہی۔ ۵- فتاویٰ عادل شاہی۔ ۶- فتاویٰ تاتارخانی جیسے مجموعہ ہائے فتاویٰ بھی سلاطین اسلام کے دور کی یادگار ہیں۔

دستور اسلامی کی بنیادی زبان عربی تھی اور سلاطین ہند کی سرکاری زبان فارسی، اس لئے بیشتر فنون کی طرح فتاویٰ کی کتابیں بھی یا تو عربی زبان میں لکھی گئیں یا فارسی زبان میں۔ بارہویں صدی کے اخیر میں جب اس سرزمین پر اردو

نے قدم جمائے تو افغانی سلاطین ہند کے قدم اکھڑ رہے تھے اور انگریزوں کے تسلط کا آغاز ہو رہا تھا۔ اس لئے اب عوام انفرادی سطح پر علمائے امت سے مسائل میں رجوع کرنے لگے اور اردو فتاویٰ کے قیمتی مجموعے بھی منظر عام پر آنے لگے۔ ان میں چند اہم مجموعہ ہائے فتاویٰ یہ ہیں:

۱- العطایا النبویہ فی الفتاویٰ الرضویہ (۱۳۱۰ھ)۔ عبقری فقیہ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ (م۱۳۴۰)۔ ۲- فتاویٰ ارشادیہ (مطبوعہ ۱۹۵۵ء)۔ علامہ ارشاد حسین رامپوری۔ ۳- فتاویٰ محبوبیہ (مطبوعہ ۱۳۱۶ھ)۔ مولانا احمد حسین خان۔ ۴- فتاویٰ امجدیہ۔ علامہ مفتی حکیم ابو العلا محمد امجد علی قادری رضوی۔ ۵- فتاویٰ مولانا عبدالحی فرنگی محلی۔ ۶- فتاویٰ قیام الملۃ والدین۔ مولانا عبدالباری فرنگی محلی۔ ۷- فتاویٰ نعیمیہ۔ مفتی احمد یار خاں نعیمی۔ ۸- فتاویٰ نظامیہ۔ مفتی رکن الدین۔ مطبوعہ حیدر آباد دکن۔ ۹- فتاویٰ صدارت العالیہ۔ مطبوعہ حیدر آباد دکن (۱۳۵۴ھ)۔ ۱۰- فتاویٰ واحدی۔ علامہ عبدالواحد سیوستانی (مطبوعہ لاہور ۱۳۴۶ھ)۔ ۱۱- فتاویٰ مسعودی۔ علامہ محمد مسعود شاہ نقشبندی۔ ۱۲- مجموعہ فتاویٰ۔ مہر علی شاہ گولڑوی (قلمی) ۱۳- فتاویٰ ملک العلماء۔ ملک العلما مولانا شاہ محمد ظفر الدین قادری برکاتی رضوی، وغیرہ وغیرہ۔

☆☆☆☆☆

فقہ و افتا کی تاریخ پر اجمالی نگاہ ڈالنے کے بعد آیئے یہ دیکھتے ہیں کہ منصب افتا کے تقاضے کیا ہوتے ہیں؟۔

فقہ اسلامی کا تعلق زندگی کے ہر شعبہ سے ہے۔ سیاست و امارت، قوانین اور جرائم، انفرادیت اور اجتماعیت، عبادات و معاملات سبھی اس سے جڑے ہوئے ہیں۔ اس لئے مذہب سے لے کر معاشرت تک کے مسائل اور رب سے لے کر بندے تک کے حقوق اس کے دائرہ بحث میں شامل ہیں۔ انفرادی اور شخصی طور پر دیکھئے تو نکاح، طلاق، نسب، پرورش و پرداخت، نفقہ، میراث، ان سبھی معاملات کے مسائل زیر غور آتے ہیں جن سے عائلی اور خاندانی تنظیم میں مدد ملتی ہے۔ اجتماعی اور تمدنی معاملات میں خرید و فروخت، اجارات، رہن، کفالت، شرکت، قرض، وفائے عہد اور دیگر مسائل پر گفتگو ہوتی ہے۔ حقوق عباد میں والدین، اولاد، اہل خاندان، پاس پڑوس، شہر، ملک، قوم اور ملت کے مفادات کا تحفظ اسلامی نقطۂ نگاہ سے ملحوظ ہونا چاہئے۔ اسی لئے یہ سارے معاملات بھی فقہ اسلامی کے دائرے میں آتے ہیں۔ حقوق اللہ میں جملہ فرائض و واجبات، سنن و مستحبات سبھی شامل ہیں۔ غرض دنیا سے لے کر آخرت تک کے مسائل اس فن سے وابستہ ہیں۔ اس لئے فقیہ اور مفتی کا منصب بھی اپنے ساتھ بہت ساری نزاکتیں، ہمہ گیریاں اور اہمیتیں رکھتا ہے جن کے معیار پر پورا اترنے کے لئے مفتی کے اندر چند ممتاز خصائص کا ہونا ضروری ہے۔ آیئے دیکھتے ہیں کہ وہ خصائص کیا ہیں؟۔

کسی مفتی اور فقیہ کے اندر ایک عامی سے بالاتر ذاتی اور علمی دونوں سطح پر کچھ امتیازی خصوصیتیں ہونی چاہئیں۔ ذاتی سطح پر وہ ربط خالق، ربط خلق اور ربط نفس تینوں کے تقاضے پورا کرتا ہو۔ وہ ایک خدا ترس، اطاعت شعار بندہ، رسول رحمت کا جاں نثار امتی، دیانت دار، صداقت شعار، روادار، پیکر اخلاص، دردمند طبیعت رکھنے والا فرد امت ہو، حق پسند، حق گو، ہر قسم کی عصبیت سے بالاتر، حلیم اور بردبار، قول کا دھنی، عمل کی دولت سے مالا مال، دینی

تصلب سے آراستہ، شرافت وتہذیب کا پیکر اور شائستگی سے بھرپور ایک اچھا انسان ہو۔ جو فقیہ ان اوصاف سے آراستہ ہوگا وہی علم اور دین کے تقاضے پورا کر سکے گا۔

علمی سطح پر اس دور میں مقلد مفتی کے اندر درج ذیل خصوصیتیں ہونی چاہئیں:

(۱) مفتی کے لئے ضروری ہے کہ وہ شریعت کے بنیادی مصادر سے واقف ہو خصوصاً کتاب وسنت، تفسیر وحدیث کے موجودہ ذخیرے پر وسیع نگاہ ہونی چاہئے تاکہ وہ پوری بصیرت کے ساتھ اپنے ائمۂ مذہب کے اقوال کی تفہیم اور تلقین کی ذمہ داری ادا کر سکے اور نت نئے مسائل کے جوابات کتاب وسنت کی جاں بخش ضیاؤں میں اصول ائمۂ مذہب سے استفادہ کرتے ہوئے مدلل طریقے سے پیش کر سکے۔

(۲) مفتی جس امام کی تقلید کرتا ہے، اس مذہب کی کتابوں اور فقہاء کے علمی مراتب اور طبقات سے پوری طرح واقفیت رکھتا ہو تاکہ اس ناقل مفتی کو اقوال ائمہ کی نقل وروایت میں دشواری پیش نہ آئے اور نہ وہ اس راہ میں تسامح کا شکار ہو بلکہ پوری بصیرت کے ساتھ افتا کی منصبی ذمہ داری پوری کر سکے۔

(۳) مفتی کو راجح اور مرجوح اقوال کا علم ہونا چاہئے تاکہ کہیں بے علمی میں قول مرجوح پر فتویٰ نہ دے بیٹھے جب کہ قول مرجوح پر فتویٰ دینا باطل ہے۔

(۴) مذہب احناف کی کتابوں کی متاخرین نے بالترتیب تین درجہ بندیاں کی ہیں۔ ۱- متون۔ ۲- شروح۔ ۳- فتاویٰ۔ ہر ایک درجے میں معتمد اور غیر معتمد دونوں طرح کی کتابیں موجود ہیں۔ مفتی کو اس کی واقفیت ہونی چاہئے کہ کون سے کتاب کس خانے میں آتی ہے اور آیا وہ معتمد ہے بھی یا نہیں؟۔

(۵) معتمد اور متداول کتابوں کا بالاستیعاب مطالعہ ہونا چاہئے اور ائمۂ مذہب کے اختلاف کی صورت میں رسم المفتی اور آداب الافتا کی دفعات کی پابندی کرنی چاہئے، یعنی روایت، درایت، ترجیح وتصحیح کے اعتبار سے مضبوط پہلو پر عمل ہو۔

(۶) مفتی کے لئے حالات زمانہ سے واقفیت اور حتی الوسع رعایت ضروری ہے ورنہ زبردست فساد کا اندیشہ ہے۔ ''من لم یعرف اھل زمانہ فھو جاھل'' (جو حالات زمانہ سے واقف نہیں، وہ نادان ہے) مشہور فقیہانہ مقولہ ہے۔

(۷) فقہی اصطلاحات، مستند کتابوں کے انداز بیان اور مصنفین کے ترتیبی مزاج سے واقفیت بھی ضروری ہے تاکہ اقوال اخذ کرنے میں غلطی نہ ہونے پائے۔ بعض ائمہ سب سے پہلے قوی قول بیان کرتے ہیں پھر ضعیف، بعض کا انداز اس سے مختلف ہوتا ہے۔

(۸) حنفی مفتی کو کسی دوسرے امام کے مذہب پر فتویٰ دینا جائز نہیں۔ حنفی مطلقاً امام اعظم کے مذہب پر عمل کرے گا اور حنفی مفتی ہمیشہ حضرت امام اعظم کے قول پر فتویٰ دے گا۔ اسی مستحکم اتباع کے سبب تو اسے حنفی کہتے ہیں۔

امام اہل سنت اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہ تحریر فرماتے ہیں:

(ترجمہ) ''طبع سلیم کے لئے قابل قبول انصاف کی بات یہ ہے کہ ہمارے زمانے کے مفتی کا کام یہی ہے کہ مشائخ نے جو فتویٰ دیا ہے، اسے نقل کر دے۔ اسی بات پر علامہ ابن شلبی اپنے فتاویٰ میں گامزن ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

''اصل یہ ہے کہ امام ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قول پر عمل کیا جائے۔ اسی لئے مشائخ اکثر انہی کی دلیل کو ان کے مخالف اصحاب کی دلیل پر ترجیح دیتے ہیں اور مخالف کے استدلال کا جواب بھی پیش کرتے ہیں۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ عمل قول امام پر ہوگا اگرچہ ایسی جگہ حضرات مشائخ نے یہ صراحت نہ فرمائی ہو کہ فتویٰ قول امام پر ہے۔ اس لئے کہ ترجیح خود صراحتاً تصحیح کا حکم رکھتی ہے کیونکہ مرجوح راجح کے مقابلے میں بے ثبات ہوتا ہے''۔

جب معاملہ یہ ہے تو قاضی اور مفتی کو قول امام سے انحراف کی گنجائش نہیں مگر اس صورت میں جب کہ مشائخ میں سے کسی نے یہ صراحت فرمائی ہو کہ فتویٰ امام کے سوا کسی اور کے قول پر ہے۔'' (فتاویٰ رضویہ، مترجم جلد اول ص ۱۰۰-۱۰۱)

لیکن کسی بھی امام کا قول دو طرح کا ہوتا ہے۔ ۱-قول صوری۔ ۲-قول ضروری۔

اس کی توضیح عبقری الشرق، بے مثل حنفی فقیہ، اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ کے قلم سے ملاحظہ کیجئے۔ آپ اپنے جلیل الشان رسالہ " اجلی الاعلام ان الفتویٰ مطلقا علی قوم الامام ''میں تحریر فرماتے ہیں:

'' الخامسة ''اقول وبالله التوفيق: " القول قولان۔ صوری وضروری۔ فالصوری هو المقول المنقول والضروری مالم يقله القائل نصا بالخصوص لكنه قائل به فی ضمن العموم الحاكم ضرورة بان لو تكلم فی هذا الخصوص لتكلم كذا وربما يخالف الحكم الضروری الحكم الصوری وح ی قضی عليه الضروری حتی ان الاخذ بالصوری يعد مخالفة للقائل والعدول عنه الی الضروری موافقة او اتباعا له كأن كان زيد صالحا فامر عمرو خدامه باكرامه نصا جهارا و كرر ذلك عليهم مرارا وقد كان قال لهم " اياكم ان تكرموا فاسقا ابدا"۔ فبعد زمان فسق زيد علانية فان اكرمه بعده خدامه عملا بنصه المكرر المقرر لكانوا عاصين وان تركوا اكرامه كانوا مطيعين ومثل ذلك يقع فی اقوال الائمة ۔ (الفتاویٰ الرضوية ۱/۱۰۹ لاهور)

''پانچواں مقدمہ'' میں اللہ کی توفیق کے سہارے عرض کرتا ہوں کہ قول کی دو قسمیں ہوتی ہیں: ۱-قول صوری اور ۔ ۲-قول ضروری۔

قول صوری وہ ہے جو کسی نے صراحتاً کہا اور اس سے نقل ہوا۔ اور قول ضروری وہ قول ہے جسے قائل نے صراحتاً اور خاص طور پر نہ کہا ہو مگر وہ کسی ایسے عموم کے ضمن میں اس کا قائل ہو جس سے ضروری طور پر یہ حکم برآمد ہوتا ہے کہ اگر وہ اس خصوص میں کلام کرتا تو اس کا کلام ایسا ہی ہوتا۔

کبھی حکم ضروری، حکم صوری کے خلاف بھی ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں حکم صوری کے خلاف حکم ضروری راجح اور فیصلہ کن ہوتا ہے، یہاں تک کہ اب قول صوری پر عمل کرنا قائل کی مخالفت شمار ہوتا ہے اور حکم صوری کو چھوڑ کر حکم ضروری کی طرف رجوع کو قائل کی موافقت یا اس کی پیروی کہا جاتا ہے۔ مثلاً زید نیک اور صالح انسان تھا۔ اس لئے عمرو نے اپنے خادموں کو کھلے لفظوں میں صراحتاً حکم دیا کہ وہ زید کی تعظیم کیا کریں۔ اس نے اس حکم کا بار بار اعادہ کیا لیکن اس سے پہلے وہ خدام کو یہ حکم عام بھی دے چکا تھا کہ کسی فاسق کی تعظیم ہرگز نہ کریں۔ اتفاق ایسا ہوا کہ زید فاسق معلن ہوگیا۔ اب اگر عمرو کے خدام اس کے مکرر ثابت شدہ صریح حکم پر عمل کرتے ہوئے زید کی تعظیم کریں تو عمرو کے نافرمان شمار ہوں گے

اور اگر اس کی تعظیم ترک کردیں تو اطاعت گزار ٹھہریں گے۔ ایسا ہی معاملہ اقوال ائمہ میں بھی پایا جاتا ہے''۔

اس توضیح کی روشنی میں یہ بات واضح ہوگئی ہوگی کہ ائمۂ احناف بعض اوقات حضرت امام اعظم ابوحنیفہ کے قول ظاہر سے انحراف کرتے ہوئے دیگر پہلو پر کیوں عمل کرتے ہیں اور اس کے باوجود حنفی کیوں کہلاتے ہیں؟۔ لیکن قول امام سے عدول ہر جگہ روا نہیں بلکہ مخصوص حالات میں خاص اسباب کے تحت اس کی اجازت ہوتی ہے۔ وہ خاص اسباب کون سے ہوتے ہیں، اس کی وضاحت کرتے ہوئے امام اہل سنت، اعلیٰ حضرت امام احمد رضا حنفی قادری برکاتی قدس سرہٗ تحریر فرماتے ہیں:

(ترجمہ) ''ائمہ مذہب کے قول صوری کے خلاف حکم ضروری پر عمل ہوتا ہے۔ اس کے درج ذیل چھ اسباب ہوتے ہیں:

۱۔ضرورت ۔۲۔حرج ۔۳۔عرف ۔۴۔تعامل ۔۵۔کوئی اہم مصلحت جس کی تحصیل مطلوب ہو۔ ۶۔کوئی بڑا مفسدہ جس کا ازالہ مطلوب ہو۔

ان اسباب کی بنا پر قول ضروری پر عمل اس لئے ہوتا ہے کہ ضرورتوں کا استثناء، حرج کا دفعیہ، ایسی دینی مصلحتوں کی پاسداری جو اپنے سے زیادہ فساد سے خالی ہوں، مفاسد کو دور کرنا، عرف کا لحاظ کرنا اور تعامل پر کاربند ہونا، یہ سب ایسے قواعد کلیہ ہیں جو شریعت سے معلوم ہیں۔ سارے ائمہ ان کی جانب مائل، ان کی پاسداری کے قائل اور ان پر اعتماد کرتے ہیں۔ اب اگر کسی مسئلے میں امام کا کوئی صریح حکم موجود ہو پھر حکم تبدیل کرنے والے مذکورہ امور میں سے کوئی ایک پیدا ہو تو ہمیں یہ قطعی یقین ہوگا کہ اگر یہ صورت حال خود ائمہ مذہب کے زمانے میں پیدا ہوتی تو ان کا قول اس کے تقاضے کے مطابق ہوتا۔ ان حالات سے آنکھیں موند کر اس کے برعکس وہ ائمہ بھی حکم نہ دیتے۔ ایسی صورت میں ان ائمہ سے غیر منقول قول ضروری پر عمل کرنا ہی دراصل ان کے قول پر عمل ہے۔ اب ان کے سابقہ منقول اقوال صوری پر جم جانا، ان کی پیروی نہ کہلائے گی''۔ (فتاوٰی رضویہ ۱/۱۱۰)

اس کی بہت سی نظیریں فقہائے احناف نے پیش کی ہیں بلکہ خود نص شارع میں اس کی واضح مثال مساجد میں عورتوں کی حاضری ہے جو زمانۂ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں روا تھی بلکہ خود حدیث میں اس کا حکم ہے لیکن بعد میں خود حضرات صحابہ نے عورتوں کو مساجد میں آنے سے سختی سے روک دیا۔ حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا یہ قول خود مسند امام احمد اور صحیحین میں منقول ہے:

''لو ان رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ سلم رای من النساء ما رأینا لمنعھن من المسجد کما منعت بنو اسرائیل نساءھا''

''اگر حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم عورتوں کی موجودہ حالت ملاحظہ فرماتے تو انہیں مسجد میں آنے سے روک دیتے جس طرح بنی اسرائیل نے اپنی عورتوں کو مسجد کی حاضری سے روک دیا''۔

(۸) اصحاب ترجیح فقہا نے جس قول کو ترجیح دے دی، مفتی کو اس کے خلاف فتویٰ دینا ہرگز روا نہیں۔ اگر کسی مسئلے

میں مختلف اقوال مصححہ پائے جائیں توان میں سے جوزیادہ موکداور راجح ہوں، اسی پر فتویٰ دیا جائے۔

اس ترجیح کے لازم العمل اسباب، عبقری فقیہ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ نے بیان فرمائے ہیں۔میں اس کا خلاصہ ذیل میں درج کرتا ہوں:

۱- تصحیح کا زیادہ موکد ہونا۔ ۲- تصحیح کا متون میں اور دوسرے کا شروح میں ہونا۔ ۳- تصحیح کا شروح میں اور دوسرے کا فتاویٰ میں ہونا۔ ۴- فقہانے اس تصحیح کی علت بیان فرمائی اور دوسرے کی کوئی علت اور دلیل نہ پیش کی۔ ۵- تصحیح کا استحسان ہونا۔ ۶- ظاہر الروایۃ ہونا۔ ۷- وقف کے لئے زیادہ نفع بخش ہونا۔ ۸- قول اکثر ہونا۔ ۹- اہل زمانہ کے لئے زیادہ سازگار اور موافق ہونا۔ ۱۰- اوجہ اور دلیل کے لحاظ سے زیادہ واضح ہونا۔ ۱۱- احوط ہونا۔ ۱۲- ارفق (زیادہ سہل العمل) ہونا۔ ۱۳- معمول بہ ہونا۔ ۱۴- مذہب امام ہونا۔ (مترجم فتاویٰ رضویہ ملخصا جلد اول ص ۱۶۹ تا ۱۷۱)

(۹) مفتی کو جواب دینے میں احتیاط سے کام لینا چاہئے۔ جواب معلوم ہونے کے باوجود غور وخوض، تلاش وجستجو سے جب جواب کی صحت کا یقین حاصل ہوجائے تب جاکر جواب سپرد قلم کرے۔ ورنہ بسا اوقات سوال کی جزئیات کے مختلف ہونے سے جواب کی نوعیت بھی بدلتی رہتی ہے۔ اگر باریک بینی اور غور وخوض سے کام نہیں لیا گیا تو معاملہ کچھ کا کچھ ہوجاتا ہے۔

(۱۰) خوف خدا کے سائے میں جواب صاف ستھرے اسلوب میں وضاحت کے ساتھ تحریر کرے۔ شق درشق کی پیچ داریوں سے خود بھی بچے اور سائل کو بھی اس میں الجھنے سے بچائے۔ اگر صورت جواب مختلف النوع ہو تو سائل سے سوال قائم کرکے اس کی نوعیت متعین کرلے پھر متعین رخ پر تحقیقی جواب تحریر کرے۔ لفاظی اور صنائع سے بالکل احتراز کرے، دوٹوک لفظوں میں جواب دے۔ ہاں سلاست اسلوب کی روش مستحسن رہے گی۔

☆☆☆☆☆

فقہ وافتا اور ان کے لوازمات کے اس قدرے تفصیلی جائزے کے بعد جب ہم حضرت ملک العلما کی فقہی نگارشات کا مطالعہ کرتے ہیں تو آپ ایک ممتاز فقیہ، متبحر مفتی اور تجربہ کار اسلامی دانشور نظر آتے ہیں۔ آپ نے چوّن سال تک افتا نگاری فرمائی، کثیر فقہی موضوعات پر رسالے تحریر فرمائے اور نجی محفلوں میں ہزاروں لاکھوں مسائل بیان فرمائے۔

۱- مواہب ارواح القدس لکشف حکم العرس (۱۳۲۳ھ)۔ ۲- اعلام الساجد بصرف جلود الأضحیۃ فی المساجد (۱۳۲۵ھ)۔ ۳- التعلیق علی القدوری (۱۳۲۵ھ)۔ ۴- بسط الراحۃ فی الحظر والاباحۃ (۱۳۲۶ھ)۔ ۵- الفیض الرضوی فی تکمیل الحموی (۱۳۲۶ھ)۔ ۶- رفع الخلاف من بین الاحناف (۱۳۳۲ھ)۔ ۷- القول الاظہر فی الاذان بین یدی المنبر (۱۳۳۳ھ)۔ ۸- تحفۃ الاحباب فی فتح الکوۃ والباب (۱۳۳۶ھ)۔ ۹- نہایۃ المنتہی فی شرح ہدایۃ المبتدی (۱۳۴۳ھ)۔ ۱۰- تسہیل الوصول الی علم الاصول (۱۳۴۸ھ)۔ ۱۱- نافع البشر فی فتاویٰ ظفر (۱۳۴۹ھ)۔ ۱۲- نصرۃ الاصحاب باقسام ایصال الثواب (۱۳۵۴ھ)۔ ۱۳- جامع الاقوال فی رویۃ الہلال (۱۳۵۷ھ)۔ ۱۴- عید کا چاند (۱۳۷۰ھ)۔ ۱۵- تنویر المصباح للقیام عند حی علی الفلاح (۱۳۷۱ھ) جیسی آپ کی قیمتی تحریریں فقہ وافتا کے موضوع

سے ہی تعلق رکھتی ہیں۔

مفتی اور فقیہ کا جو معیار حضرت امام غزالی نے پیش کیا تھا، اس کی روشنی میں احقر نے منصب افتا کے ذمہ دار کے لئے خصائص کے دو خانے ذکر کئے تھے جن میں سے ایک کا تعلق اس کی ذاتی سطح سے تھا اور دوسرے کا علمی سطح سے۔ دونوں سطحوں کا معیار، ان کے لوازمات اور تقاضوں پر گزشتہ اوراق میں گفتگو ہو چکی۔ ان کے تناظر میں ہم جب حضرت ملک العلما کے اوراق حیات کا مطالعہ کرتے ہیں تو آپ ان دونوں معیار پر کھرے اترتے دکھائی دیتے ہیں۔

آپ کا اخلاقی معیار اتنا روشن ہے کہ بس دیکھا کیجئے۔ احقر نے حضرت کی خود نوشت یادداشتیں، قلمی سرمائے، خطوط کے ذخیرے اور مختلف گرانقدر اوراق کی زیارت کی ہے۔ کسی مبالغہ اور تردد کے بغیر عرض کرتا ہوں کہ آپ مجھے ہر قدم پر مخلص امت، مصلح امت، پرسوز داعی، خدا ترس، بندۂ طاعت شعار، دردمند طبیعت اور سوز دروں سے لبریز ایک اچھے انسان نظر آئے۔ آپ کے یہاں حرص و آز کا گذر نہیں، قناعت پسندی شیوۂ فطرت تھی، تنگ دستی کے باوجود ہر کار خیر میں سبقت فرماتے۔ کثیر مدارس، خانقاہوں اور مکتبوں کی اپنی جیب خاص سے مدد فرماتے۔ ملت کے مفادات پر ذاتی مفاد کو بے دریغ قربان کر دیتے، ہر آڑے وقت پر کام آتے۔ آپ کے ساتھ جس نے بھی احسان کیا، اسے ہمیشہ یاد رکھا بلکہ اس کا حق احسان ادا کرنے کی کوشش کی۔ فتنوں سے بےزار اور ہمدردیوں سے ہمیشہ قریب رہے۔ ان باتوں کی قدرے تائید دیکھنی ہو تو اسی مجموعۂ فتاویٰ میں شامل رسالہ مبارکہ ''تحفۃ الاحباب فی فتح الکوۃ والباب'' کا مطالعہ کیجئے۔ اسی طرح ''ہادی الھداۃ لترک الموالات (۱۳۳۹ھ)'' اور ''سد الفرار لمہاجری بہار'' (۱۳۶۶ھ) جیسی تحریروں میں بھی آپ نے بہت سوز دل کے ساتھ ملت کی صحیح راہنمائی کا فریضہ انجام دیا ہے۔

میں یہاں کتاب السیر کے ایک فتوے کا اقتباس پیش کرتا ہوں جس سے حضرت کے سوز دروں اور خیر خواہیٔ امت کا قدرے اندازہ ہو جائے گا۔ ہنود کی دل آزاری کے پیش نظر گائے کی قربانی ترک کرنے پر تنبیہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''لَا یَاْلُوْنَکُمْ خَبَالًا'' کی تصدیق دیکھئے کہ ہاتھ ملاتے ہی قربانی پر نظر شفقت پھیری۔ بظاہر ترک اضحیہ بقر کی خواستگاری ہے مگر اہل اسلام کی مذہبی حالت، احکام خدا کی تعمیل میں توانی (سستی) و مساہلت، ہر ایک کے پیش نظر ہے۔ آج جب روپے، ڈیڑھ روپے میں واجب اضحیہ ادا ہو جاتا ہے، جب تو یہ حالت ہے کہ سیکڑے تیس، جن پر قربانی واجب ہے، نہیں کرتے۔ پھر جب چھ سات روپے صرف ہونے لگیں گے، سیکڑے ستر اسی اس ثواب سے محروم رہا کریں گے۔ بقیہ کا کرنا بھی اس صورت پر موقوف ہے کہ برادران وطن سچے دل سے اس کی اجازت دیں۔ ورنہ دل آزاری کا وہ نایاب نسخہ ہاتھ لگا ہے کہ نہ صرف قربانی بلکہ اذان، تکبیر، جمعہ، جماعت، وعظ، نصیحت، جس کام کو چاہیں گے، بند کرا دیں گے اور پھر دوست کے دوست۔

مسٹر گاندھی وغیرہ لیڈران ہنود کا مسلمانوں سے اتفاق و اتحاد ظاہر کرنا، خلافت خلافت چلانا، صرف اپنا الو سیدھا کرنے، گاؤکشی ترک کرانے کے لئے ہے۔ اخباروں کے کالم ان واقعات سے بھرے پڑے ہیں۔ اخبار حقیقت لکھنؤ ۳۰

جنوری ۱۹۲۰ء کا مضمون جس کی سرخی "انسدادگاؤ کشی پر مسلمانوں کا شکوہ" ہے، ملاحظہ کرنے سے یہ امر اچھی طرح واضح ہوجاتا ہے۔انسدادگاؤ کشی میں مسٹر گاندھی نے سب سے پہلے ابتدا کی ہے۔انہوں نے اپنی دلی محبت سے مسلمانوں سے اتحاد عمل کر لیا ہے اوراس طرح وہ گایوں کی جانوں کو بچانے میں کامیاب ہوگئے۔غرض ان کی چکنی چپڑی باتوں میں آنا اور ابتدائے اسلام سے اس وقت تک مسلمانوں پر جو مظالم ہوتے آئے ہیں، خصوصاحال کے واقعات شاہ آباد و کٹار پور وغیرہ کو اس قدر جلد بھلا دینا، مسلمانوں کی سخت نادانی اور غلطی ہے۔"

علمی سطح پر حضرت ملک العلما کی جامعیت کا ایک زمانہ شاہد ہے۔رائج دینی علوم کا کون سے ایسا گوشہ ہے جو آپ کی نگاہ میں نہ تھا۔اس وسیع النظری پر قدرے گفتگو پہلے بھی ہوچکی ہے۔فقہی زاویے سے چند شواہد یہاں بھی پیش ہوتے ہیں۔

وسعت نگاہ:

حضرت ملک العلما جملہ اسلامی اور فلکیاتی علوم میں اتھارٹی تھے۔ان کی تصانیف کی فہرست سے ہی ان کی علمی وسعت کا اندازہ ہوجاتا ہے۔زیرنظر مختصر مجموعۂ فتاویٰ میں بھی آپ کی علمی گہرائی اور فکری گیرائی کے شواہد بکھرے پڑے ہیں۔میں یہاں اس کے چند اشارے دیتا ہوں۔

احقر نے جب حضرت ملک العلما کے موجودہ فتاویٰ کے مآخذ کتب کی فہرست تیار کی تو یہ کتابیں تین سو سے اوپر جا پہنچیں۔ان میں تقریباً تیس کتابیں فن تفسیر سے متعلق ہیں، ستر سے زائد کتب حدیث اور تقریباً ڈیڑھ سو فقہی کتابیں ہیں۔

فتاویٰ کے دوران جب آپ تفسیر وحدیث اور فقہی کتابوں کے حوالے پیش کرنے پر آتے ہیں تو مستند حوالوں کے انبار لگا دیتے ہیں۔کتاب الصوم کے آغاز میں آیت کریمہ "فَمَنْ شَهِدَ مِنكُمُ الشَّهْرَ" کی تفسیر پیش کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"فَمَنْ شَهِدَ مِنكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ" کی تفسیر میں مفسرین کے متعدد اقوال ہیں۔چند اقوال جو اس وقت نظر فقیر میں ہیں، قلمبند ہوتے ہیں۔

(۱) تفسیر بیضاوی، جلالین، مدارک، تفسیر خازن، ابن جریر طبری، تفسیر نیشاپوری، درمنثور، تفسیر واحدی، تفسیر حسینی، معالم التنزیل، تنویر المقیاس، روح المعانی، بحرالمحیط، النہر، تفسیر کبیر، تفسیر کشاف، تفسیر ابن کثیر، فتح البیان قنوجی، میں ہے: واللفظ للاول "فمن حضر فی الشهر ولم يكن مسافرا فليصمه" یعنی جو شخص رمضان کا مہینہ اپنے گھر میں پائے اور مسافر نہ ہو تو اسے چاہئے کہ روزہ رکھے۔

(۲) تفسیر بیضاوی، تفسیر حسینی، روح البیان، بحرالمحیط میں ہے: واللفظ للبیضاوی "فمن شهد منكم هلال شهر فليصمه" یعنی جو شخص تم میں سے رمضان کا چاند پائے تو اسے چاہئے کہ روزہ رکھے۔

روح المعانی میں اتنا اور بڑھایا "و تیقن بہ" یعنی رمضان کا چاند پائے اور اسے تیقن ہو تو اسے چاہئے کہ روزہ رکھے۔ بحر المحیط میں یہ معنی لکھ کر محاورہ کے اعتبار سے اس معنی کو ضعیف کہا کہ محاورہ شھدت الھلال نہیں کہتے بلکہ شاھدت۔

کتب حدیث اور طرق حدیث کے ذخیروں پر بھی وسیع نگاہ تھی۔ ستر سے زائد کتابوں کے حوالے تو اسی مجموعے میں ملتے ہیں۔ ایک مضمون کی دسیوں حدیث پیش کر دیتے ہیں۔ ایک حدیث کے دسیوں طرق بیان کر جاتے ہیں۔ تعمیر مسجد کے فضائل پر مختلف رواۃ کی چودہ حدیثیں بیان فرمائیں۔ اسی ذیل کی دوسری حدیث بیان فرمائی تو گیارہ ائمہ حدیث کی نو صحابہ کرام سے مرویات بیان کر دیں اور لطف یہ کہ متن کے مختلف اضافے بھی ذکر فرمائے۔ چنانچہ تحریر فرماتے ہیں:

"دوسری حدیث میں ہے: من یبنی للہ مسجدا! جو شخص خدا کے لئے مسجد بنائے وفی روایۃ ولو کمفحص قطاۃ اگرچہ قطاۃ کے گھونسلے جیسی وفی روایۃ او اصغر یا اس سے بھی چھوٹی وفی روایۃ یذکر اللہ عز وجل فیہ تا کہ اس میں ذکر خدا ہوئے (نہ کہ مسجد ضرار کہ تفریق بین المسلمین و تقلیل جماعت کی غرض سے بنائی جائے) بنی اللہ لہ بیتا فی الجنۃ اللہ اس کے لئے گھر جنت میں بنائے گا فی روایۃ من درر ویاقوت موتی اور یاقوت کے رواہ ابن ماجہ وابن حبان وسیدنا ابو حنیفۃ وابن خزیمۃ والبزار فی مسندہ والطبرانی فی الصغیر والترمذی وھو فی الکبیر والاوسط وابن عدی والنسائی عن سیدنا عثمان وعمرو جابر بن عبد اللہ وابی ذر وانس بن مالک وابی امامۃ وابی ھریرۃ واسماء بنت الصدیق وعمرو بن عبسۃ رضی اللہ تعالیٰ عنھم اجمعین"۔

حضرت ملک العلما کے فتاویٰ میں فقہی مراجع بھی کثرت سے استعمال ہوئے ہیں جو آپ کے علم اور مطالعہ کی وسعت کا روشن ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ اس مجموعۂ فتاویٰ میں شامل فقہی رسالے "تنویر المصباح" "نصرۃ الاصحاب" "اعلام الساجد" میں کثیر در کثیر فقہی کتب کے حوالے دیکھے جاسکتے ہیں۔ جمعہ کی اذان ثانی کے بارے میں ایک مختصر سے فتوے میں بائیس کتابوں کے حوالے موجود ہیں۔

تفسیر، حدیث اور فقہی مراجع کی اس قدر کثرت، اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ کے علمی فیضان کی برکت ہی کہی جاسکتی ہے۔ فتاویٰ رضویہ اس تنوع، کثرت اور ہمہ جہتی میں بہت ممتاز ہے۔

آداب افتا کی رعایت :

مفتی کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ فقہا اور کتب فقہ کے مراتب اور رسم المفتی سے مکمل واقفیت رکھتا ہو اور اس کی روشنی میں فتویٰ دیتا ہو۔ حضرت ملک العلما آداب افتا پر بصیرانہ عبور رکھتے تھے اور اپنے فتاویٰ میں ان کا پورا پورا خیال رکھتے بلکہ اوروں کو جب ان کی حدود پھلانگتے دیکھتے تو ان کا بھرپور تعاقب کرتے اور انہیں ان کی ذمہ داریاں یاد

دلاتے۔ اس کی بہت سی نظیریں اس مجموعے میں مل جائیں گی۔ میں یہاں صرف ایک مثال پیش کرتا ہوں۔

سوال تھا: امام کی جائے قیام عام مقتدیوں کی جگہ سے پانچ انگل بلند ہے یا امام دہلیز میں کھڑا ہے تو نماز میں کچھ قباحت تو نہیں؟۔ امام احمد رضا نے جواب مرحمت فرمایا: ''یہ صورت مکروہ ہے'' حوالے پیش فرمائے، وجہ بتائی پھر اس کا مناسب حل پیش فرمایا۔ یہی استفتا ایک اور صاحب افتا کے پاس بھیجا گیا، ان کا جواب تھا: ''پانچ انگل بلند ہو تو کچھ حرج نہیں'' انہوں نے بھی حوالے پیش کیے، علت بیان کی۔

مستفتی نے وہ سوال اور یہ دونوں جوابات حضرت ملک العلما کی خدمت میں پیش کیے۔ حضرت ملک العلما نے آداب افتا سے غافل مفتی کا بھرپور تعاقب کیا۔ میں حوالوں کی عبارات حذف کر کے اس جواب کا خلاصہ پیش کرتا ہوں۔ آپ تحریر فرماتے ہیں:

''جواب سید مولوی ابراہیم رشیدی محض غلط ہے اور دعویٰ محض بے دلیل ... فتاوی عالمگیریہ سے مقدار ارتفاع قامہ اور ذراع جو لکھا ہے، یہ دونوں بوجہ مخالفت ظاہر الروایۃ غیر معتبر ہیں۔ ظاہر الروایۃ (جس پر عمل وافتا متعین اور اس کے خلاف پر فتویٰ دینا جہل وخرق اجماع ہے) وہی ہے جو حضرت مجیب اول متع اللہ المسلمین بطول بقائہ نے اختیار فرمائی ہے۔...

شرح عقود بلکہ باوجود وضوح وشیوع اس کے آپ جیسے تیز فہم کے لئے علما نے تصریح فرمادی کہ جب کبھی فتویٰ لکھنے بیٹھنا تو ظاہر الروایۃ پر عمل کرنا۔ کیونکہ اس کے خلاف پر افتا جہالت ونادانی وخرق اجماع ہے۔

ثانیا: یہ امر مسلم ہے کہ اتباع اس روایت کا کیا جائے گا جس کے موافق درایت ہو اور احادیث ابی داؤد وحاکم وابن حبان وغیرہم کی اس باب میں مطلق ہیں اور ظاہر الروایۃ قدر ممتاز ہے۔ پھر اس سے عدول فقاہت سے دور بلکہ کار جہول ہے۔

ثالثا: تصحیح اور فتویٰ جب مختلف ہو تو عمل میں اعتبار، موافقت اطلاق متون کا ہوتا ہے۔ اور متون سارے کے سارے یک زبان یہی کہہ رہے ہیں: یکرہ ان یقوم فی مکان اعلیٰ من مقام القوم اذا لم یکن بعض القوم معہ۔ تو اس سے عدول محض جہالت ونادانی ہے۔

رابعاً: بحر الرائق میں ثابت کہ مخالف ظاہر الروایۃ کا، مرجوع عنہ ہوتا ہے اور وہ مجتہد کا قول نہیں رہتا پھر باوجود ایماء حنفیت امام کے خلاف فتویٰ دینا، سواء مستثنیات خاصہ مصرحہ فتح وشامی وغیرہما کے، خلاف دیانت وعقل ہے۔

خامساً: آپ کا فرمانا اذا تعارضا امامان الخ۔ محرر صاحب! اولاً تو یہ مسئلہ ہی اختلافی ہے۔ جس درمختار سے آپ سند لائے، اس میں ہی مرقوم ہے:......

''یعنی علامہ خیر الدین رملی نے اپنے فتاوی خیریہ لنفع البریہ میں فرمایا کہ علامات افتا کے بعض الفاظ بعض سے اقویٰ ہوتے ہیں جیسے اصح کہ اقویٰ ہے صحیح سے، تو یہ صحیح پر مقدم کیا جائے گا''۔

سادساً: ذرا یہ تو ارشاد ہو کہ یہاں صحیح اور اصح میں اختلاف کہاں؟ بلکہ اسی روایت کو بعض علماء نے اوجہ لکھا کمافی الدر۔ محقق علی الاطلاق ابن ہمام نے فتح القدیر میں وجیہ فرمایا، فافہم۔ صاحب! یہاں تو ظاہر الروایۃ اور غیر ظاہر الروایۃ

میں اختلاف ہے۔ جہاں ظاہر الروایۃ ہی پر افتا متعین، جسے آپ نے پس پشت ڈال کر یا اپنے پرانے کی نقل بنا کر جہل اور خرق اجماع کی راہ لی ولا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم۔

جب آپ انتقادیات میں اہل سنت کیا بلکہ اہل اسلام کے مخالف ہیں۔ اس شخص کے، جس کے گلے میں علماء عرب وعجم نے تکفیر کی طوق ڈالی ہو، مرید مستفید تو پھر آپ کو ان مسائل میں جو فقہیہ ہیں، جو مابین ہمارے علماء کے مختلف فیہ ہو، قیل وقال کی کس عقلمند نے راہ بتائی؟ اگر اپنے زعم میں فقیہ ہو، کچھ تحریر کرنا چاہتے ہو، تو چشم ما روشن دلِ ما شاد۔ کلمہ پڑھو، علمائے حرمین محترمین کے موافق اپنے عقاید بناؤ، تب ان باتوں میں پڑنا ورنہ ایسی ہی خرافات پر جمے رہو۔ ان اختلافی فرعیات میں بحث کرنا تو احمق نمبر ۲ بننا ہے۔ جیسے کوئی قادیانی یا ہندو کسی سنی حنفی سے مناظر ہو اور کہے کہ آمین بالجہر کہنا چاہئے یا بالاخفاء؟ تو ہر ادنیٰ عقل والا بھی کہے گا کہ ارے او مسخرے! پہلے اسلام لا سنی بن پھر ان باتوں میں منھ کھولنا۔ اللہ تعالیٰ اصدق الصادقین کی تکذیب کریں، حضور اقدس افضل الناس واعلم الناس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی توہین کریں، ابلیس لعین کے علم کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے علم سے زیادہ بتائیں اور فقہیات میں خامہ فرسائی کریں؟ اپنے کو پانچویں سواروں میں بتلائیں؟۔ ع شرم بادت از خدا واز رسول۔

ایسے جاہل مطلق جو آداب مفتی سے محض جاہل اور اس پر طرہ تحریر کا شوق کرے، تو اس سے فتاویٰ عالمگیریہ، اذا تعارض امامان، در المختار، حررہ العبد محمد ابراھیم سنی حنفی چشتی رشیدی، لکھنے کی کیا شکایت؟ ان سب میں الف تو ہضم ہوا ہی تھا لام تو ٹیڑھی کھیر تھا مگر حافظ جی اسے بھی چٹ کر بیٹھے۔ بالجملہ جواب اول صحیح ہے اور تحریر ثانی غلط صریح، جہل قبیح ہے"۔

یہ اقتباس جہاں حضرت کی آداب افتا سے پوری واقفیت، تفقہ اور دقیقہ رسی کو واضح کر رہا ہے، وہیں آپ کی ظرافت ملیح اور تیکھی تنقید کے دلچسپ اسلوب کا بھی آئینہ دار ہے۔

تفقہ:

مقامات دین کے فہم اور اصول دین کی بصیرت کو تفقہ کہتے ہیں۔ یہ ملک العلما کے مربی اور مرشد، اعلیٰ حضرت امام احمد رضا کا خاص رنگ تھا جو ان کے پورے علمی وجود پر چھایا ہوا تھا۔ حضرت ملک العلما نے بھی اس بارگاہ فیض سے حصہ لیا ہے، اس لئے آپ کے یہاں بھی گہری فقاہت ملتی ہے۔ گو آپ کو شہرت ایک محدث، ایک مصنف، ایک مناظر، ہیئت وتوقیت کے ماہر اور جفاکش مدرس کی حیثیت سے ملی لیکن ان سب کے ساتھ ساتھ آپ کے یہاں فقاہت کا جوہر بھی اپنی تمام تر جلوہ سامانیوں کے ساتھ موجود ہے۔ اس دعوے کی تصدیق کے لئے اسی مجموعے سے اخذ کر کے چند مثالیں پیش کرتا ہوں۔

سنی حنفی المذہب کی بنائی ہوئی مسجد میں ایک غیر مقلد صاحب امامت کا شوق رکھتے ہیں۔ مسئلہ پیش ہوتا ہے ملک العلما کی بارگاہ میں۔ یہ سوال تو دستیاب نہ ہو سکا لیکن جواب کی تفصیلات بتاتی ہیں کہ سوال میں بہت ساری جزئیات

تھیں ۔ جواب میں حضرت ملک العلما نے جس جزئیات نگاری، ژرف نگاہی اور دقیقہ رسی سے کام لیا ہے، وہ دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے ۔ بارہ صفحات پر پھیلا ہوا یہ فتویٰ حضرت کی فقاہت کا منھ بولتا ثبوت ہے ۔ پورا لطف تو اصل فتوے کے مطالعہ سے ہی اٹھایا جا سکتا ہے ۔ میں یہاں اکیس نکات پر پھیلے اس فتوے کے خاص خاص گوشوں کا خلاصہ پیش کرتا ہوں ۔

ابتدا ہوتی ہے: غیر مقلد کا استحقاق امامت کا دعویٰ باطل محض ہے کیونکہ بانی اور مصلی سب سنی ہیں اور اہل محلہ بھی جسے چاہیں گے، وہی امام ہوگا ۔ غیر مقلدین بد مذہب ہیں اور بد مذہب کی توقیر حرام ۔ اس لئے امامت کا اعزاز اسے نہیں دیا جا سکتا ۔ بد مذہب حدیث اہل نجران کو سند میں نہیں پیش کر سکتے کہ دیکھو وہ کافر مستامن تھے، حضور نے انہیں مسجد نبوی میں نماز پڑھنے کی اجازت دی تو بھلا ایک کلمہ گو کو مسجد سے کیسے روکا جا سکتا ہے؟ ۔ حضرت نے مختلف حوالوں سے اپنا موقف مستند بنانے کے بعد اخیر میں خوب فرمایا:

''غیر مقلدین اگر حدیث نجران سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں تو پہلے اپنی کلمہ گوئی سے انکار کریں اور یہ ہی کافی نہیں بلکہ اپنے کافر اصلی ہونے کا ثبوت دیں ۔ پھر سلطنت اسلام میں امان لے کر آ جائیں ۔ سلطان اگر مناسب جانے گا تو انہیں بھی کفار نجران کی طرح چند روز امان دے گا اور اتنے دنوں اپنی مسجدوں میں نماز سے نہ روکے گا'' ۔

غیر مقلد امام نے وقف کے استحقاق عام سے فائدہ اٹھانا چاہا تو حضرت نے ترکی بہ ترکی جواب سے اس کی بولتی بند کر دی:

''غیر مقلدین کے نزدیک اگر وقف کا استحقاق ایسا عام ہے تو کیا وہ نوشتہ دے سکتے ہیں کہ ان کی مسجدوں میں ہنود و نصاریٰ و یہود و مجوس و روافض وغیرہم جو فرقہ چاہے جائے اور اپنے طور پر عبادت کرے ۔ ناقوس پھونکیں، گھنٹے بجائیں، آگ جلائیں، چلیپا قائم کریں، انہیں کچھ انکار نہ ہوگا؟'' ۔

گفتگو آگے بڑھتی ہے اور غیر مقلدین کی دراندازی کی ممانعت مختلف وجوہ سے ثابت کی جاتی ہے ۔ ''ان کی آمد سے سنیوں کی دل آزاری ہوتی ہے، فتنے اٹھتے ہیں، عوام بدکتی ہے اور وحشتیں، فتنے، دل آزاریاں مسجد سے دور رکھی جائیں گی'' ۔ آگے چل کر اچھوتی توجیہ یہ پیش کرتے ہیں کہ ان کی مداخلت سے مسجدیں ویران ہوتی ہیں ۔ رقم طراز ہیں:

''غیر مقلدین اگر حنفیہ کی مسجدوں میں نہ آئیں تو یہ مساجد ویران نہ ہوں گی کہ ان کے بانی، ان کے نمازی سنی حنفی، ان کے آباد کرنے والے کثیر و وافر ہیں لیکن انہیں اگر حنفیہ کی مساجد پر قبضہ دیا جائے تو رعایا و ملک کے بڑے حصے کو دو سخت ضرروں میں سے ایک ضرر ضرور پہنچے گا:

۱- یا تو وہ اپنی نہ چھوڑیں اور غیر مقلدین کی مداخلت و اقوال و افعال دل شکنی کے باعث فتنے اٹھیں اور مسجدیں ویران ہو کر جیل آباد ہوں ۔

۲- یا حنفیہ اپنی عزت، اپنی عافیت عزیز رکھ کر اپنی مسجدیں چھوڑ بیٹھیں ۔ ہر طرح غیر مقلدین کا قبضہ ان مساجد کی ویرانی کا سبب ہے اور بحکم قرآن عظیم جس کے آنے سے مسجدیں ویران ہوں، وہی ظالم ہے ۔ اس کو مسجد میں آنے کی اجازت نہیں'' ۔

اس سے نرالی توجیہ ایک ہندوستانی قانون کی روشنی میں ملاحظہ ہو۔ فرماتے ہیں:

''شارع عام اور اسی طرح سر راہ افتادہ غیر مملوک زمینوں میں قانوناً تمام رعایا کا حق بلا تفاوت یکساں ہے۔ سڑکیں، راہیں یا وہ زمینیں ہنود کی بنائی ہوئی ہیں، نہ مسلمانوں کی، نہ ان میں کوئی ان کا مالک یا کسی وجہ سے زیادہ حقدار ہے۔ بااین ہمہ قانوناً مسلمانوں کو وہاں قربانی کی ممانعت ہے۔ یہ قانون غیر مقلدین کو ہماری مسجدوں میں سے ممانعت کی ایک اعلیٰ نظیر قائم کرتا ہے۔ غیر مقلدوں کی نماز اگر ان کا امر مذہبی ہے، تو قربانی کیا ہمارا امر مذہبی نہیں؟ بفرض غلط اگر غیر مقلدین حنفیہ کی مساجد میں آ کر فتنہ نہیں اٹھاتے بلکہ حنفیہ ہی کو اشتعال طبع ہو کر فتنہ پیدا ہوتا ہے تو مسلمان بھی سڑکوں پر قربانی کرنے میں ہرگز خود لڑائی کی ابتدا نہ کریں گے بلکہ ہنود ہی کو اشتعال طبع ہو کر فساد ہوگا۔ مسلمانوں کو اگر شارع عام پر قربانی کرنا ضرور نہیں بلکہ اپنے گھروں یا قرار دادہ مذبحوں میں ادا کر سکتے ہیں تو غیر مقلدین کو بھی شرعاً حنفیہ کی مساجد ہی میں نماز پڑھنا ضرور نہیں۔ اپنی مسجد میں بلا تکلف پڑھ سکتے ہیں۔ پھر کیا وجہ کہ مسلمان شارع عام سے منع کئے جائیں، جس میں وہ حق مساوی رکھتے ہیں اور غیر مقلدین، حنفیہ کی مساجد سے نہ روکے جائیں، جن میں انہیں ہرگز حق مساوی بھی نہیں۔ بلکہ شارع عام درکنار مسلمان ایسے گھروں، اپنی خاص مملوک زمینوں میں قربانی سے باز رکھے جائیں، معدود مواضع مقرر کر دیئے جائیں، حالانکہ گھروں میں قربانی ہنود کے پیش نظر بھی نہ ہوگی۔ ایک قوم کا اشتعال طبع کہ سنی کی بناء پر فرض کر لیا جائے، دوسری قوم کو اپنا امر مذہبی خاص اپنے ملک میں بجالانے سے باز رکھے اور غیر مقلدین کے آنے سے اشتعال طبع کہ خاص نظر کے سامنے اور وہ بھی ان مساجد میں جو حنفیہ کی بنائی ہوئی ہیں اور انہیں کا حق ان میں مقدم ہے، غیر مقلدوں کو ان مساجد سے منع نہ کرے؟ یہ انصاف سے بہت دور ہے۔''

اخیر میں دو اور عقلی رد رکھتے ہوئے جواب مکمل فرماتے ہیں۔ چونکہ یہ دونوں شقیں بھی خالص منطقی ہیں اور تفقہ کی چاشنی سے لبریز۔ اس لئے ان کے اقتباسات ذرا طویل ہونے کے باوجود پیش کرتا ہوں۔ حضرت ملک العلما رقم طراز ہیں:

☆ ''ان کی کتابیں شاہد ہیں کہ وہ ہمیں مشرک جانتے ہیں اور مشرکوں کی بنائی ہوئی مسجدیں شرعاً مسجد نہیں۔ ......تو غیر مقلدین حقیقۃً ہماری مسجدوں کو مسجد ہی نہیں جانتے۔ دھوکا دینے کے لئے اسے مسجد کہنا اور یہ ادعائی اسلام، اپنا حق ان میں مساوی ہونے کا دعویٰ کرنا، خود ان کے اپنے مذہب کے خلاف اور محض ایذا دہی و آزار رسانی و بدنیتی ہے۔ کوئی استحقاق، کوئی دعویٰ انہیں ہماری مساجد پر نہیں ہو سکتا۔ یہ بعینہ ایسا ہے کہ چند ہنود ہماری مساجد پر دعویٰ کریں کہ یہ ہمارے مذہب کے مقدس تیرتھ ہیں۔ ہمیں ان میں پوجا پاٹ کی اجازت ملے۔ حالانکہ یہ دعویٰ صراحۃً فریب اور خود ان کے برخلاف مذہب ہوگا۔ مذہبی معاملے میں خود اپنے مذہب کے خلاف ایک بات کا دعویٰ دوسروں کے حق پر قبضہ پانے کے لئے کرنا، سوائے بدنیتی و آزار رسانی کے کیا ہو سکتا ہے؟ ایسے ناجائز و فاسد المبنیٰ دعویٰ قابل سماعت نہیں ہوتے۔ لہٰذا حنفیہ کی مساجد کو فریق مخالف کے دست تعرض سے محفوظ رکھنا ہی قرین انصاف ہے۔

☆ اس سے تنزل کرتے ہیں کہ غیر مقلدین مبتدع نہیں، مگر اس قدر تو یقیناً معلوم، جس سے کسی فریق کو انکار کی گنجائش نہیں کہ ہمارا ان کا اختلاف عقائد میں ایسا ہے کہ دونوں فریق سے ایک ضرور بد مذہب و گمراہ ہے۔ ......اس کے

ثبوت کے لئے فریقین کی بکثرت کتابیں کہ چھپ کر شائع ہو چکیں، کافی ہیں۔ بلکہ کسی ثبوت کی حاجت نہیں تم ہمیں گمراہ کہتے ہو اور ہم تمہیں۔ اور اگر تم اس وقت مصلحۃً نہ کہو تو ہمارا فریق تو ضرور تمہیں گمراہ و بد دین کہتا اور لکھتا اور چھاپتا ہے۔ اب دو حال سے خالی نہیں۔ یا تو تم فی الواقع گمراہ ہو تو مطلب حاصل۔ یا واقع میں تم ہدایت پر ہو؟۔ تو جو فریق ہدایت کو ضلالت جانے، وہ گمراہ ہے۔ اب یا تو تم ہمیں، ہمارے جمیع اعتقادیات میں حق پر جانتے ہو یا نہیں؟ اگر نہیں تو معلوم ہوا کہ ہمارے بعض اعتقاد تمہارے نزدیک حق نہیں۔ اور اگر ہاں، تو ہمارے اعتقادیات سے ایک یہ بھی ہے کہ تم گمراہ و بد دین ہو، یہ بھی حق ہوا۔ بہر حال دونوں تقدیر پر ایک ضرور گمراہی پر ہے۔ اور شرع مطہر کا اہل حق کو حکم ہے کہ گمراہوں سے میل جول نہ کریں۔ ان سے دور بھاگیں، ان کی نماز میں نہ شریک ہوں، اور وہ بیمار پڑیں تو عیادت کو نہ جائیں، وہ مر جائیں تو جنازے کی نماز نہ پڑھیں۔ اب اگر معاذ اللہ ہم گمراہ ہیں تو تم کو حکم ہے کہ ہم سے دور رہو، ہماری نماز میں شرکت نہ کرو۔ اور اگر تم اہل بدعت ہو تو ہم کو حکم ہے کہ ہم اپنی نماز میں تمہیں شریک نہ ہونے دیں۔

ان اقتباسات سے حضرت کے ذہن عالی کی براقی اور جزئیات نگاری پر گرفت پوری طرح نمایاں ہے۔ اسی طرح کتاب النکاح میں ایک فتوے کی تردید اور اصلاح میں آپ کی جودت طبع اور روشن دماغ نے جو جولانی دکھائی ہے، وہ دیکھنے کی چیز ہے۔ آپ نے جواب اول کی فاش غلطیاں ایسی ورق آشکار کی ہیں کہ بخیئے ادھیڑ دیے ہیں۔ (پورا فتویٰ ص...... پر موجود ہے) یونہی "کھڑکی کا فیصلہ" میں آپ نے جس دیدہ ریزی سے فیصلے کی پوری مسل کا فقیہانہ جائزہ لے کر اس کی خامیاں طشت از بام کی ہیں اور درست شرعی فیصلے کی جانب جیسی مدبرانہ راہنمائی فرمائی ہے، وہ آپ کی تدبر آشنا فکر اور فقیہانہ بصیرت کا کھلا ثبوت ہے۔ (پورا رسالہ کتاب القضا میں دیکھئے)

حضرت کا رسالہ مبارکہ "اعلام الساجد بصرف جلود الاضحیۃ فی المساجد" میں بالکل امام احمد رضا کا فقہی رنگ دمکتا نظر آتا ہے۔ وہی جزئیات نگاری، وہی دقیقہ رسی، وہی کثیر در کثیر حوالجات، وہی استنباطی رنگ۔ مکمل رسالہ ص...... پر ملاحظہ فرمائیں۔ میں یہاں صرف ایک اقتباس پیش کرتا ہوں۔

سوال تھا: قربانی کی کھال بیچ کر اس کی رقم سے مسجد کی تعمیر کی جا سکتی ہے یا نہیں؟۔ جواب اثبات میں ہے۔ عالمگیری کی ایک عبارت پیش کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں:

"عبارت ہذا، تحریر بالا کی روشن دلیل ہے۔ اور اس سے ہر ذکی، متفطن، سلیم الطبع، جزئیات مسائل متعلقہ پوست اضحیہ، ادنیٰ تامل سے نکال سکتا ہے۔ مگر تعمیم نفع کے لئے ایک ضابطہ و قاعدہ کلیہ لکھا جاتا ہے جو قلب فقیر پر ارواح طیبہ اساتذہ کرام و مشائخ عظام حصھم اللہ العلام باللطف العام سے فائض ہوا۔ جس سے ہر عاقل فہیم تمام جزئیات بہ آسانی نکال سکتا ہے۔ وما توفیقی الا باللہ وھو حسبی ونعم الوکیل۔

ظاہر ہے کہ پوست، گوشت اضحیہ دونوں منتفع بہ ہیں اور شریعت مطہرہ نے بعد اراقت دم اس سے انتفاع کا حکم دیا۔ کما قدمنا عن الھندیۃ عن المحیط۔ اور انتفاع دو حال سے خالی نہیں۔ دینی ہو گا یا دنیاوی۔ اول ہر طرح جائز ہے عین سے ہو یا بدل سے۔ لما مر من قولہ ویتصدق بجلدھا وقولہ ولو باعھا بالدراھم لیتصدق بھا جاز

لانہ قربۃ کالتصدق۔

ثانی بھی دو حال سے خالی نہیں۔ یا بعینہ ہوگا یا بدلہ۔ اول مطلقاً جائز ہے۔ لما فی غرر الاحکام "او یجعلہ آلۃ کجراب وخف وفرو" اہ وفی الخانیۃ: "ولا باس بان یتخذ من جلد الاضحیۃ فروا او بساطا او متکئا یجلس علیہ" اہ وفی الکافی والھدایۃ: "او یعمل منہ الۃ تستعمل فی البیت کالنطع والجراب والغربال ونحوھا" اہ کالدلو والسفرۃ والقرب عینی۔

ثانی بھی دو حال سے خالی نہیں یا بدل ثمن ہوگا یا نہیں۔ اول ناجائز ہے۔ تکملہ بحر الرائق وتبیین وخلاصہ میں ہے: "ولا یبیعہ بالدراھم لینفق الدراھم علی نفسہ وعیالہ"

ثانی یعنی بدل ثمن نہ ہو بلکہ مثمن ہو وہ بھی دو حال سے خالی نہیں، یا مستہلک ہوگا یا غیر مستہلک، اول ناجائز ہے۔ لما فی الھدایۃ والتبیین والکافی والطحاوی وخزانۃ المفتیین: "ولا یشتری بہ مالا ینتفع بہ الا بعد استھلاکہ کالخل والابازیر اعتبارا بالبیع بالدراھم والمعنی فیہ انہ تصرف علی قصد التمول۔

ثانی جائز ہے۔ لما فی الھدایۃ وشرح الکنز لملا مسکین والکافی والتبیین والطحاوی وخزانۃ المفتیین: "ولا باس بان یشتری بہ ما ینتفع بعینہ فی البیت مع بقائہ استحسانا"۔

یا یوں خیال کیا جائے کہ قربانی کرنے والا گوشت اضحیہ کو اپنے صرف میں لائے گا یا غیر کے۔ عام ازیں کہ کوئی شخص معین ہو یا غیر معین جیسے رفاہ عام۔ ثانی ہر طرح جائز ہے۔ اور اپنے صرف میں لانے کی چار صورتیں ہیں۔ دو جائز، دو ناجائز (۱) اس کی کوئی چیز بنائے (۲) اس سے کوئی غیر مستہلک چیز بدلے تو جائز ہے اور (۳) اگر روپیوں سے بیچا (۴) کوئی مستہلک چیز خریدی تو ناجائز وممنوع۔ وقد مضت الادلۃ آنفاً۔"

تصوف:

حضرت ملک العلما خشک فقیہ نہیں تھے بلکہ سوز عشق اور نفس سوختہ سے معمور ایک خوش طبع درویش فقیہ تھے۔ یہی سبب ہے کہ آپ کی تحریروں میں ملّانہ خشکی نہیں ملتی بلکہ صوفیانہ لطافت پیرتی محسوس ہوتی ہے۔ دل آزاری سے گریز، تنقید میں بھی شائستگی کا برتاؤ، سوقیانہ پن سے اجتناب، اخلاص کی خوشبو، ہمدردانہ جذبے، غمگسارانہ لہجے کیا ہیں؟۔ صوفیانہ خصائل ہی تو ہیں جن کا رچاؤ ہر جگہ نظر آتا ہے، لیکن عام صوفیانہ روش سے ہٹ کر خاص صوفیانہ مسائل پر بھی آپ نے خامہ فرسائی کی ہے۔ کتاب الحظر والاباحۃ میں اس طرز کے کئی ایک فتاویٰ شامل ہیں۔

ص...... پر سوال ہے کہ کیا زید اپنے والد کی مرضی کے بغیر اشغال صوفیہ میں منہمک ہو سکتا ہے؟۔ اس کا جواب بہت ژرف نگاہی کے ساتھ دیا گیا۔ اطاعت والدین کے فضائل پر مشتمل کثیر احادیث کریمہ بیان کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں

"پس صورت مستفسرہ میں جب کہ باپ اس کا شیخ کے یہاں جانے، حلقے میں شامل ہونے سے روکتا اور کہتا

ہے کہ اس میں میری سخت ناراضگی ہوگی، ہرگز اس شخص کو اجازت نہیں کہ والدین کو ناراض کر کے حلقہ میں شامل ہو۔ (حدیث مبارک ذکر کر کے) جب بے اجازت والدین جہاد کی اجازت نہ ہوئی ....تو باپ کو ناراض کر کے حلقہ میں شامل ہونے کی کیوں کر اجازت دی جائے گی؟ اس شخص کو چاہئے کہ شیطان کے دھوکہ سے باز آئے، والد کی فرمانبرداری کرے، ان کو ایذا نہ دے، عاق نہ بنے، والدین کی رضا بہت بڑی نعمت ہے، اس کی قدر کرے۔

(دوسری جانب باپ کو تلقین کرتے ہیں) اگر اس کا باپ اسے روکنے میں کوئی مصلحت شرعیہ دیکھتا ہے یا اسے اپنے ایذا کا خیال ہے کہ اسے تنہا چھوڑ کر وہ اپنا کام نہ کر سکے گا، تو کوئی حرج نہیں۔ اگر اس کا کوئی حرج نہیں تو ذکر وفکر، شغل واذکار سے وہ اپنے بیٹے کو نہ روکے، کیونکہ اس کو اجازت نہیں کہ وہ کام کرے جو اللہ اور رسول کی رضا کے خلاف ہو"۔

توجہ شیخی کے جواز کو بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''توجہ لینا اپنے پیرومرشد سے اور مرشدوں کا اپنے مریدین کو توجہ دینا جائز اور فعل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وصحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین سے ثابت ہے۔ کتاب الترغیب والترہیب حافظ ذکی الدین عبد العظیم منذری مطبع فاروقی دہلی ص ۳۰۱ س ۹ پر ہے: وعن یعلیٰ ابن شداد قال حدثنی ابی شداد ابن اوس وعبادة بن الصامت حاضر یصدقه قال کنا عند النبی صلی اللہ علیه وسلم فقط فقال هل فیکم غریب یعنی اهل الکتاب قلنا لا یا رسول اللہ! فامر بغلق الباب وقال ارفعوا ایدیکم وقولوا لا اله الا اللہ۔ فرفعنا ایدینا ساعة ثم قال الحمد للہ اللهم انك بعثتنی بهذه الکلمة ووعدتنی علیها الجنة وانت لا تخلف المیعاد ثم قال ابشروا فان اللہ قد غفر لکم۔

یعنی مروی ہے یعلیٰ بن شداد سے، کہا مجھ سے بیان فرمایا میرے باپ حضرت شداد بن اویس نے اور حضرت عبادۃ بن صامت تشریف رکھتے تھے اور میرے باپ کی تصدیق فرماتے تھے۔ کہا، تھے ہم نزدیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے، فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے: کیا تم میں کوئی اجنبی یعنی یہودی یا نصرانی ہے؟ ہم نے عرض کی نہیں یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم۔ پس حضور نے دروازہ بند کرنے کا حکم فرمایا اور ارشاد ہوا کہ تم اپنے ہاتھوں کو اٹھا کر لا الہ الا اللہ کہو تو ایک ساعت تک ہم لوگوں نے ہاتھوں کو اٹھایا۔ پھر حضور نے دعا فرمائی کہ سب خوبیاں اللہ ہی کے لئے ہیں۔ ابھی تو نے مجھے اس کلمہ کے ساتھ بھیجا اور اس پر مجھے جنت کا وعدہ فرمایا اور تو وعدہ خلاف نہیں فرماتا۔ پھر فرمایا کہ خوش ہو کہ عزوجل نے تم کو بخش دیا۔ رواہ الامام احمد باسناد حسن والطبرانی وغیرهما

یہ خاص توجہ لینے اور دینے کا جزئیہ ہے ورنہ لا الہ الا اللہ کی تعلیم کو تو حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تمام جہان کی طرف بھیجے گئے۔ پھر اس پوچھنے کے کیا معنی تھے کہ هل فیکم غریب تم میں کوئی اجنبی تو نہیں؟ پس اس پوچھنے ہی پر بس نہ فرمایا بلکہ دروازہ بند کرنے کا حکم دیا کہ غیر کا دخل نہ ہو؟ تو معلوم ہوا کہ یہ کوئی خاص تلقین لا الہ الا اللہ تھی جس میں خاص ہی خاص حضرات کا حصہ ہے۔ اور یہ وہی توجہ ہے کہ مشائخ کرام اپنے مریدین کو دیتے ہیں۔ وللہ الحمد واللہ تعالیٰ اعلم۔"

حضرت کے اس استدلال نے یہ معاملہ بھی طے فرمادیا کہ حضرات صوفیہ کے معمولات، کتاب وسنت کے اسرار باطنی سے ماخوذ ہیں، یونانیوں اور ویدوں کی تعلیمات کا ملغوبہ نہیں۔

بیعت کی شرائط بیان کرتے ہوئے خالص صوفیانہ طرز کا جواب سپرد قلم کرتے ہیں:

''پیر میں تین باتوں کا ہونا ضروری ہے۔

اول یہ کہ وہ صاحب اجازت، خلیفہ اپنے شیخ کا ہو اور وہ اپنے شیخ کا وعلیٰ ھذا القیاس حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم تک سلسلہ اس کا مسلسل ہو۔

دوسری شرط یہ ہے کہ مسائل شرعیہ ضروریہ سے واقف اور اس کا عامل ہو اور ادائے حقوق شرع میں قاصر ومتہاون نہ ہو۔

تیسری شرط یہ ہے کہ عقیدۂ اہل سنت والجماعت ہو، بدمذہب نہ ہو۔ جاہل سے بیعت درست نہیں کہ ع بے علم نتواں خدارا شناخت۔ جو شخص خود خدا کو نہیں پہچانتا دوسرے کو کیا پہچوائے گا۔

او خویشتن گم ست کرا رہبری کند۔ مشہور مقولہ ہے ''جاہل پیر شیطان کا ٹٹو ہے''

ابریز میں ہے: اذا لم یکن علم لدیه بظاهر ولا باطن فاضرب به ل جج البحر قال الشیخ رضی الله عنه مراده بعلم الظاهر علم الفقه والتوحید ای القدر الواجب منهما علی المکلف ومراده بعلم الباطن معرفة الله تعالیٰ۔

مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ پیر کے لئے ضروری ہے کہ کسی مدرسہ سے دستار فضیلت پائے ہوئے ہو بلکہ اس کو علم باللہ اور علم باحکام اللہ ہو۔ مسائل اعتقادیہ وعملیہ فقہ وقلبیہ تصوف سے بے بہرہ وبے علم نہ ہو۔ حضرات سادات کرام کی فضیلت سید ہونے کی وجہ سے سر اور آنکھوں پر ہے۔ مگر یہاں نسبی بزرگی کی ضرورت نہیں بلکہ مرید ایسے شخص سے ہونا چاہئے جس کے متعلق اس کا یہ اعتقاد ہو کہ اس زمانہ میں تمام لوگوں سے تربیت مرید کے لئے اعلیٰ وافضل ہے، ورنہ اس کو بیعت نہ کرنی چاہئے۔

ابریز فی علم سیدنا عبدالعزیز میں ہے:

لا تقدمن قبل اعتقادك انه مربّ ولا اولی بها منه فی العصر (ای) ولا تقدمن علی شیخ بقصد الدخول فی صحبته حتیٰ تعتقد انه من اهل التربیة وانه لا احق منه بها فی زمنه۔

''یعنی مرید ہونے کے لئے کسی کی خدمت میں اقدام نہ کرو اور اس کی صحبت میں داخل ہونے کا ارادہ نہ کرو جب تک یہ اعتقاد نہ کرلو کہ یہ شخص تربیت کا اہل ہے اور اس زمانہ میں اس سے زیادہ کوئی شخص اس کام کے قابل نہیں''۔

تو اگر کسی غیر سید کے ساتھ اس کو اس طرح وابستگی ہے تو اسی کے ہاتھ پر مرید ہونا چاہئے اور سید صاحب کے ساتھ ہے تو اس کے ہاتھ پر ہو۔ غرض یہ معاملہ معشوق بنانے کا ہے۔ کسی عاشق سے پوچھئے کہ سید پر عاشق ہونا چاہئے یا غیر سید پر؟ جو جواب اس کا ہے، وہی جواب اس کا سمجھئے۔

ہمہ شہر پر ز خوباں، منم و خیال ماہے چہ کنم کہ چشم بدخو نہ کند بکس نگاہے

تنقید :

حضرت ملک العلما کو نقد و نظر کی بھی ایک خاص قسم کی استعداد عطا کی گئی تھی۔ آپ حریف کو اسی کے ہتھیار سے زیر کرنے کے قائل تھے۔ اس طرز کی تحریریں آپ کے مناظراتی رسائل میں خاص طور سے ملتی ہیں۔ زیر نظر مجموعۂ فتاویٰ میں بھی بہت سارے تنقیدی جوابات ملتے ہیں جن میں طرز انشا کی خوشگوار تیکھی تنقید اور دلچسپ ہجو ملیح کے نمونے بھی دیکھنے کو مل جاتے ہیں۔ میں یہاں آپ کے ایک مفصل فتوے کے چند اقتباسات پیش کرتا ہوں۔

فاتحہ کے جواز اور عدم جواز کے سلسلے میں تحریری معرکہ آرائی چل رہی تھی۔ نقد و نظر کے لئے فریقین کی تحریریں استفتا کی صورت میں ملک العلما کے حضور پیش کی گئیں۔ آپ نے ان تحریروں کا بڑا فاضلانہ محاسبہ کیا اور تنقید کا حق ادا کر دیا۔ یہ پورا فتویٰ بارہ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ میں اس کے چند دلچسپ اقتباس پیش کرتا ہوں جو ہیں تو قدرے طویل لیکن افادیت سے لبریز ہیں۔ آپ رقم طراز ہیں :

''علمائے اہل سنت کی تصریحات کے تو دریا اُمڈ رہے ہیں۔ کہاں تک کوئی لکھے۔ اب دو فتویٰ وہابیہ حال کے معتمد الکل فی الکل مولوی رشید احمد گنگوہی کے فتاویٰ رشیدیہ سے نقل کیا جاتا ہے۔ جس سے صاف معلوم ہوگا کہ ان لوگوں کے نزدیک بھی اصل اشیاء میں اباحت ہے۔ اگرچہ وہ وسعت علم و فسحتِ ذکاء و فہم سے اپنی تحریر کو بھی نہ سمجھیں اور اصل اشیاء میں اباحت ہونے کو پرانا مغالطہ اور دھوکے کی ٹٹی کہتے جائیں۔

چونتیسویں سوال ''رنگین کپڑے پہننا، نیلا تہمد باندھنا، موٹی تسبیح رکھنا، بال سر کے بڑھانا اس خیال سے کہ اگلے پیشواوں کا معمول ہے تو اس میں بھی کوئی قباحت ہے یا نہیں؟'' کے جواب میں ہے ''ان ہیئات میں کوئی معصیت نہیں۔ بری نیت سے برا، بھلی نیت سے بھلا ہے۔ فقط''۔ یہ جواب پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ اصل اشیاء میں اباحت ہے۔ جب تو بے کھٹکے بول اٹھے کہ کوئی معصیت نہیں۔ مولوی اصغر حسین صاحب دیوبندی کی طرح (جیسے انہوں نے فاتحہ کے لئے کہا) یہ نہ کہا کہ ''فقہ کی کتاب میں ان ہیئات کا کہیں نام و نشان نہیں۔ لہٰذا امام ابوحنیفہ کے نزدیک بے اصل ہے''۔ نہ محشی صاحب کی طرح یہ کہا کہ ''بہت سے حنفیہ کا یہ قول ہے کہ اصل اشیاء میں حظر یعنی ممانعت ہے۔ تو جب تک اس کا جواز ادلۂ فقہیہ سے نہ ثابت ہو ممنوع و ناجائز رہے گا''۔ نہ مجتہد صاحب کی طرح یہ کہا کہ ''اصل اشیاء میں اباحت پرانا مغالطہ ہے اور اگر بالفرض مان بھی لیں، یہ تمام اشیاء بانفراد ہا جائز ہیں تو جو امور بانفراد ہا جائز ہوں ان کو مجموعہ کر کے یہ ہیئت بنا لینا ، دھوکے کی ٹٹی ہے''۔ نہ ٹکے کی پانچ والی دو ورقی کے مشتہر کی طرح یہ لکھا کہ ''یہ فعل حضرت اور ان کے صحابہ اور تابعین اور ائمۂ مجتہدین سے منقول نہیں (ص ۳ س ۲۶) اور جو غیر منقول ہو اور حضرت کی تعلیم سے زیادہ ہو، بدعت جانیں۔ (ص س ۱۱) نہ یہ کہا کہ ''یہ ہیئت کسی کتاب میں منقول نہیں تو جب تک ان ہیئات کا منقول ہونا یا اس کو کسی مجتہد کا نیک گمان کرنا ثابت نہ کریں گے، تب تک یہ ہیئات بدعت سیئہ رہیں گے اور جو برائی بدعتیوں کی اوپر قریب ہی بیان ہوئی یعنی جس نے اس کی

توقیر کی گویا اس نے مدد کی اسلام کے ڈھانے پر یا ایسے شخص اور جو اسے جگہ دے، اس پر لعنت ہے اللہ کی اور فرشتوں کی اور آدمیوں کی، سب کی اور قبول نہیں کرتا اللہ تعالیٰ اس کے نفل اور نہ فرض وغیرہ ذلک من الاحکام، وہ سب اس ہیئت والے پر ثابت ہوگی" ولاحول ولاقوۃ الا باللہ العلی العظیم"۔

رہا محشی روداد اور "صاحب فاتحہ مرجہ کا فیصلہ" کا عبارتِ درمختار سے دھوکا کھانا اور اصل اشیاء میں توقف بتانا، اباحت کو رائے معتزلہ کہنا، اصل اشیاء میں اباحت کے قائل کو معتزلیت کا مقر بنانا محض "پا در ہوا" اور "رود رقفا" اور بناء فاسد علی الفاسد ہے۔ جس کا کشف بعونہ عزوجل فقیر نے اپنے رسالہ "مواہب ارواح القدس" میں بروجہ تام ومالا کلام کر دیا ہے فلنطالع۔ صاحب "دافع التلبیسات" نے اسی مضمون کے متعلق زیرِ قول دوم وسوم، صادق مجیب تحریر محمد عبدالرحیم کو لکھا: "ناقل کی اعلیٰ درجہ کی حماقت وجہالت ظاہر ہوتی ہے۔ بندہ خدا عبارت کا ترجمہ بھی نہ سمجھا، حق تحریف خوب ادا کیا وغیر ذلک"۔

راقم الحروف ان پاکیزہ الفاظ کے جواب میں صرف المرء یقیس علی نفسہ کی شہرت پر اکتفا کر کے اس بات کا جواب دینا مناسب جانتا ہے کہ فرماتے ہیں: الاصل فی الاشیاء الاباحۃ حنفیہ کا متفق علیہ قاعدہ نہیں الخ، عقلمند عالم! عبارت سمجھنے والے! تحریر میں یہ رقم ہے کہ جمہور حنفیہ کا مختار یہ ہے۔ اس میں کیا حماقت وجہالت ہوئی؟ عبارتِ تحریر ابن ہمام والی یہ ہے "المختار الاباحۃ عند جمہور الحنفیۃ والشافعیۃ" اس عبارت کا ترجمہ آپ کے نزدیک کیا ہے؟ تو مجیب یہ سمجھا سکے۔ انصاف سے کہئے! یہ تینوں گرامی اوصاف آپ کے ہوئے یا مجیب کے؟ ع چھائی جاتی ہے یہ دیکھو تو سراپا کس پر

مزید آگے لکھتے ہیں:

مصباح الضحیٰ میں لکھا کہ "معانقہ غیر قدوم سفر کا باجماع حنفیہ وشافعیہ کے مکروہ ہے"۔ حالانکہ ان کے اقراری امام، محقق وفقیہ ومحدث جلیل شیخ محقق قدس سرہٗ شرح سفر السعادۃ میں فرماتے ہیں: "فقہاء را در جواز معانقہ وکراہتِ آں اختلافے وتفصیلے ست وصحیح جوازِ اوست اگر چہ در غیر قدوم سفر نیز باشد"۔ نہ معلوم ڈپٹی صاحب کے نزدیک اجماع کس چڑیا کا نام ہے؟ اعظم گڑھی صاحب! تحریف اسے کہتے ہیں مصنف کچھ فرمائے، آپ کچھ اس کے سر تھوپ رہے ہیں۔ تحریف اسے کہتے ہیں کہ صرف اپنے مطلب کے دو لفظ لے لئے، باقی سے آنکھیں میچ لیں۔ تحریف اسے کہتے ہیں کہ دعویٰ بے دلیل کر دیا، جو منھ میں آیا کہہ بیٹھے۔ دیکھئے اعظم گڑھی صاحب! تحریف اسے کہتے ہیں جو مولوی بشیر قنوجی نے کی۔ "تفہیم المسائل" ص ۲۷ پر انکارِ استمداد کے لئے "مطالب المومنین" سے نقل کیا "یکرہ الانتفاع بالقبر" اور اس کا مطلب یہ لکھا کہ "قبور سے مدد مانگنا جائز نہیں"۔ حالانکہ اصل عبارت اس کی یہ ہے: "یکرہ التمتع بالمقبرۃ وان لم یبق آثارہ" "قبرستان سے فائدہ لینا مکروہ ہے اگر چہ اس کے آثار باقی نہ رہیں۔

آپ کے اتنا بھی عربی پڑھا سمجھ سکتا ہے کہ یہاں زمین مقبرہ سے تمتع اور اسے اپنے تصرف میں لانے کا ذکر ہے۔ اسی لئے "اگر چہ" کہہ کر ترقی کرتے ہیں کہ قبر کا نشان نہ رہنے کے بعد جوازِ انتفاع کا گمان ہو، لہٰذا التصریح کر دی کہ گو اثر نہ رہے تاہم انتفاع روا نہیں۔ قنوجی صاحب! وہ لفظ جو بالکل ان کے خلاف مطلب بلکہ صریح رد تھا، اڑا گئے اور

براہِ دانشمندی مقبرہ کو قبر بنالیا؟ ۔ کہئے یہ تحریف ہوئی یا نہیں؟ کہو ہوئی!''

ایسی ہی ظریفانہ اور شستہ نثر سے آپ کی ساری تنقیدی تحریریں آراستہ و پیراستہ نظر آتی ہیں۔ احقر زیر نظر مجموعۂ فتاویٰ کے اتنے ہی فنی تعارف پر اکتفا کرتا ہے۔ اب کچھ باتیں ترتیبی مراحل کے تعلق سے۔

☆☆☆☆☆

حضرت ملک العلما علامہ شاہ محمد ظفر الدین قادری برکاتی رضوی قدس سرہٗ سے ان کی سادگی، رواداری، علم وفضل بالخصوص اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ کی نسبت خاص کی وجہ سے احقر کو بے حد عقیدت ہے۔ حضرت کے وصال کو تقریباً نصف صدی ہوتی ہے لیکن چند مضامین کے سوا نہ حضرت پر کوئی کام ہو سکا اور نہ حضرت کی نگارشات کو ہی منظر عام پر لانے کی باضابطہ کوشش ہو سکی۔ تنویر المصباح، نصرۃ الاصحاب، مبارک پور، گھوسی، لاہور اور ہزاری باغ سے شائع ہوئیں۔ ''تنویر السراج فی ذکر المعراج'' اور صحیح البہاری کی کچھ قسطیں پاکستان سے شائع ہوئیں۔ چند مضامین بھی لکھے گئے جن میں مولانا محمد محمود رفاقتی مصنف تذکرہ علمائے اہل سنت کا مضمون ''ملک العلما اور علم حدیث'' قدرے مفصل ہے جو تین قسطوں میں ماہنامہ اشرفیہ مبارک پور سے شائع ہوا۔ لیکن

بے نشانوں کا نشاں مٹتا نہیں مٹتے مٹتے نام ہو ہی جائے گا

اب جمود ٹوٹ چکا ہے۔ حضرت پر تحقیقی کاموں کی پیش رفت ہو چکی ہے۔ برادر محترم مولانا ملک الظفر سہسرامی ایڈیٹر الکوثر (سہ ماہی) سے جب اس موضوع پر گفتگو ہوئی تو انہوں نے ناچیز کی رائے کو شرف قبول عطا کرتے ہوئے اپنے سہ ماہی رسالہ الکوثر شہسرام کا ''ملک العلما نمبر'' نکالنے کا پختہ عزم کر لیا اور ان کی دو سالہ جانفشانہ کاوش کے بعد پانچ سو سے زیادہ صفحات پر مشتمل گرانقدر نمبر مرحلۂ اشاعت کے قریب آن پہنچا ہے۔ حضرت کی گرانقدر تصنیف ''جامع الرضوی معروف بہ صحیح البہاری'' کی جلد اول (عقائد) پر لاہور کی رضا فاؤنڈیشن کام کر رہی ہے۔ احقر نے بھی مختلف جہت سے حضرت ملک العلما کے حضور قلمی نذرانۂ عقیدت پیش کیا ہے۔

۱۔ ''ملک العلما اور علمائے شہسرام'' (مطبوعہ ماہنامہ جہان رضا جون ۱۹۹۹ء)۔ ۲۔ علم توقیت میں ملک العلما کے ایک ممتاز شاگرد، علامہ عبد الرؤف بلیاوی، نائب شیخ الحدیث جامعہ اشرفیہ مبارک پور (مطبوعہ سہ ماہی افکار رضا ممبئی۔ جولائی تا دسمبر ۲۰۰۲ء)۔ ۳۔ ''تاج العلما اور سید العلما کے گرامی مکاتیب بنام ملک العلما مولانا محمد ظفر الدین قادری برکاتی قدست اسرارہم (مطبوعہ جہان رضا، لاہور۔ فروری ۲۰۰۳ء)۔ آج سے چار سال پہلے بہت کاوش کے ساتھ حضرت کا رسالہ "سرور القلب المحزون فی الصبر عن نور العیون" کو جدید انداز میں ''اسلامی نظریہ موت'' کے نام سے ایڈٹ کر کے اس پر تقدیم لکھی، کتابت کے مراحل سے گذارا۔ یہ کتاب المجمع العلمی ہزاری باغ سے شائع ہو چکی ہے۔

حضرت ملک العلما کے فتاویٰ کی ترتیب کے بارے میں احقر نے آج سے تین سال پہلے نبیرۂ ملک العلما محترمی ڈاکٹر طارق مختار صاحب سے تذکرہ کیا تھا۔ موصوف نے بطیب خاطر پورا تعاون دینے کا وعدہ کیا۔ مختلف مرحلوں

میں پیہم اصرار کے بعد اس کی نقول حاصل ہوئیں بالآخر ناچیز نے ذوالحجہ ۱۴۲۳ھ میں اس کی ترتیب کا آغاز کردیا۔ بیشتر مسودات بہت ژولیدہ خط تھے اور بعض کے اوراق تو اس قدر بوسیدہ تھے کہ ان کی سیاہ زیراکس کا پیاں پڑھنا بھی کارے دارد۔ بہر حال! احقر نے اپنے مولیٰ کے بھروسے پر حضرت ملک العلما قدس سرہٗ کی روحانیت سے استعانت کرتے ہوئے اس ناصاف مسودے کی زیراکس کاپیاں دیکھنی شروع کیں۔ ناقل نے کتابت میں اتنی زیادہ غلطیاں کی تھیں کہ اسے پڑھنے اور درست کرنے میں کئی ہفتے بیت گئے۔ بہت سے اوراق کرم خوردہ تھے یا ان کی سطریں وقفے وقفے سے مسلسل نہ تھیں۔ انہیں ملانے اور وہاں مناسب الفاظ جوڑنے میں جو زحمت اٹھانی پڑی، اس کا کیا ذکر کروں۔ اس تجربے سے فتاویٰ رضویہ کے مجاہد مرتبین کی جانکاہیوں کا قدرے اندازہ ہوا۔ اللہ تعالیٰ انہیں پوری ملت کی جانب سے جزائے خیر دے اور ان کی تربتیں شاداب رکھے۔ آمین! بعض ناقص عبارات کی تلاش اور درستگی میں کئی کئی دن لگ گئے۔ مہینوں کے بعد یہ مسودہ ٹائپسٹ کے حوالے ہوا۔ جناب مولانا احسن نیازی صاحب جو حلقۂ دیوبند سے تعلق رکھنے کے باوجود کافی روادار ثابت ہوئے ہیں، انہوں نے اپنی صلاحیتوں کا استعمال کرتے ہوئے یہ ناقص اور بدخط مسودہ پڑھ کر ٹائپ کیا اور بہت حد تک صحت کتابت کا خیال رکھا۔ میں ان کا بے حد ممنون ہوں کہ اگر وہ نہ ملتے تو مجھے پورا مسودہ اپنے قلم سے صاف کرنا پڑتا جو میرے لئے کافی صبر آزما اور وقت صرف مرحلہ تھا۔ بہر کیف! ان مسلسل جانکاہیوں کے بعد چار مہینے کے عرصے میں حضرت ملک العلما قدس سرہٗ کے اس قلمی سرمائے کو منظر عام پر لانے کے قابل کیا جاسکا۔

اس مجموعۂ فتاویٰ میں ایک سو چوبیس فتاویٰ شامل ہیں جن میں کئی ایک بہت مبسوط، مفصل اور بڑے قیمتی ہیں۔ انہیں میں یہ چھ رسائل بھی ہیں:

۱- تنویر المصباح للقیام عند حی علی الفلاح (۱۳۳۰ھ) اقامت میں کس وقت کھڑا ہونا چاہیے۔
۲- عید کا چاند (۱۳۷۰ھ)۔ رویت ہلال کے مسائل۔
۳- تحفت الاحباب فی فتح الکوۃ والباب (۱۳۳۶ھ)۔ کھڑکی کا فیصلہ
۴- اعلام الساجد بصرف جلود الاضحیة فی المساجد (۱۳۲۵ھ)
قربانی کی کھال بیچ کر اس کی رقم سے تعمیر مسجد کا حکم۔
۵- نصرۃ الاصحاب بقسام ایصال الثواب (۱۳۵۴ھ) ایصال ثواب کے شرعی طریقے۔
۶- مواہب ارواح القدس لکشف حکم العرس (۱۳۲۴ھ)۔ عرس کے جواز کا ثبوت۔

یہ وہ رسائل ہیں جو کسی استفتا کے جواب میں معرض تحریر میں لائے گئے۔ اس لئے دراصل یہ فتاویٰ ہیں، گو اپنے حجم کی وسعت اور ضخامت کے سبب انہوں نے مستقل تصنیف کی صورت اختیار کرلی ہے۔ ایک قیمتی رسالہ دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے فتاویٰ کی صفوں میں شامل ہونے سے رہ گیا: القول الاظہر فی الاذان بین یدی المنبر (۱۳۳۳ھ)۔ یہ رسالہ جمعہ کی اذان ثانی کے موضوع پر تھا۔

یہ پورا مجموعہ گیارہ ابواب پر تقسیم ہے، جن میں ایک سو چوبیس فتاویٰ شامل ہیں۔ ان کی تفصیل یہ ہے:

(۱) کتاب الصلوۃ ۔۳۳۔ (۲) کتاب الزکوۃ ۔ ۵ ۔ (۳) کتاب الصوم ۔ ۶ ۔ (۴) کتاب النکاح ۔ ۲۱ ۔
(۵) کتاب الطلاق ۔ ۹ ۔ (۶) کتاب السیر ۔ ۵ ۔ (۷) کتاب الوقف ۔ ۴ ۔ (۸) کتاب القضا ۔ ۱ ۔ (۹) کتاب الاضحیۃ
۔ ۸ ۔ (۱۰) کتاب الحظر والاباحۃ ۔ ۲۶ ۔ (۱۱) کتاب الفرائض ۔ ۶ = ۱۲۴ ۔

یہ سارا سرمایہ دو رجسٹروں میں محفوظ تھا۔ ایک رجسٹر صحیح حالت میں تھا اور دوسرا خستہ۔ ان کے علاوہ کچھ بوسیدہ اوراق پریشاں بھی تھے۔ اس مجموعے کے بیشتر فتاویٰ ۱۳۲۳ھ تا ۱۳۲۵ھ کے دوران کے ہیں جس زمانے میں ملک العلما بریلی شریف میں قیام فرماتے تھے۔ مسودات کے آغاز میں حضرت علام رقم طراز ہیں:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

" الحمد للہ وبہ نستعین وبحمدہ ورضاہ ظفر الدین والصلاۃ والسلام علیٰ سید المرسلین عالم علوم الاولین والآخرین وعلیٰ الہ وصحبہ وعلمائہ وحزبہ لا سیما الامام الاعظم والغوث الاعظم وسائر الاولیاء والعلماء۔ صلی اللہ تعالیٰ علیٰ سیدھم ومولاھم وعلیھم وبارک وسلم ۔ امین!

امابعد! فقیر بارگاہ رضوی محمد ظفر الدین بہاری میجروی قادری برکاتی غفر لہ ما مضیٰ وما سیاتی ، ملتمس کہ یہ چند استفتا مع جوابات ہیں جو بزمانہ قیام بریلی شریف میں سائلوں کے جواب میں لکھے گئے۔ عام مسلمانوں کے فائدے کے لئے کتابی شکل میں ایک جگہ جمع کیے گئے۔ اللہ تعالیٰ اس کی اشاعت کی توفیق بخشے اور اس سے مسلمانوں خصوصاً حنفی بھائیوں کو فائدہ پہنچائے۔ وما ذلك علی اللہ بعزیز وھو حسبی ونعم الوکیل"۔

یہ تحریریں سو سال پہلے کی ہیں اس لئے طرز املا آج سے بہت مختلف تھا۔ احقر نے اسے دور حاضر کے طرز املا کے مطابق ٹائپ کرایا ہے۔ پیراگرافنگ بھی میری ہے۔ آیات قرآنی کی تخریج کردی گئی ہے اور جہاں ترجمہ نہیں تھا، وہاں اعلیٰ حضرت امام احمد رضا کے شاہکار ترجمۂ قرآن کنز الایمان سے ترجمے کا اضافہ بھی کردیا گیا ہے۔ فقہی عبارات میں حوالوں کی تخریج کرنے کا ارادہ تھا لیکن یہ کام کافی دشوار گذار ثابت ہوا۔ بعض بعض عبارتوں نے کئی کئی گھنٹے لے لئے۔ اس لئے پھر اس کا خیال کئی وجہ سے ترک کردیا۔ پہلی وجہ تو یہ تھی کہ اس کا فائدہ خواص اٹھا سکتے ہیں، عوام کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی اور جو حضرات فقہ وافتا سے شغف رکھتے ہیں، ان کی نگاہ خود ہی ضروری مراجع پر ہوتی ہے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ کتابوں کے ایڈیشن بدلتے رہتے ہیں، اس لئے یہ حوالے خواص کے لئے بھی زیادہ مفید ثابت نہیں ہوتے۔ تیسری سب سے اہم وجہ یہ تھی کہ حضرت مصنف نے جن کثیر در کثیر فقہی مآخذ کا استعمال کیا ہے، وہ ساری کتابیں تو کیا ان کا نصف بھی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ جیسے مہتم بالشان ادارے میں موجود نہیں۔ دراصل یہ دارالافتا کی چیزیں ہیں، شاید اسی لئے ان کی فراہمی کی جانب پوری توجہ نہیں کی گئی۔ مکمل فراہمی کتب کی ناکامی کے سبب تشنہ کامی تو بہرصورت رہتی، اس لئے میں نے باقی کتب کی تخریج کا خیال چھوڑ دیا۔ البتہ جہاں جہاں آسانی کے ساتھ حوالے مل سکے، انہیں شامل کرلیا گیا ہے، اس لئے معاملہ بالکل سوکھا بھی نہیں ہے۔

ترتیب کے بعد تقدیم، فہرست مضامین اور فہرست مآخذ تیار کرنے کا مرحلہ تھا۔ تقدیم خاصی طویل ہوگئی اور

اس نے قریب قریب ایک مہینے کا وقت لے لیا۔اس کی تیاری میں درج ذیل کتابوں سے استفادے رہے:

۱- شرح عقود رسم المفتی۔علامہ سید محمد امین ابن عابدین شامی

۲- مقدمہ ردالمحتار علی الدرالمختار۔علامہ سید محمد امین ابن عابدین شامی

۳- العطایا النبویۃ فی الفتاویٰ الرضویۃ (مترجم) اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری۔رضا اکیڈمی ممبئی۔

۴- تاریخ التشریع الاسلامی۔محمد خضری بک/مترجمہ عبدالسلام ندوی۔دار المصنفین۔اعظم گڈھ

۵- الفقہ الاسلامی وادلتہٗ۔الدکتور وھبۃ الزحیلی۔دارالفکر۔دمشق

۶- مقدمہ عمدۃ الرعایۃ حاشیہ شرح وقایہ۔علامہ ابوالحسنات عبدالحی فرنگی محلی۔ فاروقیہ بکڈپو۔دہلی

۷- فتاویٰ مظہریہ۔علامہ مفتی مظہر اللہ نقشبندی۔مرتبہ پروفیسر محمد مسعود احمد۔ادارۂ مسعودیہ۔کراچی۔

۸- آداب الافتا۔مولانا سید ظہیر احمد قادری رضوی۔بیت السادات،دودھ پور۔علی گڑھ

۹- تاریخ علم فقہ۔مفتی سید عمیم الاحسان۔مکتبہ برہان۔دھلی

۱۰- مقدمہ فقہی پہیلیاں۔علامہ ارشد القادری۔کتب خانہ امجدیہ۔دہلی

۱۱- حیات اعلیٰ حضرت۔ملک العلما شاہ محمد ظفرالدین قادری۔قادری بکڈپو،نو محلہ۔بریلی

۱۲- حیات ملک العلما۔پروفیسر مختار الدین احمد۔ادارۂ نعمانیہ۔لاہور

۱۳- ماہنامہ جہان رضا۔جون ۱۹۹۹ء۔مدیر پیرزادہ اقبال احمد فاروقی۔مرکزی مجلس رضا۔ممبئی۔

ان مآخذ کے علاوہ میرے مربی اور مشفق استاذ،فقیہ اعظم ہند شارح بخاری علامہ مفتی محمد شریف الحق امجدی علیہ الرحمۃ کی خدمت میں گذارے ہوئے وہ آٹھ سالہ لمحات بھی اس راہ میں میرے رہنما رہے جن کے دوران میں نے حضرت کی خدمت بابرکت میں رہ کر فتویٰ نویسی کے آداب سیکھے اور تقریباً ایک ہزار فتاویٰ لکھنے کی سعادت میسر آئی۔

فہرست مضامین میں پہلے ارادہ تھا کہ فتاویٰ رضویہ کے جدید ایڈیشن کے طرز پر مضامین اور ضمنی مسائل کی الگ الگ فہرست تیار کی جائے لیکن بعد میں کچھ سوچ کر اس کا ارادہ ترک کر دیا۔اس کی دو وجہ میرے سامنے تھی:

۱- حضرت ملک العلما کا یہ ذخیرہ فتاویٰ چند سال کی کاوشوں پر محیط اور مختصر ہے اس لئے اس میں تفصیل کی ضرورت نہیں۔

۲- دوسری وجہ یہ ہے کہ اس ذخیرے میں وہ تنوع بھی نہیں جو امام احمد رضا کا حصہ تھا۔امام احمد رضا کے یہاں تو علوم کا سمندر موج مارتا نظر آتا ہے۔وہ صرف علوم اسلامیہ سے ہی اپنے فتاویٰ میں استفادہ نہیں کرتے بلکہ معقولات،ارضیات اور فلکیات کی جملہ شاخیں ان کے وسیع ذہن میں سمٹی ہوئی تھیں۔اس لئے وہ سب سے اپنے موقف کی تائیدیں پیش کرتے اور سوالات کے گوشے اجاگر کرتے چلے جاتے ہیں۔اس لئے وہاں ضروری ہے کہ ضمنی غیر متعلق افادات کی بھی الگ سے فہرست دی جائے تاکہ قاری آسانی کے ساتھ بھرپور استفادہ کر سکے۔فتاویٰ ملک العلما میں بھی فیض رضا کی تجلیاں پھیلی ہوئی ہیں لیکن اختصار کے پیش نظر رسائل کی فہرست میں ☆ دے کر اہم ضمنی مسائل کی جانب اشارے کر دیئے گئے ہیں۔

ما خذ کی فہرست میں پورا ذخیرہ کھنگالنے کے بعد کتابوں کو چار خانوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ۱-تفسیر ۲-حدیث۔ ۳-عقائد، اصول، فقہ۔ ۴-سیرت، تصوف وغیرہ۔ ہر ایک خانے کی کتابیں الفبائی ترتیب میں رکھی گئی ہیں۔ ان کے مصنفین کے اسمائے گرامی بقید سن وفات بھی درج کئے گئے ہیں۔ اس ذیل میں فتاویٰ رضویہ کے جدید لاہوری ایڈیشن سے کافی مدد ملی۔ مولیٰ تعالیٰ مفتی عبد القیوم ہزاروی مدظلہ کو پوری ملت اسلامیہ کی جانب سے جزائے خیر دے جنہوں نے یہ گرانقدر سنہرا سلسلہ ترتیب واشاعت شروع کر رکھا ہے۔ اب تک کی اطلاع کے مطابق اس کی چھبیس جلدیں منظر عام پر آچکی ہیں۔

فتاویٰ رضویہ کے علاوہ مولانا آزاد لائبریری اے ایم یو علی گڑھ کی فہرست کتب، مولانا عبد الحئی لکھنوی کی ''اسلامی علوم فنون ہندوستان میں''، زاغب طباخ کی ''تاریخ افکار وعلوم اسلامی'' اور اپنے پاس موجود دیگر کتابوں سے بھی استفادے رہے۔ پھر بھی کہیں کہیں مصنف کا نام یا سن وصال دریافت نہ ہو سکا اس لئے کافی مشقت خیزی کے باوجود تشنگی باقی رہ گئی۔

اب اخیر میں ان کرم فرماؤں کا شکریہ ادا کرنا اپنا اخلاقی فریضہ سمجھتا ہوں جن کے تعاون اور کرم فرمائیوں کے سہارے یہ مرحلۂ سعادت اپنی تکمیل کو پہنچا۔ اس خصوص میں مخدوم گرامی تاج الشریعہ علامہ مفتی محمد اختر رضا خاں قادری ازہری دامت برکاتہم القدسیہ قائم مقام مفتی اعظم ہند، بین الاقوامی شہرت یافتہ بزرگ محقق پروفیسر مختار الدین احمد سابق صدر شعبہ عربی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، استاذ گرامی حضرت علامہ مفتی محمد نظام الدین رضوی مصباحی دام ظلہ صدر شعبہ افتا جامعہ اشرفیہ مبارک پور کا بے حد ممنون ہوں جنہوں نے اپنے کلمات کریمہ سے اس ناچیز کی ہمت افزائی فرمائی اور دعائیہ کلمات سے نوازا۔ گرامی قدر مرتب اعزازی، نبیرۂ ملک العلما محترمی ڈاکٹر طارق مختار صاحب زید کرمہ، خصوصی شکریے کے مستحق ہیں جنہوں نے ہر ہر قدم پر احقر کا تعاون فرمایا اور اپنی شفقتوں کے سائے میں یہ مراحل طے کرائے۔ محب گرامی مفتی محمد عبد الرحیم نشتر فاروقی خلیفہ تاج الشریعہ کا بھی دلی شکریہ کہ انہوں نے اپنے کلمات خیر سے ناچیز کو یاد کیا۔ جناب احسن نیازی صاحب کا بھی ممنون ہوں کہ انہوں نے بہت اپنائیت اور محنت کے ساتھ اسے کتابت کے مرحلے سے گذارا، یہ انہیں کا حصہ تھا ورنہ اس ناقص مسودے کو دوسرا ہاتھ بھی نہ لگاتا۔

ترتیب وکتابت میں ہر ممکن کوشش کی گئی ہے کہ خامیاں دور دور ہی رہیں لیکن بتقاضائے بشریت سہو ممکن ہے۔ اہل نظر اپنی مخلصانہ ہدایات سے نوازیں تاکہ آئندہ ایڈیشن میں اس کی تلافی کی جاسکے۔

مولیٰ تعالیٰ میری یہ مختصر سی فقہی خدمت قبول فرمائے، اس گناہگار کے لئے سامان آخرت کرے اور اپنے محبوب بندے حضرت ملک العلما قدس سرہٗ کی روحانی توجہ ارزانی کا سبب بھی۔ وما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت والیہ انیب وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہ ونور عرشہ محمد والہ وصحبہ اجمعین برحمتك یا ارحم الراحمین۔

محمد ارشاد احمد رضوی ساحل شہسرامی

۲۱ ربیع النور شریف ۱۴۲۴ھ/۲۴ مئی ۲۰۰۳ء بروز شنبہ، ایک بجے دن

ملک العلما - ماہ و سال کے آئینے میں

نبیرۂ ملک العلما، ڈاکٹر طارق مختار
شعبۂ عربی، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

۱۳۰۳ھ : ولادت، ۱۰ محرم الحرام

۱۳۰۷ھ : بسملہ خوانی

۱۳۱۲ھ : مدرسہ غوثیہ حنفیہ، موضع بین، پٹنہ میں داخلہ لیا اور متوسطات کی تعلیم حاصل کی

۱۳۲۰ھ : ۲۵/ جمادی الآخرۃ کو مدرسہ حنفیہ پٹنہ میں داخلہ لیا اور حضرت محدث سورتی (م ۱۳۳۴ھ) سے مسند امام اعظم، مشکوٰۃ شریف وغیرہ کی تعلیم حاصل کی

۱۳۲۰ھ : مدرسہ امداد العلوم، بانس منڈی، کانپور میں حاضر ہوئے۔ اسی دوران اس ادارے کے علاوہ احسن المدارس، کانپور اور ایک اور دار العلوم کے اہل علم سے بھی استفادہ کرتے رہے پھر پیلی بھیت آگئے

۱۳۲۱ھ : مدرسہ مصباح التہذیب، بانس بریلی میں مولوی غلام یٰسین دیوبندی کے درس میں شریک ہوئے

۱۳۲۱ھ : امام اہل سنت اعلیٰ حضرت احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ کی بارگاہ میں حاضری

۱۳۲۲ھ : ملک العلما کی خواہش اور کوشش سے بدست اعلیٰ حضرت دار العلوم منظر اسلام کا قیام

۱۳۲۲ھ : اعلیٰ حضرت قدس سرہٗ کی بارگاہ میں بخاری شریف کا درس اور فتویٰ نویسی کی مشق کا آغاز

۱۳۲۲ھ : ۸/ رمضان المبارک کو پہلا فتویٰ تحریر فرمایا

۱۳۲۳ھ : الحسام المسلول علیٰ منکر علم الرسول (عقائد و مناظرہ) کی تصنیف

۱۳۲۳ھ : مواھب ارواح القدس لکشف حکم العرس (فقہ) کی تصنیف

۱۳۲۳ھ : ظفر الدین الجید (مناظرہ) کی تصنیف

۱۳۲۴ھ : شرح کتاب الشفا بتعریف حقوق المصطفےٰ (سیرت) کی تصنیف کا آغاز

۱۳۲۴ھ : مبین الھدیٰ فی نفی امکان مثل المصطفےٰ (عقائد) کی تصنیف

۱۳۲۵ھ : دستار فضیلت اور سند درس و افتا سے سرفرازی

۱۳۲۵ھ : وسط شعبان المعظم میں اعلیٰ حضرت نے اپنی اجازت و خلافت عطا فرمائی اور فاضل بہار کا لقب عطا کیا

۱۳۲۵ھ : التعلیق علی القدوری (فقہ) کی تصنیف

۱۳۲۵ھ : اعلام الساجد بصرف جلود الاضحیۃ فی المساجد (فقہ) کی تصنیف

۱۳۲۶ھ : دارالعلوم منظر اسلام میں درس وافتا کا آغاز
۱۳۲۶ھ : بسط الراحۃ فی الحظر والاباحۃ (فقہ واصول) کی تصنیف
۱۳۲۶ھ : الفیض الرضوی فی تکمیل الحموی (فقہ واصول) کی تصنیف
۱۳۲۶ھ : شکست سفاہت (مناظرہ) کی تصنیف
۱۳۲۷ھ : المجمل المعدد لتالیف المجدد (تاریخ) کی تصنیف
۱۳۲۷ھ : ظفر الدین الطیب (مناظرہ) کی تصنیف
۱۳۲۸ھ : نجم الکنزہ علی الکلاب الممطرہ (مناظرہ) کی تصنیف
۱۳۲۹ھ : سال کے آغاز میں معززین شملہ کی پُر اصرار طلب پر شملہ تشریف لے گئے
۱۳۲۹ھ : النبراس لدفع ظلام المنہاس (مناظرہ) کی تصنیف
۱۳۳۰ھ : اعلیٰ حضرت قدس سرہ کی ایما پر مدرسہ حنفیہ ضلع آرہ (بہار) تشریف لے گئے
۱۳۳۰ھ : الجواہر والیواقیت فی علم التوقیت (توقیت وہیئت) کی تصنیف
۱۳۳۰ھ : التحقیق المبین لکلمات التوبین، کی تصنیف
۱۳۳۰ھ : اطیب الاکسیر فی علم التکسیر، کی تصنیف
۱۳۳۰ھ : سال کے اخیر میں سشن جج مسٹر سید نورالہدیٰ کے قائم کردہ مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ، پٹنہ میں صدر مدرس کی حیثیت سے تشریف لے گئے
۱۳۳۱ھ : التعلیق علی شروح المغنی (نحو) کی تصنیف
۱۳۳۲ھ : عقد مسنون ہمراہ رابعہ خاتون بنت منشی محمد واعظ الحق استھانوی (پٹنہ)
۳۳۲ھ : رفع الخلاف من بین الاحناف (فقہ) کی تصنیف،
۱۳۳۲ھ : صاحبزادی زرینہ خاتون کی ولادت
۱۳۳۳ھ : خیر السلوک فی نسب الملوک (تاریخ وانساب) کی تصنیف
۱۳۳۳ھ : نزول السکینۃ باسانید الاجازات المتینۃ (حدیث) کی تصنیف
۱۳۳۳ھ : القول الاظہر فی الاذان بین یدی المنبر (فقہ) کی تصنیف
۱۳۳۳ھ : جواہر البیان فی ترجمۃ خیرات الحسان (مناقب) کی تصنیف
۱۳۳۳ھ : صاحبزادی ولیہ خاتون کی ولادت
۱۳۳۴ھ : سال کے اخیر میں خانقاہ کبیریہ شہسرام کے سجادہ نشین شاہ ملیح الدین صاحب کی فرمائش پر صدر مدرس کی

حیثیت سے شہر رام تشریف لے گئے۔

۱۳۳۴ھ : کشف الستور عن مناظرۃ رامپور، کی تصنیف

۱۳۳۴ھ : گنجینۂ مناظرہ (کلکتہ کے مناظرے کی روداد) کی تصنیف

۱۳۳۵ھ : آغاز سال میں ایک صاحبزادے تولد ہوئے لیکن عالم شیر خوارگی میں انتقال ہوگیا

۱۳۳۵ھ : تقریب (منطق) کی تصنیف

۱۳۳۵ھ : تذہیب (فلسفہ) کی تصنیف

۳۳۵ھ : وافیہ (نحو) کی تصنیف

۱۳۳۵ھ : بدر السلام لمیقات کل الصلوٰۃ والصیام (توقیت) کی تصنیف

۱۳۳۵ھ : مؤذن الاوقات (دس شہروں کے اوقات صوم وصلوٰۃ کی تخریج)

۱۳۳۵ھ : عافیہ (صرف) کی تصنیف

۱۳۳۶ھ : تحفۃ الاحباب فی فتح الکوۃ والباب (کھڑکی کا فیصلہ) (فقہ) کی تصنیف

۱۳۳۶ھ : صاحب زادہ مختار الدین احمد کی ولادت

۱۳۳۷ھ : نظم المبانی فی حروف المعانی (نحو) کی تصنیف

۱۳۳۷ھ : تحفۃ الاحبار فی اخبار الاخیار (مناقب) کی تصنیف

۱۳۳۷ھ : الاکسیر فی علم التکسیر، کی تصنیف

۱۳۳۷ھ : صحیح البہاری کی تصنیف کا آغاز

۱۳۳۸ھ : سرور القلب المحزون فی الصبر عن نور العیون (اخلاق) کی تصنیف

۱۳۳۸ھ : ندوۃ العلما (مناظرہ) کی تصنیف

۱۳۳۸ھ : صاحبزادی ریحانہ خاتون کی ولادت [ربیعہ خاتون]

۱۳۳۸ھ : جب مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ، حکومت بہار کے زیر انتظام آگیا تو ذمہ داروں کی طلب پر آپ پھر سینئر مدرس کی حیثیت سے پٹنہ تشریف لے گئے

۱۳۳۹ھ : ہادی الہداۃ لترک الموالاۃ (سیاست) کی تصنیف

۱۳۴۰ھ : توضیح الافلاک معروف بہ سلم السماء (ہیئت) کی تصنیف

۱۳۴۱ھ : اعلام الاعلام باحوال العرب قبل الاسلام (تاریخ) کی تصنیف

۱۳۴۲ھ : صاحبزادی صفیہ خاتون کی ولادت

۱۳۴۳ھ : نہایۃ المنتھی فی شرح ہدایۃ المبتدی (فقہ) کی تصنیف

۱۳۴۴ھ : الافادات الرضویہ (اصول حدیث) کی تصنیف

۱۳۴۴ھ : صاحبزادی شمیمہ خاتون کی ولادت

۱۳۴۵ھ : جامع الرضوی المعروف بہ صحیح البہاری جلد اول (کتاب العقائد) کی تصنیف

۱۳۴۶ھ : صاحبزادی نعیمہ خاتون کی ولادت

۱۳۴۷ھ : دلچسپ مکالمہ (نصائح) کی تصنیف

۱۳۴۷ھ : جامع الرضوی (جلد دوم) کے چاروں حصوں کی تکمیل ہوئی

۱۳۴۸ھ : تسہیل الوصول الی علم الاصول (فقہ واصول) کی تصنیف

۱۳۴۹ھ : نافع البشر فی فتاویٰ ظفر (فقہ)

۱۳۵۳ھ : تنویر السراج فی ذکر المعراج (سیرت) کی تصنیف

۱۳۵۴ھ : نصرۃ الاصحاب باقسام ایصال الثواب (فقہ) کی تصنیف

۱۳۵۷ھ : الانوار اللامعہ من الشمس البازغہ (فلسفہ) کی تصنیف

۱۳۵۷ھ : الفوائد التامہ فی اجوبۃ الامور العامہ (عقائد وکلام) کی تصنیف

۱۳۵۷ھ : جامع الاقوال فی رویۃ الہلال (فقہ) کی تصنیف

۱۳۵۸ھ : مشرق اور سمت قبلہ (ہیئت) کی تصنیف

۱۳۶۰ھ : مولود رضوی (سیرت) کی تصنیف

۱۳۶۵ھ : تحفۃ العظما فی فضل العلما (فضائل) کی تصنیف

۱۳۶۶ھ : سد الفرار المہاجری بہار (نصائح/سیاست) کی تصنیف

۱۳۶۷ھ : چودہویں صدی کے مجدد (مناقب) کی تصنیف

۱۳۶۹ھ : حیات اعلیٰ حضرت، چار جلد (مناقب) کی تصنیف

۱۹۴۸ء : مدرسہ شمس الہدیٰ کے پرنسپل ہوئے

۱۹۵۰ء : مدرسہ شمس الہدیٰ سے ریٹائرمنٹ لیا۔ اس کے بعد ظفر منزل، پٹنہ میں مخصوص افراد کو درس دیتے اور تصنیف وتالیف میں مصروف رہتے

۱۳۷۰ھ : عید کا چاند (فقہ) کی تصنیف

۱۳۷۱ھ : تنویر المصباح للقیام عند حی علی الفلاح (فقہ) کی تصنیف

۱۳۷۱ھ : شاہ شاہد حسین درگاہی میاں سجادہ نشین بارگاہ عشق میتن گھاٹ، پٹنہ کی استدعا پر پورنیہ (بہار) تشریف لے گئے جہاں جامعہ لطیفیہ بحر العلوم کا افتتاح فرمایا

۱۳۸۰ھ : کٹیہار سے ظفر منزل تشریف لائے

۱۳۸۲ھ : وصال سے پہلے ''النور والضیا فی سلاسل الاولیا'' تصنیف فرمایا

۱۳۸۲ھ : ۱۹ر جمادی الآخرہ ۱۳۸۲ھ / ۱۸ر نومبر ۱۹۶۲ء کو ذکر بالجہر کرتے ہوئے رب کریم کے حضور حاضر ہو گئے اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے اور متعلقین ومعتقدین کو ان کے فیوض وبرکات سے بہرہ مند فرمائے۔ آمین!

☆☆☆☆☆

پیش لفظ

مولانا مفتی محمد عبد الرحیم نشترؔ فاروقی
مرکزی دار الافتا، ۸۲؍ سوداگران، بریلی شریف

اعلیٰ حضرت کے تلامذہ میں ملک العلما حضرت علامہ مفتی محمد ظفر الدین قادری رضوی علیہ الرحمہ کی شخصیت بے مثل، ممتاز اور منفرد نظر آتی ہے خصوصاً فنون نادرہ ہیأت و توقیت، ہندسہ وریاضی، جبر و تکسیر، اوفاق و اعداد میں آپ کی شخصیت یکتائے روزگار تھی۔ کہتے ہیں کہ آپ سولہ خانوں کے نقوش گیارہ سو طریقوں سے بھر لیتے تھے جبکہ اعلیٰ حضرت قدس سرہ کو سولہ سو طریقوں سے یہ نقوش بھرنے کی مہارت حاصل تھی۔

یوں تو آپ کی شخصیت ایک ہیأت داں اور محدث کی حیثیت سے زیادہ معروف ہے لیکن جب آپ کے فتاویٰ پر نظر جاتی ہے تو آپ فقہ واصول میں بھی بے مثل و بے نظیر نظر آتے ہیں بلکہ فقہیات کے میدان میں بھی آپ پورے طور سے امام احمد رضا خان قادری برکاتی بریلوی قدس سرہ کی نیابت فرماتے دکھائی دیتے ہیں۔

چنانچہ حضرت مولانا مفتی محمد ارشاد احمد رضوی ساحل شہسرامی لکھتے ہیں:

’’مقامات دین کے فہم اور اصول دین کی بصیرت کو تفقہ کہتے ہیں۔ یہ ملک العلما کے مربی اور مرشد اعلیٰ حضرت امام احمد رضا کا خاص رنگ تھا جو اُن کے پورے علمی وجود پر چھایا ہوا تھا۔ ملک العلما نے بھی اسی بارگاہ فیض سے حصہ لیا ہے، اس لیے آپ کے یہاں بھی گہری فقاہت ملتی ہے، گو آپ کو شہرت ایک محدث، ایک مصنف، ایک مناظر، ہیأت و توقیت کے ماہر اور جفاکش مدرس کی حیثیت سے ملی لیکن ان سب کے ساتھ ساتھ آپ کے یہاں فقاہت کا جوہر بھی اپنی تمام تر جلوہ سامانیوں کے ساتھ موجود ہے۔‘‘ [فتاویٰ ملک العلما ص ۳۹]

حضرت ملک العلما کی فقہی نگارشات کا مطالعہ کرنے کے بعد بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ آپ آداب افتا اور جزئیات فقہیہ پر گہری نظر رکھنے والے ایک ممتاز فقیہ اور مفتی ہیں۔ آپ نے تقریباً ۵۴؍ سال فتویٰ نویسی فرمائی اور فقہی موضوعات پر کثیر رسالے تحریر فرمائے۔ چنانچہ خود فاضل مرتب نے اپنی تقدیم میں حضرت کے ۱۵؍ فقہی رسائل کا تذکرہ کیا ہے۔

فتاویٰ ملک العلما کے فاضل مرتب علامہ ساحل شہسرامی زید مجدہٗ نے ملک العلما کے فقہی شہ پارے کی ترتیب کا تذکرہ ۲۰۰۳ء کے وسط میں مجھ ناچیز سے کیا تھا۔ پھر جب موصوف اپنا مرتب کردہ یہ قیمتی مجموعۂ فتاویٰ لے کر بریلی شریف آئے تو میں اس گراں قدر مجموعے کو دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ ساحل صاحب نے نہ صرف یہ کہ حضرت ملک العلما کے بہت ہی ژولیدہ خط فقہی شہ پاروں کی نہایت سلیقے سے شیرازہ بندی کی ہے بلکہ اپنی تقدیم میں وہ جواہر پارے بکھیرے ہیں جن کی قدر و قیمت کو اہل نظر بخوبی محسوس کرسکتے ہیں۔ انھوں نے تقریباً ایک ماہ کے عرصے میں تیار کی گئی اس تقدیم میں حضرت ملک العلما کی

حیات طیبہ، ان کے علم وفضل کا تعارف، مختلف علوم میں عبقریت، ادبی سلاست اور فقہی مہارت کے گلشن ہزار رنگ کی ایسی سیر کرائی ہے کہ دل باغ باغ ہو جاتا ہے۔ خصوصاً فقہ وافتا کی تشریح، ان کی عہد بہ عہد تاریخ، مستند حنفی فقہا اور کتابوں کی تفصیل، فتویٰ نگاری کی تاریخ اور اس منصب عظیم کے تقاضے پر جیسی گفتگو کی ہے وہ مختصر ہونے کے باوجود بہت جامعیت رکھتی ہے۔

علامہ ساحل منصب افتا کے تقاضے کا تذکرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''کسی مفتی اور فقیہ کے اندر ایک عامی سے بالاتر ذاتی اور علمی دونوں سطح پر کچھ امتیازی خصوصیتیں ہونی چاہئیں۔ ذاتی سطح پر وہ ربط خالق، ربط خلق اور ربط نفس تینوں کے تقاضے پورا کرتا ہو۔ وہ ایک خدا ترس، اطاعت شعار بندہ، رسول رحمت کا جاں نثار امتی، دیانت دار، صداقت شعار، روادار، پیکر اخلاص، دردمند طبیعت رکھنے والا فرد امت ہو، حق پسند، حق گو، ہر قسم کی عصبیت سے بالاتر، حلیم اور بردبار، قول کا دھنی، عمل کی دولت سے مالا مال، دینی تصلب سے آراستہ، شرافت وتہذیب کا پیکر اور شائستگی سے بھرپور ایک اچھا انسان ہو۔ جو فقیہ ان اوصاف سے آراستہ ہوگا وہی علم اور دین کے تقاضے پورا کر سکے گا۔''

[فتاویٰ ملک العلما، ص ۳۰]

فقیہ کے ذاتی اوصاف کے اس جامع تعارف کے بعد علمی سطح کی خصوصیتوں کا تذکرہ دس نکات کی صورت میں پیش کیا ہے جو بزرگوں کی مختلف کتابوں میں پھیلے ہوئے سیکڑوں صفحات کا خلاصہ ہے۔ یہ نکات ہر مبتدی شائق فقہ کے لیے راہنما اصول کی حیثیت رکھتے ہیں۔ خاص بات یہ ہے کہ تقدیم نگار نے اس جامع تلخیص کے سلسلے میں خاص فیض اعلیٰ حضرت قدس سرہ کی بارگاہ سے اٹھایا ہے۔ اس کے بعد انھیں اصول کی روشنی میں حضرت ملک العلما کی فقہی بصیرت پر بھرپور گفتگو ملتی ہے۔ وسعت نگاہ، آداب افتا کی رعایت، تفقہ، تصوف، تنقید کے ذیلی عنوانات سے ملک العلما کی فقاہت ایسی آشکار کی ہے کہ ہر قاری ملک العلما کی فقاہت کا اعتراف کرتا نظر آئے گا۔

اس کتاب کی گراں قدری اور مرتب کی پرخلوص محنت کا اثر ہے کہ سیدی وسندی واستاذی حضور تاج الشریعہ علامہ مفتی محمد اختر رضا قادری ازہری بریلوی دامت برکاتہم القدسیہ نے بطیب خاطر اس کی اشاعت کی اجازت مرحمت فرمائی اور المجمع الرضوی کے بانی شہزادۂ حضور تاج الشریعہ حضرت مولانا محمد عسجد رضا خان قادری بریلوی مدظلہ العالی اور ادارے کے نگراں حضرت مولانا مفتی محمد شعیب رضا نعیمی نے اس کی اشاعت کی ذمہ داری قبول فرمائی۔ اس سلسلے میں محب گرامی حضرت مولانا مفتی محمد یونس رضا اویسی اور حضرت مولانا مفتی محمد حامد رضا قادری صاحبان کا تعاون بھی شامل رہا۔

اراکین ادارہ اس گراں قدر اشاعت پر مسرت کا اظہار کرتے ہوئے توقع رکھتے ہیں کہ حضرت ملک العلما کے اس فن پارے کی اہل سنت بالخصوص صاحبان افتا کے حلقے میں خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔ اللہ تعالیٰ حضرت مصنف، مرتب اور ادارے کے اراکین وجملہ معاونین کو دارین میں جزائے خیر عطا فرمائے اور مسلک اعلیٰ حضرت کی خدمت کرتے رہنے کی توفیق رفیق عطا فرمائے۔ آمین بجاہ سید المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ اجمعین۔

احقر محمد عبد الرحیم نشتر فاروقی

ساحل شہسرامی - ایک تعارف

☆ قلمی نام : ساحل شہسرامی (علیگ)

☆ نام : ارشاد احمد رضوی

☆ ولدیت : جُناب اشفاق احمد برکاتی ولد وصی احمد حبیبی

☆ تاریخ پیدائش : ۱۹ر ستمبر ۱۹۷۳ء

☆ مستقل پتہ : کاشانۂ برکات رضا۔ وصی منزل محلہ مدار دروازہ، شہسرام 821115

☆ موجودہ پتہ : پروفیسر سید محمد امین قادری، ماشاء اللہ ہاؤس، کبیر کالونی، جمال پور، علی گڑھ

☆ تعلیمی نسبتیں : ضیائی، مصباحی، علیگ

☆ تعلیمی اسناد : عالمیت، فضیلت، تخصص فی الفقہ الحنفی (جامعہ اشرفیہ، مبارک پور) ایم اے، عربی (علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ) الہ آباد عربی فارسی بورڈ، بہار مدرسہ بورڈ اور جامعہ اردو کی جملہ اسناد

☆ مقالات : دینی، علمی اور ادبی موضوعات پر چالیس سے زائد مقالات

☆ فتاویٰ : تقریباً ایک ہزار فتاویٰ جو فقیہ اعظم ہند علامہ مفتی محمد شریف الحق امجدی علیہ الرحمہ کی تصدیقات سے مزین ہیں۔

☆ تصانیف وتراجم:

تصانیف:

(۱) خاندانِ برکات کی علمی اور ادبی خدمات — مطبوعہ

(۲) تبرکات خاندان برکات — مطبوعہ

(۳) تصانیف خاندان برکات — مطبوعہ

(۴) شاہ حقانی کا اردو ترجمہ وتفسیر قرآن - ایک تنقیدی وتحقیقی جائزہ — مطبوعہ

یہ کتاب امین ملت پروفیسر سید محمد امین قادری برکاتی دامت برکاتہم القدسیہ کی سرپرستی اور شراکت میں تصنیف ہوئی۔

(۵) مولانا سید شاہ غیاث الدین حسن شریفی - حیات اور شاعری — مطبوعہ

(۶) تاریخ ولادت نبوی — غیر مطبوعہ

(۷) حضرات محدثین کے اخلاق کریمانہ — غیر مطبوعہ

(۸) خواجۂ ہند کی صوفیانہ شاعری — غیر مطبوعہ

(۹) مخدوم سمنانی کے علمی آثار — غیر مطبوعہ

(۱۰) قطب الاقطاب دیوان محمد رشید مصطفیٰ عثمانی - حیات وافکار — غیر مطبوعہ

(۱۱) امام احمد رضا اور شہر ام — غیر مطبوعہ

(۱۲) مفتی اعظم — غیر مطبوعہ

(۱۳) صدر الشریعہ — غیر مطبوعہ

(۱۴) ملک العلما — غیر مطبوعہ

(۱۵) شدھی تحریک اور حضرت صدر الافاضل — غیر مطبوعہ

(۱۶) حافظ ملت — غیر مطبوعہ

(۱۷) شارح بخاری — غیر مطبوعہ

(۱۸) حضرت صادق شہر امی - حیات اور شاعری — زیر طبع

(۱۹) حکیم الاسلام مفتی مظفر احمد قادری برکاتی - حیات وخدمات — زیر طبع

تراجم:

(۱) کاشف الاستار شریف - اسد العارفین سید شاہ محمد حمزہ عینی مارہروی — زیر طبع

(۲) النور والبہا لاسانید الحدیث وسلاسل الاولیا - سراج العارفین سید شاہ ابوالحسین احمد نوری — زیر طبع

(۳) وجود العاشقین - خواجہ سید محمد بندہ گیسو دراز — غیر مطبوعہ

(۴) ایم اے عربی (اے ایم یو) کی نصابی نظموں کا ترجمہ — زیر طبع

مرتبات:

(۱) مقالات شارح بخاری (تقریباً چودہ سو صفحات) — زیر طبع

(۲) اسلامی نظریۂ موت - ملک العلما علامہ ظفر الدین رضوی — مطبوعہ

(۳) فتاویٰ ملک العلما — مطبوعہ

☆☆☆☆☆

فہرستِ مضامین

فتاویٰ ملک العلما

کتاب الطہارۃ - ۱

کتاب الصلوٰۃ - ۲

کتاب الزکوٰۃ ۳

کتاب الصوم ۴

کتاب النکاح ۵

کتاب الطلاق ۶

کتاب السیر ۷

کتاب الوقف ۸

کتاب القضا ۹

کتاب الاضحیة ۱۰

کتاب الحظر والاباحۃ ۱۱

کتاب الفرائض ۱۲

ضمیمہ

کتابیات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نافع البشر فی فتاویٰ ظفر

[۱۳۴۹ھ]

فتاویٰ ملک العلما

ملک العلما شاہ محمد ظفر الدین قادری رضوی قدس سرہٗ

کتاب الطہارۃ ۱

مسئلہ مرسلہ حافظ عبدالکریم صاحب از اعظم گڑھ ۱۵ محرم الحرام ۱۳۲۳ھ
روئی کا کپڑا نجاست سے ناپاک ہوجائے تو کس طرح پاک ہوسکتا ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب

اللھم ارنا الحق حقا والباطل باطلا۔ جس طرح بے روئی کا نجس کپڑا نجاست سے پاک کیا جاتا ہے ویسے ہی روئی کا کپڑا بھی نجاست سے پاک کیا جاتا ہے۔ یعنی اگر لائق نچوڑنے کے ہو تو تین مرتبہ دھوئے اور ہر بار اتنا نچوڑنے سے کہ قطرہ نہ ٹپکے، پاک ہوجائے گا اگر نجاست مرئیہ نہ ہو۔

شرح وقایہ میں ہے: "وعما لم یر اثرہ بغسلہ ثلثا وعصرہ فی کل مرۃ۔"

عالمگیریہ میں ہے: "وان کانت غیر مرئیۃ یغسلھا ثلث مرات کذا فی المحیط۔" اور اگر نجاست مرئیہ ہو تو زوال عین سے پاک ہوجائے گا۔

وقایہ میں ہے: "عن نجس مرئی بزوال عینہ ھکذا فی الغلمگیریۃ۔"

اور اگر نچوڑنے کے لائق نہ ہو تو ہر بار خشک ہوجانے کے بعد دوبارہ دھوئیں۔

ہندیہ میں ہے: "وما لا ینعصر یطھر بالغسل ثلث مرات والتجفیف فی کل مرۃ لان للتجفیف اثرا فی استخراج النجاسۃ وحد التجفیف ان یخلیہ حتی بنقطع التقاطر ولا یشترط فیہ الیبس ھکذا فی التبیین" ۱۲ مختصرا۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

☆☆☆☆☆

ایک صاحب کتے کو نجس العین بتاتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ در مختار میں حضرت امام اعظم نے کتیا کے پلے کو بغل میں دبا کر نماز پڑھنا جائز لکھا ہے؟

الـــجـــواب

یہ اس شخص کا افترا محض ہے۔ نہ در مختار امام اعظم کی تصنیف ہے، نہ اس قائل کو جواز فعل وصحت عمل مع عدم جواز الفعل میں تمیز ہے۔ جواز بمعنی صحت وبمعنی اباحت میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اول ہرگز مستلزم ثانی نہیں۔ بہت افعال کہ مکروہ تنزیہی بلکہ تحریمی بلکہ حرام ہیں، منافی صحت نماز نہیں ہوتے۔ تو نماز ان افعال کے ساتھ جائز ہوگی یعنی صحیح ومسقط فرض۔ مگر وہ فعل جائز مباح نہ ہوگا بلکہ حرام یا گناہ یا ناپسند۔ ہمارے علماء کہ محل کلب وغیرہ سباع سوائے خنزیر کے ساتھ نماز جائز جانتے ہیں جواز بمعنی صحت میں کلام فرمارہے ہیں۔ معاذ اللہ یہ نہیں فرماتے کہ بے ضرورت شرعیہ ایسا فعل مکروہ وناپسند نہیں۔ غیر مقلدین وہابیہ کا اس مسئلہ کو مطاعن ائمہ عظام حنفیہ کرام خصھم اللہ باللطف العام میں شمار کرنا محض سفاہت وبے عقلی ہے۔ حضرات صاحبین اور ان کے موافقین رحمھم اللہ تعالیٰ کے نزدیک تو کتا نجس العین ہے۔ اور طاہر ماننے والوں سے بھی ایک جماعت عظیم مطلقاً ان صورتوں میں نماز فاسد بتاتے ہیں۔ رہے قائلین طہارت، وہ بھی اسائت وکراہت کی تصریح کرتے ہیں۔ ان کا مطلب صرف اس قدر ہے کہ اگر کسی شخص نے کسی ضرورت وحاجت خواہ اپنی نادانی وجہالت سے ایسا کیا تو نماز باطل نہ ہوگی۔ اس میں معاذ اللہ کیا طعن ہے؟ ہاں اگر فرماتے کہ ایسا کرنا چاہئے یا کرے تو کوئی ناپسندیدہ نہیں تو ایک بات تھی۔ مگر جانتا ہوں وہ اس تہمت سے پاک ومنزہ ہیں وللہ الحمد۔

بالجملہ ہمارے امام اعظم رضی اللہ عنہ کے مذہب میں یہ جانور، سائر سباع کے مانند ہے کہ لعاب نجس اور عین طاہر۔ یہی مذہب صحیح ومعتمد ومؤید بدلائل قرآن وحدیث ومختار وماخوذ للفتوی عند جمہور مشائخ القدیم والحدیث ہے۔

امام ابوالبرکات محمود نسفی کافی میں فرماتے ہیں: الکلب لیس بنجس العین۔

حلیہ میں ہے: "کون الکلب لیس بنجس العین وھو المرجح فی المختصر والھدایۃ والوقایۃ والنقایۃ والمختار والکنز والوافی والاصلاح ونور الایضاح والملتقیٰ والتنویر۔ کل اھاب دبغ فقد طھر الا جلد الخنزیر والادمی فمقتضیٰ ھذہ الکلیۃ طھارۃ جلد الکلب بالدباغ۔ ھکذا فی مجمع الانھر ومتنہ ملتقیٰ الابحر وجامع الرموز ومراقی الفلاح والتیسیر والبزازیۃ والدر المختار وغیر ذلک من معتمدات الاسفار۔" واللہ تعالیٰ اعلم

☆☆☆☆☆

مسئلہ از میرٹھ مقام اکلہ رسول پور مرسلہ حافظ عبدالحکیم صاحب ۱۲ ربیع الآخر ۱۳۲۳ھ

کیا ارشاد ہے علما کا اس مسئلہ میں کہ غیر مقلدین جو بعد پیشاب، مدام پانی سے استنجا پاک کیا کرتے ہیں اور ڈھیلے سے بدعت بتاتے ہیں، یہ قول وفعل ان کا کیسا ہے؟ بینوا وتوجروا۔

الـــجـــواب

صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین کی عادت مختلف تھی۔ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے دونوں ثابت ہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں:

''مرن ازواجکن ان یستطیبوا بالماء فانی استحییھم فان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان یفعلہ۔''

تم اپنے شوہروں سے کہو کہ پانی سے استنجا کیا کریں پس میں ان سے کہنے سے شرماتی ہوں۔ پس تحقیق کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پیشاب کے بعد استنجا پانی سے فرمایا کرتے۔ رواہ احمد والترمذی والنسائی۔

ابوداؤد، ابن ماجہ میں انہیں سے مروی: ''قالت بال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقام عمر خلفہ بکوز من ماء فقال ما ھذا یا عمر؟ فقال ماء تتوضؤ بہ قال ما امرت کلما بلت ان اتوضأ ولو فعلت لکان سنۃ۔''

ایک بار حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے پیشاب فرمایا حضرت عمر رضی اللہ عنہ پانی لے کر کھڑے ہوئے۔ فرمایا: اے عمر کیا ہے؟ عرض کیا کہ استنجاء کے لئے پانی ہے۔ فرمایا مجھ پر واجب نہیں کیا گیا ہے کہ طہارت کروں ہر پیشاب کے بعد پانی سے اور اگر ایسا کروں تو بلاشبہ سنت ہو جاوے۔ المراد بالوضوء ھھنا الاستنجاء بالماء کما ذکرہ النووی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ ڈھیلے سے استنجاء کرتے اور حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ پانی سے استنجا فرماتے۔ محض پانی سے استنجا کرنے میں حرج نہیں البتہ ڈھیلے سے استنجا کرنے کو بدعت بتانا غلط ہے اور سفاہت ہے اور افضل یہ ہے کہ دونوں کو جمع کرے۔ ہندیہ میں ہے: ''الافضل ان یجمع بینھما''۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

☆☆☆☆☆

مسئلہ ثانیہ از میرٹھ مرسلہ جناب مذکور الصدر صاحب

غیر مقلدین وضو میں بلا عذر اگر مسح سر کیا کرتے ہیں عمامہ پر اور کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بارہ میں ثابت ہے۔ کیا رسول خدا نے گاہے کسی عذر سے ایک دو بار یا بلا عذر، اکثر فعل ہذا بنوع مسطورہ ادا کیا ہے؟ اور یہ حدیث کس پائے میں ہے؟ اور نیز مذکور ہذا حدیث کس کتاب میں ہے اور حنفی کرام کو اس پر عمل کرنا کیسا ہے؟

الـــجـــواب

غیر مقلدین کا محض عمامہ پر مسح کرنا محض جہالت ہے۔ ہرگز ہرگز مسح کرنا جائز نہیں۔ اگر کرے گا وضو نہ ہوگا۔ نماز مشروط بشرط وضو ہے۔ جب وضو ہی نہیں ہوا، نماز بھی نہیں ہوگی۔

خلاصہ پھر فتاوی عالمگیریہ میں ہے: ''ولا یجوز المسح علی القلنسوۃ والعمامۃ و کذا لو مسحت

المرأة على الخمار الا انه اذا كان الماء متقاطرا بحيث يصل الماء الىٰ الشعر فحٍ يجوز ذلك عن الشعر۔"

خزانۃ المفتیین میں ہے:" والمرأة اذا مسحت علىٰ احمارها لا يجوز الا اذا كان دقيقا ينفذ الماء فيه فبلغ ربع راسه كذا فى السراجية والغنية والخانية۔"

اقول اور پر ظاہر کہ آدمی کس طرح عمامہ پر مسح کرے؟ سر میں تری تک محسوس نہیں ہوسکتی فضلا ان يبلغ ربع راسه۔

رہی حدیث، جو مروی ہے حضرت عمرو بن امیہ ضمری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے:" قال رأيت رسول الله صلى الله عليه وسلم يمسح علىٰ عمامته وخفيه۔"سواس کے یہ معنی ہیں کہ سر پر تحت عمامہ کے مسح فرما کر عمامہ پر ہاتھ گذرانا۔

قسطلانی میں ہے:" يمسح علىٰ عمامة بعد مسح الناصية ويدل عليه حديث ابى داؤد عن انس رضى الله عنه قال رأيت رسول الله صلى الله عليه وسلم يتوضأ وعليه عمامة قطرية فادخل يده من تحت العمامة فمسح مقدم راسه۔"

علاوہ بریں اولاً حدیثِ مسح عمامہ کی محتمل اور نہیں چھوڑا جاتا متیقن بوجہ محتمل کے۔

ثانیاً اللہ تعالیٰ نے حکم مسح سر کا دیا ہے نہ مسح عمامہ کا۔ اور حدیث مسح عمامہ کی آحاد ہے۔ جس سے زیادتی کتاب پر جائز نہیں اور نہ وہ اس کا ناسخ ہوسکے۔ كما هو مبرهن فى فن الاصول اور یہی مذہب ائمہ وعلماء کا ہے اور یہی قول سفیان ثوری و مالک بن انس و ابن مبارک و امام شافعی و حضرت امام الائمہ، سراج الامۃ ابوحنیفہ رضی اللہ عنہم کا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

☆☆☆☆☆
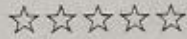
کتاب الصلوٰۃ ۲

تنویر المصباح للقیام عندحی الفلاح

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ جماعت کی نماز میں امام اور مقتدیوں کو کس وقت کھڑا ہونا چاہئے؟ مذہب احناف کیا ہے۔ مدلل ارشاد ہو۔

(محمد سلیمان قادری)

الجواب

اس مسئلہ کی متعدد صورتیں ہیں اور سب کا حکم جدا ہے۔ اس لئے بالتفصیل جواب دینا مناسب ہے۔ فاقول وباللہ التوفیق۔

شکل اول: امام اور مکبر دونوں ایک ہی شخص ہے اور امام نے مسجد میں آکر تکبیر شروع کی تو جب تک تکبیر پوری ختم نہ ہو جائے مقتدی سب کے سب بیٹھے رہیں، کوئی کھڑا نہ ہو۔

(۱) درمختار میں ہے: "اذااقام الامام بنفسه فی مسجد فلا یقفو احتی یتم اقامته ظهیریة"۔ ''فتاوی ظہیریہ میں ہے کہ امام جب بذات خاص مسجد میں اقامت کہے تو مقتدی نہ کھڑے ہوں یہاں تک کہ اقامت ختم کرلے''۔

(۲) فتاوی عالمگیریہ میں ہے: "وان کان المؤذن والامام واحدا فان اقام فی المسجد فالقوم لایقومون مالم یفرغ من الاقامة"۔ "اگر امام اور موذن ایک ہی شخص ہو تو اگر اقامت مسجد میں شروع کی تو مقتدی نہ کھڑے ہوں جب تک امام اقامت سے فارغ نہ ہو جائے''۔

(۳) فتح اللہ المعین حاشیہ کنز ملامسکین میں ہے: "هذا اذا کان المؤذن غیر الامام وان اتحدوا اقام فی المسجد اجمعوا ان القوم لایقومون مالم یفرغ من الاقامة"۔ '' (حی علی الفلاح) پر کھڑا ہونا اس وقت

ہے جب امام اور موذن دو شخص ہوں اور اگر امام اور موذن ایک ہی شخص ہو تو اجماع ہے کہ مقتدی نہ کھڑے ہوں جب تک امام تکبیر سے فارغ نہ ہو جائے۔

اس تصریح سے ان لوگوں کی بھی غلطی ظاہر ہوگئی جو کہتے ہیں کہ ہم امام و مکبر کی اتباع میں کھڑے ہوتے ہیں کہ تکبیر کہنے والا امام اور مکبر تو کھڑا ہو اور ہم بیٹھے رہیں، یہ خلاف تعظیم مکبر ہے اس لئے ہم مکبر کی تعظیم کو کھڑے ہوتے ہیں۔ یہ جدت اور اجتہاد محض تصریحات فقہائے کرام کے بالکل خلاف ہے۔

(۴) جامع الرموز میں ہے،"لو کان الامام موذناً لم یقم القوم الا عند الفراغ وھذا اذا اقام فی المسجد"۔"اگر امام خود مکبر ہو تو جب مسجد میں آکر تکبیر کہنی شروع کرے تو قوم اس وقت تک کھڑی نہ ہو جب تک امام تکبیر سے فارغ نہ ہو جائے۔

(۵) بحر الرائق شرح کنز الدقائق میں ہے:"ھذا کلہ اذا کان الموذن غیر الامام فان کان واحد او اقام فی المسجد فالقوم لایقومون حتیٰ یفرغ من الاقامۃ"۔"یہ (حی علی الفلاح پر کھڑا ہونا) اس وقت ہے جب موذن امام کے سوا دوسرا شخص ہو اور اگر امام اور موذن ایک ہی شخص ہو اور اقامت مسجد میں کہہ رہا ہے تو جب تک امام تکبیر سے فارغ نہ ہو جائے، مقتدی کھڑے نہ ہوں"۔

(۶) ملتقی الابحر اور اس کی شرح (۸) مجمع الانہر میں ہے:"وفی القھستانی نقلا عن المحیط۔"لو کان الا مام موذناً لم یقم القوم الا عند الفراغ"۔"اگر امام ہی مکبر ہو تو جب تک تکبیر ختم نہ ہو جائے مقتدی کھڑے نہ ہوں"۔ واللہ اعلم۔

شکل دوم: امام اور مکبر ایک ہی شخص ہے اور امام نے مسجد میں پہنچنے سے قبل ہی تکبیر شروع کر دی تو تمام مشائخ حنفیہ کا اتفاق ہے کہ مقتدی سب کے سب بیٹھے رہیں، کوئی کھڑا نہ ہو، جب تک امام مسجد میں داخل نہ ہو۔

(۱) جامع الرموز میں ہے:"والا فقد قاموا اذا دخلہ کما فی المحیط"۔

"اور اگر امام نے اقامت مسجد میں آکر نہیں شروع کی بلکہ مسجد میں داخل ہونے سے قبل ہی شروع کر دی تھی تو جب تک امام مسجد میں داخل نہ ہو کوئی بھی کھڑا نہ ہو۔ جب امام مسجد میں داخل ہو جائے تو لوگ کھڑے ہوں اور ایسا ہی محیط میں ہے"۔

(۳) فتح اللہ المعین میں ہے: ’’وان خارجہ قام کل صف ینتھی الیہ الامام‘‘۔ ’’اگر امام اور موذن دونوں ایک ہی شخص ہو اور امام نے مسجد سے باہر ہی تکبیر شروع کر دی تو جس جس صف کے سامنے امام گزرتا جائے وہ لوگ کھڑے ہو جائیں‘‘۔

(۴) فتاوی عالمگیریہ میں ہے: ’’و ان اقام خارج المسجد فمشائخنا اتفقوا علیٰ انھم لا یقومون مالم ید خل الامام فی المسجد‘‘۔ ’’اگر امام وموذن دونوں ایک ہی شخص ہو اور امام نے مسجد سے باہر ہی تکبیر کہنی شروع کر دی تو مقتدی اس وقت تک کھڑے نہ ہوں جب تک امام مسجد میں داخل نہ ہو‘‘۔

(۵) درمختار میں ہے: ’’وان خارجہ قام کل صف ینتھی الیہ، بحر‘‘۔ ’’اگر امام نے تکبیر خارج مسجد ہی سے شروع کر دی تو جیسے جیسے صفوں کے سامنے امام آتا جائے وہ لوگ کھڑے ہوتے جائیں۔ یہ بحر الرائق میں ہے‘‘۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

شکل سوم: امام اور موذن دو شخص ہیں اور تکبیر کے وقت امام مسجد میں موجود نہیں، باہر ہے اور جانب قبلہ سے مسجد میں آرہا ہے تو نہ تکبیر شروع ہوتے ہی مقتدی کھڑے ہو جائیں، نہ جب موذن حی علی الفلاح کہے بلکہ جب مقتدی امام کو دیکھ لیں اس وقت کھڑے ہوں۔

(۱) شرح بخاری وفتح الباری شرح بخاری میں ہے: ’’واذا لم یکن الامام فی المسجد فذھب الجمھور الی انھم لا یقومون حتی یروہ‘‘۔ ’’تکبیر شروع ہوئی اور امام مسجد میں نہیں تو جمہور علما اس طرف گئے ہیں کہ مقتدی جس وقت تک امام کو دیکھ نہ لیں کھڑے نہ ہوں‘‘۔

اور یہی حدیث بخاری ومسلم شریف سے ثابت ہے: ’’عن ابی قتادۃ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا اقیمت الصلوٰۃ فلاتقوموا حتی ترونی‘‘۔ ’’جب اقامت کہی جائے (اور میں مسجد میں موجود نہ ہوں) تو تم لوگ کھڑے نہ ہو جب تک مجھے دیکھ نہ لو۔ یہ مذہب متفق علیہ تمام ائمہ وعلما کا ہے‘‘۔

(۵) التعلیق الممجد میں ہے: ’’وقال ابو حنیفۃ واصحابہ اذا لم یکن معھم الامام فی المسجد فانھم لایقومون حتیٰ یروا الامام لحدیث ابی قتادۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم اذا اقیمت الصلوٰۃ فلا تقوموا حتی ترونی وھو قول الشافعی و داؤد‘‘۔ ’’امام ابوحنیفہ اور ان کے شاگردوں نے

فرمایا کہ جب مقتدی کے ساتھ امام مسجد میں نہ ہو تو مقتدی نہ کھڑے ہوں جب تک امام کو دیکھ نہ لیں بوجہ حدیث حضرت ابو قتادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ جب اقامت کہی جائے تو تم کھڑے نہ ہو، یہاں تک کہ تم مجھ کو دیکھ لو اور یہی قول شافعی اور داؤد کا ہے''۔

(۶) درمختار میں ہے: ''وان دخل من قدام قاموا حین یقع بصرهم علیه''۔ ''تکبیر کے وقت امام مسجد میں نہیں ہے، باہر سے آگے کی طرف سے آ رہا ہے تو جس وقت لوگوں کی نگاہ امام پر پڑے اس وقت کھڑے ہوں''۔

(۷) فتاویٰ عالمگیریہ میں ہے: وان کان الامام دخل المسجد من قدامهم یقومون کما راؤا الامام''۔ ''اور اگر امام مسجد میں آگے کی طرف سے داخل ہوا تو جیسے لوگ امام کو دیکھیں کھڑے ہو جائیں''۔

(۸) بدائع الصنائع میں ہے: ''فان کان خارج المسجد لایقومون مالم یحضرلقول النبی صلی الله علیه وسلم ''لاتقوموافی الصف حتی ترونی خرجت'' وروی عن علیٰ رضی الله عنه '' انه دخل المسجد فرایٔ الناس قیاماً ینتظرونه فقال مالی اراکم سامدین ای واقفین متحیرین'' ولان القیام لاجل الصلوٰة ولا یمکن اداء هابدون الامام فلم یکن القیام مفیدا ثم ان دخل الامام من قدام الصفوف فکمارا وه قاموا لانه کما دخل المسجد قام مقام الامامة''۔ ''پھر اگر امام مسجد سے باہر ہو تو جب تک امام حاضر نہ ہو اس وقت تک مقتدی کھڑے نہ ہوں بوجہ قول نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے: مت کھڑے ہو صف میں یہاں تک کہ تم مجھ کو دیکھ لو کہ میں نماز کے لئے نکلا ہوں۔ اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے مروی ہے کہ وہ مسجد میں داخل ہوئے تو لوگوں کو کھڑے ہوئے انتظار کرتے پایا تو فرمایا کہ کیا بات ہے کہ میں تم لوگوں کو متحیر پاتا ہوں''۔

اس لئے بھی کہ کھڑا ہونا نماز کے لئے ہے اور نماز کا ادا کرنا بغیر امام کے نہیں ہو سکتا تو کھڑا ہونا مفید نہ ہوگا۔ پھر اگر امام صفوں کے آگے سے مسجد میں داخل ہو تو جیسے ہی لوگ امام کو دیکھیں کھڑے ہو جائیں۔ اس لئے کہ جب وہ مسجد میں داخل ہوگا امامت کی جگہ کھڑا ہوگا۔

(۹) تبیین الحقائق وشرنبلالیہ میں ہے: ''دخل من قدام وقفواحین یقع بصر هم علیه''۔ ''اگر امام مسجد میں آگے کی جانب سے داخل ہو تو جس وقت مقتدیوں کی نگاہ امام پر پڑے لوگ کھڑے ہو جائیں''۔ هکذافی فتح الله المعین والخلاصة والطحطاوی علیٰ مراقی الفلاح۔ والله تعالی اعلم۔

شکل چہارم: امام وموذن دو شخص ہیں اور تکبیر کے وقت امام مسجد میں موجود نہیں اور مسجد میں پورب کی طرف (خلاف جانب قبلہ) سے آرہا ہے تو جس جس صف کے آگے گزرے گا، وہ لوگ کھڑے ہوتے جائیں۔ تکبیر شروع ہوتے ہی یا حی علی الفلاح پر پہنچنے کے وقت سب کو کھڑا ہونے کا حکم نہیں۔

(۱) **درمختار میں ہے:** ''والافیقوم کل صف ینتھی الیہ الامام علیٰ الاظھر''۔ ''ورنہ ظاہر تر یہ ہے کہ جس جس صف تک امام پہنچتا جائے اس صف کے لوگ کھڑے ہوتے جائیں''۔

(۲) **ردالمحتار میں علامہ شامی فرماتے ہیں:** ''قولہ والاای وان لم یکن الامام بقرب المحراب بان کان فی موضع آخر من المسجد او خارجہ و دخل من خلف''۔ ح ۔ ''اور اگر امام محراب کے قریب نہ ہو یعنی مسجد ہی میں کسی دوسری جگہ ہے یا مسجد سے خارج ہے اور غیر قبلہ کی جانب سے آرہا ہے تو جس جس صف کے آگے امام گزرتا جائے گا وہ صف کھڑی ہوگی''۔

(۳) ایسا ہی علامہ حلبی شارح درمختار نے تحریر فرمایا ہے۔

(۴) فتاوی ہندیہ میں ہے: ''فامااذاکان الامام خارج المسجد فان دخل من قبل الصفوف فکما جاوزصفا قام ذالک الصف والیہ مال شمس الائمہ الحلوائی والسرخسی و خواھر زادہ''۔ لیکن امام جب مسجد کے باہر ہو تو وہ اگر صفوں کی جانب سے اندر آئے تو جس صف سے گزرے، اس صف کے لوگ کھڑے ہوجائیں۔ اسی کی طرف شمس الائمہ حلوائی، سرخسی، اور خواہر زادہ کا میلان ہے''۔

(۵) بدائع الصنائع میں ہے: ''وان دخل من وراء الصفوف فالصحیح انہ کلما جاوز صفاقام ذالک الصف لانہ صار بحال لواقتد وابہ جاز فصار فی حقھم کانہ ا خذ مکانہ''۔ ''اور اگر مسجد میں صفوں کی جانب سے امام داخل ہو تو قول صحیح یہی ہے کہ جس جس صف کے آگے بڑھے گا وہ صف کھڑی ہوتی جائے گی۔ کیوں کہ امام اس صف کے لئے ایسی حالت میں ہے کہ اگر وہ لوگ اس کی اقتدا کریں تو جائز ہے تو ان کے حق میں ایسا ہوا کہ وہ اپنی جگہ یعنی محراب میں پہنچ گیا''۔

(۶) تبیین الحقائق میں ہے: ''و ان لم یکن الامام حاضراً لا یقومون حتیٰ یصل الیھم ویقف مکانہ فی روایۃ وفی اخریٰ اذا اختلط بھم وقیل یقوم کل صف ینتھی الیہ الامام وھو

الاظہر"۔ "اور اگر امام مسجد میں موجود نہ ہو تو جب تک وہ پہنچ نہ لے اور اپنی جگہ کھڑا نہ ہو جائے، مقتدی سب بیٹھے رہیں کوئی کھڑا نہ ہو۔ ایک روایت یہ ہے اور دوسری روایت یہ ہے کہ جب باہر سے آکر مقتدیوں میں مل جائے تو لوگ کھڑے ہو جائیں، اور تیسرا قول یہ ہے کہ جس جس صف تک امام پہنچتا جائے وہ صف کھڑی ہوتی جائے اور یہی زیادہ ظاہر ہے"۔

(۷) شرنبلالیہ میں ہے: "والافیقوم کل صف ینتھی الیہ الامام علی الاظہر"۔ "اگر امام مسجد میں نہ ہو اور صف کی طرف سے امامت کے لئے آرہا ہے تو زیادہ ظاہر یہ ہے کہ جس جس صف سے آگے بڑھے وہ صف کھڑی ہو جائے"۔

(۸) فتح اللہ المعین میں ہے: "فان لم یکن وقف کل صف انتھیٰ الیہ الامام علیٰ الاصح خلاصہ وفی الزیلعی وھوا لاظہر"۔ "پس اگر امام مسجد میں نہ ہو اور صف کی طرف سے آرہا ہے تو جس جس صف تک پہنچے وہ صف کھڑی ہو جائے، یہی اصح قول ہے۔ یہ خلاصہ میں ہے اور زیلعی میں ہے کہ یہ اظہر ہے"۔

(۱۱) بحرالرائق میں ہے: "والافیقوم کل صف ینتھی الیہ الامام علی الاظہر"۔ "اگر امام مسجد میں نہ ہو تو جس صف تک امام پہنچے وہ صف کھڑی ہو جائے یہی اظہر ہے"۔

(۱۲) طحطاوی حاشیہ مراقی الفلاح: "قولہ یقوم کل صف الخ وفی عبارۃ بعضھم فکلما جاوز صفا قام ذلک الصف"۔ "بعض فقہا کی عبارت یہ ہے کہ جس صف سے امام آگے بڑھے، وہ صف کھڑی ہو جائے"۔ واللہ اعلم۔

شکل پنجم: امام محراب کے قریب مسجد میں موجود ہے، مقتدی بھی موجود ہیں۔ تکبیر شروع ہو چلی، بعض مقتدی مسجد میں اس وقت داخل ہوئے تو ان کو حکم ہے کہ بیٹھ جائیں اور جب مکبر حی علیٰ الفلاح پر پہونچے تب کھڑے ہوں۔ اس لئے کہ کھڑے ہو کر انتظار کرنا مکروہ ہے۔

(۱) فتاویٰ عالمگیریہ میں ہے: "واذادخل الرجل عند الاقامۃ یکرہ لہ الانتظار قائما ولکن یقعد ثم یقوم اذا بلغ الموذن حی علیٰ الفلاح کذا فی (۲) المضمرات"۔ "ایک شخص اقامت کے وقت مسجد میں آیا تو اس کو کھڑے رہ کر انتظار کرنا مکروہ ہے۔ اس کو چاہئے کہ بیٹھ جائے پھر جب موذن حی الفلاح پر پہونچے تب وہ

کھڑا ہو۔ اسی طرح مضمرات میں ہے''۔

(۳) درمختار میں ہے: ''دخل المسجد والموذن یقیم قعد الیٰ قیام الامام فی مصلاہ'' ۔''ایک شخص مسجد میں ایسے وقت آیا کہ مکبر تکبیر کہہ رہا ہے تو وہ بیٹھ جائے جب تک امام اپنے مصلی پر کھڑا نہ ہو، یہ بھی کھڑا نہ ہو''۔

(۴) ردالمحتار میں ہے: ''ویکرہ لہ الانتظار قائما ولکن یقعد ثم یقوم اذابلغ الموذن حی علیٰ الفلاح'' ۔''اس کے لئے نماز کا کھڑے کھڑے انتظار کرنا مکروہ ہے لیکن وہ بیٹھ جائے پھر جب موذن حی علیٰ الفلاح پر پہونچے اس وقت کھڑا ہو''۔

(۵) طحطاوی علیٰ مراقی الفلاح میں ہے: ''واذااخذ الموذن فی الاقامۃ ودخل رجل فی المسجد فانہ یقعد ولا ینتظر قائما فانہ مکروہ کمافی المضمرات(٦) قھستانی ویفھم منہ کراھۃ القیام ابتداء الاقامۃ والناس عنہ غافلون'' ۔ ''علامہ طحطاوی حاشیہ مراقی الفلاح شرح نورالایضاح میں فرماتے ہیں: اور جب موذن نے تکبیر شروع کی اور ایک شخص مسجد میں داخل ہوا تو وہ بیٹھ جائے اور کھڑے کھڑے نماز کا انتظار نہ کرے، یہ مکروہ ہے جیسا کہ مضمرات میں ہے یہ قہستانی نے کہا اور اسی سے سمجھا جاتا ہے کہ شروع تکبیر سے کھڑا ہو جانا مکروہ ہے اور لوگ اس سے غافل ہیں''۔

(۷) وقایہ و(۸) جامع الرموز میں ہے: ''وفی الکلام ایماء الیٰ انہ لو دخل المسجد احد عندالاقامۃ یقعد لکراھۃ القیام والانتظار کما فی المضمرات'' ۔''اور اس کلام میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اگر کوئی شخص تکبیر کہنے کے وقت مسجد میں داخل ہوا تو وہ بیٹھ جائے۔ اس لئے کہ کھڑا رہنا اور انتظار کرنا مکروہ ہے جیسا کہ مضمرات میں ہے''۔

(۹) فتاوی بزازیہ میں ہے: ''دخل المسجد و ھویقیم یقعد ولایقف قائما'' ۔''کوئی شخص مسجد میں داخل ہوا اور موذن تکبیر کہہ رہا ہے تو یہ آنے والا شخص بیٹھ جائے اور کھڑا نہ رہے''۔

(۱۰) عمدۃ الرعایۃ حاشیہ شرح وقایہ میں ہے: ''ویقوم الامام والقوم ای من مواضعھم الیٰ الصف وفیہ اشارۃ الی انہ اذادخل المسجد یکرہ لہ الانتظار قائما بل یجلس فی موضع ثم یقوم عندحی علیٰ الفلاح وبہ صرح فی جامع المضمرات'' ۔''امام اور قوم اپنی جگہ سے صف میں کھڑے ہوں۔ اس میں اشارہ اس امر کی طرف ہے کہ جب کوئی شخص مسجد میں داخل ہو تو اس کو کھڑے کھڑے نماز کا انتظار کرنا مکروہ ہے بلکہ کسی

جگہ بیٹھ جائے پھر حی الفلاح کہنے کے وقت کھڑا ہو"۔ واللہ اعلم۔

شکل ششم: امام ومقتدی مسجد میں موجود ہیں اور موذن غیر امام ہے جو صورت عام طور پر ہوا کرتی ہے تو اس مسئلہ میں ائمہ ومجتہدین کے پانچ قول ہیں:

قول اوّل: امام شافعی، امام ابو یوسف اور ایک جماعتِ علما کا یہ ہے کہ اس صورت میں امام ومقتدی سب کے سب بیٹھے رہیں۔ صرف مکبر (تکبیر کہنے والا) کھڑا ہو اور تکبیر کہے۔ جب تکبیر سے فارغ ہو جائے تو تکبیر ختم ہونے کے بعد امام ومقتدی سب کھڑے ہوں۔

(۱) عینی شرح بخاری میں ہے: "وقد اختلف السلف متیٰ یقوم الناس الیٰ الصلوٰۃ (الیٰ ان قال) ومذهب الشافعی وطائفة انه یستحب ان لایقوم حتی یفرغ الموذن من الاقامة وهوقول ابی یوسف"۔ "اس مسئلہ میں علما کا اختلاف ہے کہ کس وقت لوگ نماز کے لئے کھڑے ہوں تو امام شافعی اور ایک جماعت علما کا مذہب یہ ہے کہ مستحب یہ ہے کہ امام اور مقتدی کوئی بھی نہ کھڑا ہو جب تک موذن اقامت سے فارغ نہ ہو جائے اور یہی قول امام ابی یوسف رحمۃ اللہ علیہ کا ہے"۔

(۲) قسطلانی شرح بخاری میں ہے: "واختلف فی وقت القیام الیٰ الصلوٰۃ فقال الشافعی والجمهور عندالفراغ من الاقامة وهوقول ابی یوسف"۔ "اور اختلاف کیا گیا ہے نماز میں کھڑے ہونے کے وقت میں تو امام شافعی اور جمہور علمانے فرمایا کہ اقامت سے فارغ ہونے کے بعد امام ومقتدی کھڑے ہوں اور یہ قول امام ابی یوسف کا ہے"۔

(۳) نووی شرح مسلم میں ہے: "واختلف العلماء من السلف فمن بعد هم متی یقوم الناس الصلوٰة ومتنی یکبر الامام فمذهب الشافعی وطائفة أنه یستحب ان لایقوم احد حتی یفرغ الموذن من الاقامة"۔ "علمائے سلف اور ان کے بعد علمانے اختلاف کیا ہے کہ لوگ نماز کے لئے کس وقت کھڑے ہوں اور امام کس وقت تکبیر کہے تو امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور ایک جماعت علما کا مذہب یہ ہے کہ مستحب ہے امام ومقتدی کوئی بھی کھڑا نہ ہو جب تک موذن تکبیر سے فارغ نہ ہو جائے"۔

(۴) التعلیق الممجد میں ہے: "قوله انه یقوم الیٰ الصلوٰة اختلفوا فیه فقال الشافعی

والجمهور يقومون عندالفراغ من الاقامة وهو قول ابی يوسف''۔یعنی علما نے نماز میں کھڑے ہونے کے وقت میں اختلاف کیا ہے تو امام شافعی اور جمہور کا قول یہ ہے کہ جب موذن تکبیر سے فارغ ہو جائے تب امام ومقتدی کھڑے ہوں۔یہی قول امام ابی یوسف کا ہے''۔

اس قول کی تائید حدیث فعلی حضرت امیر المومنین فاروق اعظم رضی اللہ تعالی عنہ سے ہوتی ہے۔

(۵) مبسوط میں ہے:''وابو یوسف احتج بحديث عمر رضی الله عنه فانه بعد فراغ الموذن من الاقامة كان يقوم فی المحراب''۔''امام ابو یوسف نے عمر رضی اللہ تعالی عنہ کی حدیث سے دلیل پکڑی ہے کہ وہ موذن کے تکبیر سے فارغ ہونے کے بعد محراب میں کھڑے ہوتے تھے''۔واللہ تعالیٰ اعلم۔

قول دوم: امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا قول یہ ہے کہ جس وقت موذن قد قامت الصلوٰۃ کہے، اس وقت سب کو کھڑا ہونا چاہئے اور اسی کی تائید حدیث فعلی حضرت انس رضی اللہ تعالی عنہ سے ہوتی ہے۔ ہر علم والا جانتا ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ وہ صحابی ہیں جو نہ صرف دو چار دن بلکہ پورے دس سال خدمت حضور اقدس صلی اللہ تعالی علیہ وسلم میں رہے اور حضور کے ہر فعل، ہر قول کو بہت نزدیک سے غائر نگاہ سے دیکھا۔

(۱) نووی شرح مسلم میں ہے:''وكان انس رضی الله عنه يقوم اذا قال الموذن قدقامت الصلوٰة وبه قال احمد''۔''حضرت انس رضی اللہ تعالی عنہ اس وقت کھڑے ہوتے تھے جب موذن قد قامت الصلوٰۃ کہتا اور یہ قول امام احمد کا ہے''۔

(۲) عینی شرح بخاری میں ہے:''وقال احمد اذاقال الموذن **قدقامت الصلوٰة يقوم**''۔ **''امام** احمد نے فرمایا کہ جب موذن قد قامت الصلوٰۃ کہے اس وقت سب کھڑے ہوں''۔

(۳) اسی میں ہے:''وكان انس رضی الله تعالى عنه يقوم اذا قال **الموذن قدقامت الصلوٰة** وكبر الامام وحكاه ابن ابی شيبة عن سويد بن غفلة و كذا قيس بن **حازم وحماد**''۔ **''انس رضی اللہ** عنہ اس وقت کھڑے ہوتے جب موذن قد قامت الصلوٰۃ کہتا اور امام تکبیر تحریمہ کہتا۔ **محدث ابن ابی شیبہ** نے سوید بن غفلہ اور قیس بن حازم اور حماد سے اس کو حکایت کیا''۔

(۴) فتح الباری شرح بخاری میں ہے:''وعن انس انه كان يقوم اذاقال الموذن قدقامت الصلوٰة رواه

(۵) ابن المنذر و کذ ارواہ(٦) سعید بن منصور من طریق ابی اسحاق عن اصحاب عبداللہ"۔ ''حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ وہ اس وقت کھڑے ہوتے جب مؤذن قد قامت الصلوٰۃ کہتا۔ اس حدیث کو ابن المنذر وغیرہ نے روایت کیا ہے اور اسی طرح سعید بن منصور نے بطریق ابواسحاق عبداللہ سے روایت کیا''۔

(۷) مصنف میں ہے: ہشام یعنی ابن عروہ بھی قد قامت الصلوٰۃ کہنے کے قبل کھڑے ہونے کو مکروہ جانتے تھے۔

(۸) عینی میں ہے: ''کرہ ھشام یعنی ابن عروۃ ان یقوم حتیٰ یقول المؤذن قدقامت الصلوٰۃ"۔ ''مصنف میں ہے کہ ہشام یعنی ابن عروہ نے مکروہ جانا کہ کوئی شخص کھڑا ہو یہاں تک کہ مؤذن قد قامت الصلوٰۃ کہے''۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

قول سوم: اسی کے قریب قریب امام زفر وحسن ابن زیادہ کا قول ہے کہ جب مؤذن پہلی مرتبہ قد قامت الصلوٰۃ کہے تو لوگ کھڑے ہو جائیں اور جب دوسری مرتبہ کہے تو نماز شروع کر دیں۔

(۱) عینی شرح بخاری میں ہے: ''وقال زفر اذا قال المؤذن قد قامت الصلوٰۃ مرۃ قاموا و اذا قال ثانیا افتتحوا"۔ ''امام زفر نے فرمایا کہ جب مؤذن پہلی مرتبہ قد قامت الصلوٰۃ کہے تو لوگ کھڑے ہو جائیں اور جب دوسری مرتبہ کہے تو نماز شروع کر دیں''۔

(۲) بدائع الصنائع میں ہے: ''وعند زفر و حسن ابن زیاد یقومون عند قولہ قد قامت الصلوٰۃ فی المرۃ الاولیٰ ویکبرون عند الثانیۃ"۔ ''امام زفر وحسن ابن زیاد کے نزدیک پہلی مرتبہ قد قامت الصلوٰۃ کہنے کے وقت لوگ کھڑے ہو جائیں اور دوسری مرتبہ کہنے کے وقت تکبیر کہیں''۔

(۳) ردالمحتار میں ذخیرہ سے ہے: ''وقال الحسن بن زیاد یقومون عند قولہ قدقامت الصلوٰۃ قاموا الیٰ الصف و اذا قال ثانیا کبروا"۔ ''امام حسن بن زیاد نے فرمایا کہ جب موذن پہلی مرتبہ قد قامت الصلوٰۃ کہے تو لوگ کھڑے ہو جائیں صف میں اور جب دوسرے مرتبہ کہے تو تکبیر تحریمہ کہیں''۔

(۵) جامع الرموز میں ہے: ''وقال الحسن و زفر اذ اقال قد قامت الصلوٰۃ مرۃ (٦) کما فی المحیط"۔ ''امام حسن وزفر نے فرمایا کہ جب مؤذن پہلی مرتبہ قد قامت الصلوٰۃ کہے اس وقت کھڑے ہوں جیسا کہ محیط میں ہے''۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

قول چہارم: امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا ہے: ان کے نزدیک کھڑے ہونے کا کوئی وقت مقرر نہیں ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ تحدید کے متعلق میں نے کوئی حدیث نہیں سنی۔ اس لئے میری ذاتی رائے یہ ہے کہ ہر شخص کو اختیار ہے، چاہے جب کھڑا ہو۔ اس لئے کہ بعض لوگ ہلکے پھلکے ہوتے ہیں اور بعض بھاری بھرکم تو سب کو ایک وقت کھڑے ہونے کا حکم نہیں دیا جاسکتا۔ لیکن اکثر مالکیہ اس طرف گئے ہیں کہ جب امام مسجد میں موجود ہو تو جب تک مؤذن تکبیر سے فارغ نہ ہو جائے لوگ کھڑے نہ ہوں۔ (یعنی جو مذہب امام شافعی اور جمہور علما اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کا ہے)

(۱) عون المعبود شرح ابوداؤد (۲) وفتح الباری شرح بخاری میں ہے: ”وقال مالك فى الموطا لم اسمع فى قيام الناس حين تقام الصلوٰة بحد محدود الانى ارىٰ ذالك علىٰ طاقة الناس فان فيهم الثقيل والخفيف و ذهب الاكثرون الىٰ انهم اذا كان الامام معهم فى المسجد لم يقوموا حتى يفرغ من الاقامة“۔ ”امام مالک نے مؤطا میں فرمایا کہ نماز کے لئے کس وقت کھڑے ہوں، اس کے متعلق میں نے کوئی حدیث نہیں سنی لیکن مین اس کو لوگوں کی قوت اور طاقت پر خیال کرتا ہوں کیونکہ نمازیوں میں بعض بوجھل ہوتے ہیں اور بعض ہلکے پھلکے اور اکثر اس طرف گئے ہیں کہ جب امام ان کے ساتھ مسجد میں ہو تو جب تک اقامت ختم نہ ہو جائے لوگ کھڑے نہ ہوں“۔

(۳) عینی شرح بخاری میں ہے: ”وقد اختلف السلف متىٰ يقوم الناس الىٰ الصلوٰة فذهب مالك وجهور العلماء الىٰ أنه ليس لقيامهم حد“۔ ”سلف صالحین نے اختلاف کیا ہے کہ لوگ نماز کے لئے کس وقت کھڑے ہوں؟ تو امام اور جمہور علمائے مالکیہ اس طرف گئے ہیں کہ ان کے کھڑے ہونے کا کوئی وقت مقرر نہیں“۔

اسی میں ہے: ”ولكن استحب عامتهم القيام اذا اخذالموذن فى الاقامة“۔

لیکن عام علمائے مالکیہ نے مستحب سمجھا کہ جس وقت موذن تکبیر شروع کرے، اسی وقت لوگ کھڑے ہو جائیں اور ایک روایت امام مالک سے ہی اسی قسم کی منقول ہے جسے امام قاضی عیاض نے ان سے نقل کیا ہے۔

(۴) نووی شرح مسلم میں ہے: ”ونقل القاضى عياض عن مالك رحمه الله و عامة العلماء انه يستحب ان يقوموا اذااخذ الموذن فى الاقامة“۔ ”امام قاضی عیاض نے امام مالک اور علما عامہ سے ایک روایت نقل کی کہ مستحب ہے کہ لوگ اس وقت کھڑے ہوں جب مؤذن تکبیر شروع کرے“۔

(۵) التعليق الممجد شرح مؤطاامام محمد میں ہے: ”و عن مالك يقومون عند اولها وفى

الموطا انه یری ذالک علیٰ طاقة الناس فان فیهم الثقیل و الخفیف كذ اذکر القسطلانی "۔"اور ایک روایت امام مالک سے ہے کہ لوگ اول اقامت کے وقت کھڑے ہوں اور مؤطا میں ہے کہ ان کی رائے یہ ہے کہ لوگوں کی طاقت پر ہے۔اس لئے کہ نمازیوں میں بعض ثقیل ہوتے ہیں اور بعض خفیف تو سب کا حکم ایک نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح علامہ قسطلانی نے ارشاد الساری میں ذکر کیا"۔

(۶) علامہ زرقانی مالکی شرح مؤطا میں تحریر فرماتے ہیں:"ومن ثم اختلف السلف فی ذالک فقال مالک رحمة الله علیه انی اریٰ ذالک علیٰ قدرطاقة الناس فان منهم الثقیل الخفیف ولا یستطیعون ان یکونو اکرجل واحدوذهب الاکثرالیٰ انهم اذاکان الامام معهم فی المسجد لم یقوموا حتی تفرغ الامامة و اذالم یکن فی المسجد لم یقوموا حتی یروه"۔"نماز میں کس وقت کھڑا ہونا چاہئے، چوں کہ اس کے متعلق کسی حدیث میں صاف حکم نہیں ہے۔اسی لئے ائمہ سلف نے س مسئلہ میں اختلاف کیا۔تو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ میں اس کو لوگوں کی طاقت پر رکھتا ہوں۔اس لئے کہ نمازیوں میں بعض بوجھل اور بعض ہلکے ہوتے ہیں تو وہ سب ایک شخص کی طرح نہیں ہوسکتے (سب کو ایک حکم نہیں دیا جاسکتا) اور اکثر علمائے لکیہ اس طرف گئے ہیں کہ جب امام مسجد میں موجود ہو تو جب تک تکبیر ختم نہ ہو جائے اس وقت تک لوگ کھڑے نہ ہوں اور جب مسجد میں نہ ہو تو جب تک امام کو دیکھ نہ لیں کھڑے نہ ہوں"۔

ان تمام عبارات سے معلوم ہوا کہ امام مالک اور مالکیہ کے تین قول ہیں:

(۱) اصل مذہب اور قول امام مالک کا یہ ہے کہ اس بارے میں انہوں نے کوئی حدیث نہیں سنی۔اس لئے ان کی ذاتی رائے ہے کہ اس کے لئے کوئی حد مقرر نہیں۔ضعف وقوت کے اعتبار سے ہر ایک کو کھڑے ہونے کا اختیار ہے۔

(۲) ایک روایت امام مالک سے یہ ہے کہ ابتدائے اقامت ہی سے لوگ کھڑے ہو جائیں۔عام علمائے مالکیہ بموجب اسی ایک روایت کے اسی طرف گئے ہیں۔

(۳) اور اکثر علمائے مالکیہ کا یہ قول ہے کہ تکبیر ختم ہو جانے پر لوگ کھڑے ہوں۔واللہ تعالیٰ اعلم۔

فائدہ :ائمہ مجتہدین کے چار قول اوپر گزرے اور پانچواں قول امام الائمہ، مالک الازمہ امام ابوحنیفہ نعمان بن ثابت رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ جن کے متبعین عام مسلمان ہندو پاکستان اور دنیا کے مسلمانوں میں تین حصے ہیں اور جن کے

مقلدین ہم سب لوگ ہیں، آئندہ مفصل ومدلل آتا ہے۔ لیکن شراح بخاری نے ایک روایت سعید بن المسیب اور عمر بن عبدالعزیز سے ذکر کی ہے اسے ذکر کردیا جاتا ہے۔ وہ یہ کہ: جب مؤذن اللہ اکبر کہے لوگ کھڑے ہو جائیں، اور جب حی علیٰ الصلوٰۃ کہے صفوں کو برابر کریں اور جب لا الہ اللہ کہے تو امام تکبیر شروع کرے۔

عمدۃ القاری وفتح الباری شروح بخاری میں ہے: ''واللفظ للاول و عن سعید بن المسیب وعمر بن عبدالعزیز ''انہ اذاقال المؤذن الله اکبر وجب القیام و اذقال حی علیٰ الصلوٰۃ اعتدلت الصفوف، واذاقال لااله الاالله کبرالامام''۔

لیکن ظاہر ہے کہ سعید بن المسیب یا عمر بن عبدالعزیز کوئی امام مجتہد صاحب مذہب نہیں کہ لوگ ان کے مقلد ہوں اور نہ اس قول کی تائید کسی حدیث سے ذکر کی۔ اس لئے اسکی حیثیت محض ایک ذاتی رائے کی ہے تو ائمہ کے اقوال، احادیث کے ارشاد کو چھوڑ کر اس کی آڑ پکڑنا صرف اپنی بات کی پچ ہوگی۔ اسی وجہ سے علامہ عینی نے اس کو ذکر کر کے صاف فرمایا ہے:

''وذهب عامة العلماء الیٰ انه یکبر حتیٰ یفرغ المؤذن من الاقامة''۔ ''اکثر علما کا مذہب یہ ہے کہ جب تک مؤذن اقامت سے فارغ نہ ہوجائے اللہ اکبر نہ کہے امام''۔

آخر مضمون کی تائید وتوکید، تصدیق وتوثیق علمائے عامہ کے قول سے فرمادی اور اللہ اکبر کہنے کے وقت قیام کرنا محض ان کی ذاتی رائے تھی۔ اس لئے اس کی تصدیق کسی عالم کے قول سے نہ فرمائی۔

قول پنجم: امام الائمہ، مالک الازمہ، امام اعظم، ہمام اقدم، امام ابوحنیفہ نعمان بن ثابت رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اور ان کے شاگرد امام محمد رحمہ اللہ کا ہے: جب مؤذن حی علیٰ الصلوٰۃ کہے اس وقت امام ومقتدی سب کھڑے ہوں۔

(۱) عینی شرح بخاری میں ہے: ''وقال ابو حنیفة و محمد یقومون فی الصف اذاقال حی علیٰ الصلوة''۔ ''امام ابوحنیفہ اور امام محمد نے فرمایا کہ جب مؤذن حی علیٰ الصلوٰۃ کہے اس وقت سب لوصف میں کھڑے ہوجائیں''۔

اور ایک روایت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ سے ہے کہ جب مؤذن ''حی علیٰ الفلاح'' کہے، اس وقت کھڑے ہوں۔

(۲) فتح الباری شرح بخاری میں ہے: ''عن ابی حنیفة یقومون اذاقال حی علیٰ الفلاح''۔ ''امام ابوحنیفہ سے مروی ہے کہ جب مکبر حی علیٰ الفلاح کہے اس وقت کھڑے ہوں''۔

بعض علما نے قول اول کو راجح بتایا ہے اور بعض نے قول ثانی کو۔ اعلیٰ حضرت امام اہل سنت فاضل بریلوی

قدس سرہ العزیز نے ان دونوں قولوں میں اس طرح تطبیق دی کہ دراصل یہ دو قول متعارض و متخالف نہیں ہیں۔ اس لئے چاہئے کہ حی علی الصلوٰۃ کے اختتام اور حی علی الفلاح کی ابتدا کے وقت کھڑے ہوں۔ تو ایک جماعت نے انتہا کا وقت بیان کیا اور دوسری جماعت نے ابتدا کا۔

(۳) فتاویٰ رضویہ میں ہے: ''ولا تعارض عندی بین قول الوقایة واتباعها یقومون عند حی علیٰ الصلوٰة والمحیط والمضمرات ومن معهما عند حی علیٰ الفلاح فانا اذا حملنا الاول علیٰ الانتهاء والآخر علیٰ الابتداء اتحد القولان ای یقومون حین یتم المؤذن "حی علیٰ الصلوٰة" ویاتی حی علیٰ الفلاح''۔ ''میرے نزدیک وقایہ اور ان کے متبعین کے قول ''یقومون عند حی علیٰ الصلوٰة''۔ '' (حی علی الصلوٰۃ کے وقت کھڑے ہوں) اور محیط اور مضمرات اور ان دونوں کے ہم خیالوں کے قول عند حی الفلاح میں کوئی تعارض نہیں۔ اس لئے کہ ہم اول یعنی حی علی الصلوٰۃ کہنے کے وقت کھرے ہونے کو انتہا پر حمل کریں۔ یعنی جب حی علی الصلوٰۃ کہہ لے اور دوسرے قول یعنی حی علی الفلاح کہنے کے وقت کھڑے ہونے کو ابتدا پر محمول کریں تو دونوں قول متحد ہو جائیں''۔

آگے فرماتے ہیں: ''هذا مایعطیه قول المضمرات یقوم اذا بلغ المؤذن حی علیٰ الفلاح''۔ ''یہ تطبیق قول مضمرات سے سمجھی جاتی ہے کہ انہوں نے فرمایا کھڑا ہو جب مؤذن حی علی الفلاح پر پہونچے''۔

(۴) نووی شرح مسلم شریف میں ہے: ''قال ابو حنیفة رضی الله عنه والکوفیون یقومون فی الصف اذاقال حی علیٰ الصلوٰة'' ۔ ''امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ اور علمائے کوفہ نے فرمایا کہ مؤذن جب حی علی الصلوٰۃ کہے اس وقت سب لوگ کھڑے ہوں''۔

(۵) قسطلانی میں ہے: ''وعن ابی حنیفه انه یقوم فی الصف عند حی علیٰ الصلوٰة''۔ ''امام ابوحنیفہ سے مروی ہے کہ امام صف میں حی علی الصلوہ کہنے کے وقت کھڑا ہو''۔

(۶) عون المعبود شرح ابوداوٗد میں ہے: ''وعن ابی حنیفة یقومون اذاقال حی علیٰ الفلاح''۔ ''امام ابوحنیفہ سے مروی ہے کہ سب لوگ حی اعلی الفلاح کہنے کے وقت کھڑے ہوں''۔

(۷) بدائع الصنائع میں ہے: ''والجملة فیه ان المؤذن اذاقال حی علیٰ الفلاح فان کان معهم

فی المسجد یستحب للقوم ان یقوموا فی الصف"۔ ''اس مسئلے میں مجمل کلام یہ ہے کہ مؤذن جس وقت حی علیٰ الفلاح کہے اگر امام ان کے ساتھ مسجد میں موجود ہے تو قوم کے لئے مستحب یہ ہے کہ اس وقت صف میں کھڑے ہوں''۔

(۸) تنویر الابصار میں ہے: ''والقیام لامام وموتم حین قیل حی علیٰ الفلاح ان کان الامام بقرب المحراب"۔ ''اگر امام محراب کے قریب موجود ہو تو امام اور مقتدیوں کے لئے اس وقت کھڑا ہونا مستحب ہے جب حی الفلاح کہا جائے''۔

(۹) ردالمحتار میں علامہ شامی اس کی شرح میں فرماتے ہیں: ''قوله حین قیل حی علیٰ الفلاح کذافی (۱۰) الکنز و (۱۱) نورا الایضاح و (۱۲) الاصلاح و (۱۳) الظهیریة و (۱٤) البدائع وغیرها والذی فی الدرر متناو (۱۵) شرحا عند الحیعلة الاولیٰ حین یقال حی علیٰ الصلوٰة۔اه وعزاه الشیخ اسماعیل فی شرحه البیٰ (۱٦) عیون المذاهب و (۱۷) الفیض (۱۸) والوقایة و (۱۹) النقایه و (۲۰) الحاوی و (۲۱) المختار اه قلت واعتمدهٗ فی (۲۲) الملتقیٰ وحکیٰ الاول بقیل لکن نقل (۲۳) ابن الکمال تصحیح الاول ونص عبارته قال فی (۲٤) الذخیرة یقوم الامام والقوم اذاقال الموذن حی علیٰ الفلاح عند علمائنا الثلثه" ۔ ''ماتن کا یہ قول کہ امام ومقتدی حی علیٰ الفلاح پر کھڑے ہوں۔ ایسا ہی کنز، نورالایضاح، اصلاح، ظہیریہ اور بدائع وغیرہ میں ہے۔ غرر اور اس کی شرح درر میں ہے کہ امام ومقتدی حی علیٰ الصلوٰۃ کہنے کے وقت کھڑے ہوں اور شیخ اسماعیل نے اس کو شرح میں عیون المذاہب، فیض، وقایہ، نقایہ حاوی اور مختار کی طرف منسوب کیا۔ میں کہتا ہوں اور اس پر متن ملتقیٰ میں اعتماد کیا اور اول کو قیل سے تعبیر کیا۔ لیکن علامہ ابن کمال نے پہلے قول کی تصحیح کی اور ان کی عبارت یہ ہے کہ ذخیرہ میں کہا: امام اور قوم حی علیٰ الفلاح کہنے کے وقت کھڑے ہوں۔ ہمارے تینوں امام، امام اعظم، امام ابو یوسف، امام محمد کے نزدیک۔

(۲۵) مراقی الفلاح میں ہے: ''ومن الادب (القیام) ای قیام القوم والامام ان کان حاضراً بقرب المحراب (حین قیل) ای وقت قول المقیم (حی علیٰ الفلاح) لانهٗ أمر به فیجاب"۔ ''آداب ومستحبات نماز سے کھڑا ہونا امام اور قوم کا ہے، اگر امام محراب کے قریب موجود ہو جس وقت اقامت کہنے والا حی علیٰ الفلاح کہے، اس لئے کہ اس نے حکم کیا تو اس کی تعمیل کی جائے''۔

(۲۶) طحطاوی علی مراقی الفلاح میں ہے:'' واذا اخذ المؤذن فی الاقامۃ و دخل رجل فی المسجد فانہٗ یقعد و لا ینتظر قائماً فانہ مکروہ کما فی (۲۷) المضمرات (۲۸) قہستانی، و یفہم منہ کراھۃ القیام ابتداء الاقامۃ و الناس عنہ غافلون''۔ ''جب مؤذن نے تکبیر شروع کی اور کوئی آدمی اس وقت مسجد میں آیا تو وہ بیٹھ جائے اور کھڑے کھڑے نماز کا انتظار نہ کرے کہ یہ مکروہ ہے جیسا کہ مضمرات میں ہے۔ قہستانی اور اس سے سمجھا جاتا ہے کہ ابتدائے اقامت سے کھڑا ہونا مکروہ ہے اور لوگ اس سے غافل ہیں''۔ یعنی مسئلہ نہ جاننے کی وجہ سے یا جان بوجھ کر بھی محض رسم ورواج کی وجہ سے ابتدا ہی سے کھڑے ہوجاتے ہیں۔

(۲۹) ایضاح میں ہے:'' یقوم الامام و القوم عند حی علی الفلاح''۔ ''امام اور مقتدی حی علی الفلاح کہنے کے وقت کھڑے ہوں''۔

(۳۰) تبیین الحقائق میں ہے:'' قولہ و القیام حین قیل حی علی الفلاح لانہ امر بہ فیستحب المسارعۃ الیہ''۔ ''مستحب ہے کھڑا ہونا جس وقت مکبر حی علی الفلاح کہے۔ اس لئے کہ مکبر نے اس کا حکم کیا تو اس کی طرف جلدی کرنا مستحب ہے''۔

(۳۱) فتح اللہ المعین حاشیہ شرح کنز ملا مسکین میں ہے:'' (قولہ و القیام حین قیل حی علی الفلاح) مسارعۃ لامتثال الامر ھذا اذا کان الامام بقرب المحراب''۔ ''جبکہ مؤذن حی علی الفلاح یہ کہے اس وقت کھڑا ہونا مستحب ہے، امتثال امر کی جلدی کے لئے یہ حکم اس وقت ہے جب کہ امام محراب کے قریب موجود ہو''۔

(۳۲) بحر الرائق میں ہے:'' لانہٗ امر بہ فیستحب المسارعۃ الیہ اطلقہٗ فشمل الامام و المأموم ان کان الامام بقرب المحراب''۔ ''جب مکبر حی علی الفلاح کہے اس وقت امام اور مقتدیوں کا کھڑا ہونا اس لئے مستحب ہے کہ مکبر نے اس کا حکم دیا تو اس کی تعمیل میں جلدی کرنا مستحب ہے۔ اور ماتن نے اس کو مطلق رکھا تو امام اور مقتدی دونوں کو شامل ہے یہ حکم اس وقت ہے جب امام محراب کے قریب موجود ہو''۔

(۳۳) علامہ شرنبلالی حاشیہ دُرر الحکام شرح غرر الاحکام میں فرماتے ہیں:'' (قولہ و القیام عند الحیعلۃ الاولیٰ) اطلقہ فشمل الامام و لاماموم''۔ ''جب مؤذن حی علی الصلوٰۃ کہے اس وقت کھڑا ہونا مستحب ہے۔ ماتن نے اس کو مطلق رکھا تو یہ حکم امام و مقتدی دونوں کو شامل ہے''۔

(۳۴) مجمع الانہر میں ہے:''واذاقال الموذن فی الاقامة حی علیٰ الصلوٰة قام الامام والجماعة عند علمائنا الثلثة''۔''جس وقت مؤذن تکبیر میں حی علیٰ الصلوٰۃ کہے، اس وقت ہمارے تینوں اماموں کے نزدیک امام اور سب مقتدیوں کو کھڑا ہونا چاہئے''۔

(۳۵) محیط و (۳۶) ہندیہ میں ہے:''یقوم الامام والقوم اذاقال المؤذن حی علیٰ الفلاح عند علمائنا الثلثة وهوا الصحیح''۔''کھڑے ہوں امام اور سب مقتدی جب موذن حی علیٰ الفلاح کہے ہمارے تینوں اماموں کے نزدیک اور یہی صحیح ہے''۔

(۳۷) جامع الرموز میں ہے:''یقوم الامام والقوم عند حی علیٰ الصلوٰة ای قبیله لکن فی (۳۸) الاختیار اذاقال حی علیٰ الصلوٰة و فی (۳۹) الاصل وغیره:'' الاحب ان یقوموا فی الصف اذاقاله المؤذن''۔''اور امام ومقتدی حی علیٰ الصلوۃ کہنے کے وقت کھڑے ہوں یعنی اس سے کچھ پہلے لیکن اختیار میں ہے کہ جب حی علیٰ الصلوۃ کہے اور اصل وغیرہ میں ہے: محبوب ترین یہ ہے کہ لوگ صف میں اس وقت کھڑے ہوں جب موذن حی علیٰ الصلوٰۃ کہے''۔

(۴۰) فتاویٰ بزازیہ میں ہے:''دخل المسجد وهو یقیم یقعد ولا یقف قائماً''۔''کوئی شخص مسجد میں آیا اس حال میں کہ موذن تکبیر کہہ رہا ہے تو وہ بیٹھ جائے اور کھڑا نہ ہو''۔

اس عبارت اور طحطاوی حاشیہ مراقی الفلاح کی عبارت سے (جو نمبر ۲۶ میں گذری) ہر ادنیٰ عقل والا سمجھ سکتا ہے کہ آنے والا شخص جو کھڑا ہے، اس کو جائز نہیں کہ کھڑا کھڑا تکبیر سنے بلکہ اس کو حکم ہے کہ بیٹھ جائے اور حی علیٰ الفلاح پر کھڑا ہو تو بیٹھنے والے کو کب جائز ہوسکتا ہے کہ کھڑا ہو جائے اور کھڑے ہو کر تکبیر سنے مگر ہٹ اور ضد کا علاج شیخ الرئیس کے پاس بھی نہیں۔

(۴۱) علامہ شیخ شلبی حاشیہ تبیین الحقائق میں (۴۲) وجیز امام کردری سے اور وہ (۴۳) مبتغی سے نقل کرتے ہیں:''قوله فی المتن والقیام ای قیام الامام والقوم قال فی الوجیز والسنة ان یقوم الامام والقوم اذاقال المؤذن حی علیٰ الفلاح اه ومثله فی المبتغی''۔''متن میں جو والقیام فرمایا اس کے معنی امام اور قوم کا کھڑا ہونا ہے۔ وجیز میں میں فرمایا: سنت یہ ہے کہ امام اور قوم سب اس وقت کھڑے ہوں جب مؤذن حی علیٰ الفلاح کہے ایسا ہی مبتغی میں ہے''۔

(۴۴) الدرر المنتقی شرح الملتقیٰ میں ہے: ''اذا قال المقیم حی علیٰ الصلوٰۃ سیجی مافیه قام الامام ان کان بقرب المحراب و الجماعة مسارعة لامره''۔ ''جب مکبر حی علیٰ الصلوٰۃ کہے قریب ہے آئے گا جو کلام اس میں ہے تو اگر امام محراب کے قریب موجود ہو تو وہ اور سب مقتدی کھڑے ہوں، اس کے حکم تعمیل میں جلدی کریں''۔

(۴۵) عینی شرح کنز میں ہے: ''والخامس القیام ای قیام الامام و القوم حین قیل ای حین یقول المؤذن حی علیٰ الفلاح''۔ ''مستحبات میں سے پانچواں مستحب امام اور مقتدیوں کا کھڑا ہونا ہے جس وقت موذن حی علیٰ الفلاح کہے''۔

(۴۶) شرح الیاس میں ہے: ''یقوم الامام و القوم للصلوٰۃ اذا قال الموذن حی علیٰ الفلاح''۔ ''امام و مقتدی نماز کے لئے اس وقت کھڑے ہوں جب مکبر حی علیٰ الفلاح کہے''۔

(۴۷) مرقات المفاتیح شرح مشکوۃ المصابیح میں ہے: ''قال ائمتنا و یقوم الامام و القوم عند حی علیٰ الصلوٰۃ''۔ ''ہمارے اماموں نے فرمایا کہ امام اور سب مقتدی حی علیٰ الصلوٰۃ کہنے کے وقت کھڑے ہوں''۔

(۴۸) مبسوط امام سرخسی میں ہے: ''فان کان الامام مع القوم فی المسجد فانی احب الھم ان یقوموافی الصف اذاقال المؤذن حی علیٰ الفلاح''۔ ''پس اگر امام قوم کے ساتھ مسجد میں ہو تو میں مستحب جانتا ہوں ان کے لئے کہ صف میں اس وقت کھڑے ہوں جب مؤذن حی علیٰ الفلاح کہے''۔

(۴۹) موطا امام محمد باب تسویۃ الصف میں ہے: ''قال محمد ینبغی للقوم اذاقال الموذن حی علیٰ الفلاح ان یقوموا الی الصلوٰۃ فیصفوا و یسووا الصفوف و یحاذوا بین المناکب فاذااقام الموذن الصلوٰۃ کبر الامام و ھو قول ابی حنیفة''۔ ''امام محمد نے فرمایا مقتدیوں کو چاہئے کہ جس وقت موذن حی علیٰ الفلاح کہے، نماز کے لئے کھڑے ہو جائیں تو صف باندھیں اور صفوں کو درست کریں۔ مونڈھے سے مونڈھے ملا کر کھڑے ہوں اور موذن جب اقامت کہہ لے تو امام تکبیر کہے اور یہی قول امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کا ہے''۔

یہیں سے معلوم ہوا کہ جو لوگ تسویہ صفوف کا بے معنی عذر کرتے ہیں، امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے پہلے ہی اس کا فیصلہ فرما دیا اور بتا دیا کہ حی علیٰ الفلاح کے وقت کھڑا ہونا تسویہ صفوف کے منافی نہیں۔ آخر مغرب، عشا، ظہر، عصر کی نمازوں میں دوسری رکعت کے بعد تیسری رکعت کے لئے کھڑے ہوتے ہیں تو کیا پھر صف درست کرنے کی ضرورت ہوتی

ہے۔ ہرگز نہیں اسی طرح اگر نمازی حضرات آتے ہی صف درست کر کے بیٹھیں تو جس وقت کھڑے ہوں گے صف درست رہے گی۔ مسجدوں میں جانماز (صفیں) اسی لئے بچھائی جاتی ہیں کہ جیسے جیسے نمازی آتے جائیں ٹھکانے سے بیٹھتے جائیں تاکہ جب کھڑے ہوں صف درست شدہ رہے۔ اردو محاورہ میں گھاس کی جاء نماز کو اس لئے صف کہا کرتے ہیں کہ اس سے صف کی درستی کا کام لیا جاتا ہے۔ اب اگر لوگ آکر باقاعدہ نہ بیٹھا کریں تو اس کی اصلاح کی ضرورت ہے، نہ کہ اس حیلے سے دوسرے مستحب کام کو جس کو بعض علما نے سنت بھی فرمایا ہے کما مر عن الوجیز، اس کو ترک کر کے مرتکب کراہت کے ہوں۔ ولو فرضنا صفیں درست نہیں ہوتیں تو امام محمد نے صاف تصریح فرمادی کہ جب مکبر حی علیٰ الفلاح کہے اس وقت سب کھڑے ہوں اور صفیں درست کرلیں اور یہ نہ صرف ان کا قول ہے بلکہ فرماتے ہیں ''وھو قول ابی حنیفۃ'' اسی طرح صاف اور صریح روایت کتاب الآثار میں بھی ہے۔

''قال اخبرنا ابو حنیفۃ قال حدثنا طلحۃ بن مطرف عن ابراھیم اذا قال المودن حی علیٰ الفلاح ینبغی للقوم ان یقوموا فیصفوا اقال محمد وبہ ناخذ وھو قول ابی حنیفۃ''۔ ''امام محمد فرماتے ہیں کہ مجھے امام ابوحنیفہ نے خبر دی۔ انہوں نے فرمایا کہ مجھ سے طلحہ بن مطرف نے حدیث بیان کی، وہ ابراہیم نخعی سے روایت کرتے ہیں کہ جب موذن حی علیٰ الفلاح کہے تو لوگوں کو چاہئے کہ کھڑے ہو جائیں پس صف درست کریں۔ امام محمد فرماتے ہیں کہ ہم اسی کو لیتے ہیں اور یہی امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا قول ہے''۔

امام محمد کے الفاظ دونوں حدیثوں میں ینبغی ہیں اور ہر علم والا جانتا ہے کہ لفظ ینبغی متاخرین کے محاورہ وعرف میں مندوبات میں زیادہ استعمال ہوتا ہے اور متقدمین کے محاورہ وعرف میں اس کا استعمال عام ہے جو واجب تک کو شامل ہے۔

روالمحتار، حواشی اشباہ، عمدۃ الرعایہ حاشیہ شرح وقایہ میں ہے: ''لفظ ینبغی فی عرف المتاخرین غلب استعمالہٗ فی المندوبات واما فی عرف القدماء فاستعمالہٗ فی عام حتی یشمل الواجب ایضا''۔ ''(متاخرین کے عرف میں لفظ ینبغی (چاہئے، مناسب ہے) کا استعمال زیادہ تر مندوب اور پسندیدہ کاموں کے لئے ہوتا ہے۔ لیکن متقدمین کے عرف میں اس لفظ کا استعمال اس سے عام معنی کے لئے ہے یہاں تک کہ یہ واجب کو بھی شامل ہے ۱۲ام)''۔

بالجملہ پچاس کتب دینیہ کی روشن تصریحات سے یہ مسئلہ ثابت ومدلل ہوگیا کہ جس وقت امام مسجد میں محراب کے قریب موجود ہو اور مکبر غیر امام ہو، اس وقت امام ومقتدی سب کو چاہئے کہ جس وقت مکبر حی علی الفلاح کہے اس وقت کھڑے ہوں۔ یہی مسئلہ ہمارے ائمۂ ثلاثہ کا ہے۔ پس حنفیوں کو چاہئے کہ اسی پر عمل کریں اور جو شخص اس مسئلہ میں اختلاف کرے تو اگر وہ خود عالم ہے تو اس کو چاہئے کہ پچاس کتابوں کے مقابلہ میں سو ورنہ ساٹھ ہی کتب فقہ سے ایسا ہی واضح طور پر ثابت کردے کہ ہمارے ائمہ ثلاثہ کے نزدیک موذن جس وقت تکبیر شروع کرے، اسی وقت امام اور مقتدی سب کو کھڑا ہونا چاہئے یا جس وقت موذن تکبیر شروع کرے، اس وقت امام ومقتدی کو بیٹھا رہنا مکروہ ہے۔ اور اگر مخالفت کرنے والا عامی ہے تو اس کو بمضمون ع ایاز قدر خود بشناس، دینی مسئلہ میں ٹانگ اڑانے سے بچنا چاہئے اور اگر رسم ورواج اسے مخالفت پر مجبور کرتے ہیں تو اس کو چاہئے کہ پہلے ہندوستان وپاکستان یا سارے جہان سے جہاں سے ہوسکے، مستند علمائے دین کے فتاویٰ منگالے جن میں کم ازکم پچاس ہی کتابوں سے حنفیہ کے نزدیک تکبیر شروع ہوتے ہی کھڑے ہونے کا حکم ہو یا بیٹھے رہنے کی کراہت مدلل ہو اور اسی کو ائمۂ ثلاثہ کا مذہب بتایا ہو۔ اور اگر ایسا نہیں کرسکتے اور ہم دعوی سے کہتے ہیں کہ ہرگز کوئی ایسا فتویٰ نہیں پیش کرسکتا تو دینی مسئلہ کے مقابل نفسانیت اور ہٹ دھرمی دکھانا دین دار مسلمان کا کام نہیں۔

(۲) بعض حضرات اپنی بات بنانے کو کہتے ہیں کہ یہ مسئلہ لوگوں نے نیا نکالا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو کسی صحابی یا تابعی سے ضرور منقول ہوتا۔ تو جو مسئلہ ائمہ کرام ثلاثہ امام اعظم، امام ابو یوسف، امام محمد سے منقول ہو وہ نیا مسئلہ کس طرح کہا جا سکتا ہے۔ امام ابو یوسف اور امام محمد اگر تبع تابعین سے ہیں تو امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے تابعی ہونے میں تو کوئی کلام نہیں۔ کتاب الآثار میں یہ حدیث بسند متصل حضرت ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے۔ امام محمد نے مؤطا شریف میں فرمایا "به ناخذ وهو قول ابی حنيفة" پھر یہ مسئلہ نیا ہوا یا حنفی ہوکر ائمۂ ثلاثہ کے خلاف کرنا نئی بات ہے؟ امام صاحب کے علاوہ ہشام بن عروہ جو جلیل القدر تابعی ہیں، وہ بھی شروع تکبیر سے قیام کو مکروہ جانتے ہیں کما مر عن المصنف۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ جیسے جلیل القدر صحابی تو حی علی الفلاح کے بھی بعد قد قامت الصلوٰۃ پر کھڑے ہوتے تھے۔ کما مرّ عن العینی وفتح الباری۔ بلکہ امام سرخسی نے مبسوط میں امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کی جو دلیل بیان کی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت امیر المومنین عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ ختم تکبیر پر کھڑے ہوتے تھے۔

''ونص عبارته هكذا''وابويوسف احتج بحديث عمر رضی الله عنه فانه بعد فراغ المؤذن من الاقامة كان يقوم فی المحراب''۔''امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ کی حدیث سے دلیل پکڑی ہے کہ وہ موذن کی اقامت سے فارغ ہونے کے بعد محراب میں کھڑے ہوتے تھے''۔

(۳) بعض حضرات کا یہ خیال ہے کہ از روئے حدیث شریف امام مالک رحمہ اللہ اور عام علما کے مسلک کو ترجیح ہے۔ یہ ان کا خیال ہی خیال ہے۔ اگر اس دور آزادی میں کہ ہندوستان آزاد ہو چکا ہے، ہر شخص کو آزادی ہے جو چاہے خیال رکھے۔ لیکن یہ تو ''مدعی ست گواہ چست'' کی مثل ہے۔ امام مالک خود فرماتے ہیں کہ میں نے اس بارے میں کوئی حدیث نہیں سنی۔ کما مرّ عن عون المعبود وفتح الباری قال مالك فی المؤطا: لم اسمع فی قيام الناس حين تقام الصلوة بحد محدود۔ ''امام مالک نے موطا میں فرمایا کہ نماز میں لوگ کس وقت کھڑے ہوں، اس کے متعلق میں نے کوئی حدیث نہیں سنی''۔ اس لئے وہ اپنی ذاتی رائے یہ لکھتے ہیں: ''الا انی اری ذالك علیٰ طاقة الناس''۔ ''لیکن میری ذاتی رائے یہ ہے کہ یہ لوگوں کی طاقت پر ہے''۔

اور یہی وجہ ہے کہ ائمۂ مالکیہ میں اختلاف ہوا۔ اکثر علمائے مالکیہ اس طرف گئے ہیں کہ جب امام مسجد میں موجود ہو تو جب تک تکبیر ختم نہ ہولے، لوگ کھڑے نہ ہوں اور عام علمائے مالکیہ امام مالک سے ایک روایت کے مطابق ابتدائے اقامت سے کھڑے ہونے کو مستحب جانتے ہیں۔ لیکن اہلِ علم سے پوشیدہ نہیں کہ ''عن'' کر کے مذہب بیان نہیں کیا جاتا بلکہ اس کے لئے قال یاذهب یامذهب فلان یاعند فلان کے الفاظ لاتے ہیں اور اگر کوئی ایک روایت ہو تو اس کو عن سے تعبیر کرتے ہیں۔

مقدمہ عمدۃ الرعایہ حاشیہ شرح وقایہ میں ہے: ''الفرق بين 'عندهٗ' وعنه ان الاول دال علی المذهب والثانی علی الرواية۔ فاذاقالوا ''هذاعندا بی حنيفة''دل ذلك علیٰ انه مذهبه واذاقالوا''وعنه كذا'' دل علیٰ انه رواية عنه۔ ''عندهٗ اور عنہ میں فرق یہ ہے کہ عندہ مذہب پر دلالت کرتا ہے اور عنہ ایک روایت پر تو جس وقت علما کہیں ''هذا عن ابی حنيفة '' اس سے معلوم ہوگیا کہ یہ ان کا مذہب ہے اور جب کہیں 'وعنه كذا' تو معلوم ہوگا کہ ان سے یہ ایک روایت ہے''۔

تو ایسی حالت میں اولاً یہ خیال کرنا کہ از روئے حدیث شریف امام مالک رحمہ اللہ اور مام علما کے مسلک کو

ترجیح ہے محض غلط ہے۔

ثانیاً عام علما کے مسلک کو امام مالک کا مسلک بتانا بھی غلط۔

ثالثاً اس کو ازروئے حدیث شریف مرجح ماننا بھی غلط۔

رابعاً ایسا کہنا ''مدعی سست گوہ چست'' کا مصداق بننا ہے۔

خامساً اپنے کو امام مالک سے بھی اعلم بالحدیث ہونے کا اشعار ہے۔ اگرچہ امام مالکؒ فرماتے ہیں مجھے اس بارے میں کوئی حدیث نہیں معلوم، لیکن مجھ کو حدیث معلوم ہے، اس کے رو سے امام مالک کے مذہب کو ترجیح ہے۔

سادساً بخاری شریف کی حدیث ''لاتقوموا حتیٰ ترونی'' سے استدلال کرنا اور لکھنا کہ اس حدیث سے ظاہر ہے کہ اقامت شروع ہونے کے بعد کھڑا ہونے سے ممانعت کی وجہ صرف آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم (امام) کی مسجد میں عدم موجودگی ہے۔ پس اگر ابتدائے اقامت کے وقت آپ موجود ہوں تو کھڑا ہونے سے اس وقت کوئی امر مانع نہیں ہے۔ یہ بھی نرا اجتہاد ہی اجتہاد اور ائمۂ مجتہدین فقہا و محدثین سب کے خلاف ہے۔ اس لئے کہ مجتہدین کا اختلاف اسی صورت میں ہے کہ امام مسجد میں موجود ہو اور اگر امام مسجد میں موجود نہ ہو تو اس کا مفصل حکم شکل سوم و چہارم میں گزرا۔ اس میں اختلاف ہی نہیں۔

عینی شرح بخاری میں ہے: ''قال ابو حنیفة ومحمد یقومون فی الصف اذاقال حی علیٰ الصلوٰة فاذاقال قد قامت الصلوٰة کبّر الامام لانهٗ امین الشرع وقد اخبر بقیامها فیجب تصدیقهٗ واذالم یکن الامام فی المسجد فذهب الجمهور الیٰ انهم لا یقومون حتیٰ یروه''۔ ''امام اعظم اور امام محمد نے فرمایا کہ سب لوگ صف میں اس وقت کھڑے ہوں جب مکبر حی علی الصلوٰۃ کہے اور جب قد قامت الصلوٰۃ کہے تو امام تکبیر تحریمہ کہے۔ اس لئے کہ وہ شرع کا امانت دار ہے اور اس نے قیام نماز کی خبر دی تو اس کی تصدیق ضروری ہے اور اگر امام مسجد میں موجود نہ ہو تو جمہور علما اس طرف گئے ہیں کہ لوگ نہ کھڑے ہوں جب تک امام کو دیکھ نہ لیں''۔

اسی کو بدائع میں فرمایا: ''والجملة فیه ان الموذن اذاقال حی علیٰ الفلاح فان کان الامام معهم فی المسجد یستحب للقوم ان یقوموا فی الصف''۔ ''اور خلاصۂ کلام اس مسئلہ میں یہ ہے کہ جب مؤذن ''حی علی الفلاح'' کہے تو اگر امام ان کے ساتھ مسجد میں موجود ہو تو قوم کے لئے مستحب یہ ہے کہ اس وقت کھڑے ہوں''۔

تنویرالابصار وغیرہ کی عبارت اوپر گزری: ''والقیام لامام ومؤتم حین قیل حی علیٰ الفلاح ان کان الامام بقرب المحراب"۔ ''مستحب ہے امام اور مقتدیوں کا کھڑا ہونا جب ''حی علیٰ الفلاح'' کہا جائے اگر امام محراب کے قریب موجود ہو''۔

عون المعبود وفتح الباری میں ہے: ''وذھب الاکثرون الیٰ انھم اذا کان الامام معھم فی المسجد لم یقوموا حتی تفرغ الاقامۃ"۔ ''اکثر علما اس امر کی طرف گئے ہیں کہ اگر امام مقتدیوں کے ساتھ مسجد میں موجود ہو تو مقتدی سب نہیں کھڑے ہوں گے جب تک اقامت سے فراغت نہ ہو جائے۔

للّٰہ انصاف! کیسی کھلی ہوئی تصریح ہے کہ امام مقتدیوں کے ساتھ مسجد میں موجود ہے تو جب تک تکبیر ختم نہ ہو جائے لوگ کھڑے نہ ہوں اور آپ فرماتے ہیں ''اگر ابتدائے اقامت کے وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم (امام) موجود ہوں، تو کھڑا ہونے سے اس وقت کوئی امر مانع نہیں ہے۔

سابعاً امام کی موجودگی کی صورت میں ابتدائے اقامت سے مقتدیوں کے کھڑے ہو جانے کی دلیل میں اس کو پیش کرنا کہ اگر امام موجود ہو تو کھڑا ہونے سے اس وقت کوئی امر مانع نہیں، یہ بھی غلط۔ مانع نہیں تو دلیل نہیں۔ اصل ضرورت اس وقت قیام کی محرک اور مثبت کی ہے۔ نفی تو دلیل نہیں ہو سکتی۔

ثامناً یہ خیال کہ کوئی امر مانع نہیں، یہ بھی غلط ہے۔ مانع ہے اور زبردست مانع ہے۔

بدائع میں ہے: ''انا نمنعھم عن القیام کیلا یلغو قولہٗ حی علیٰ الفلاح لان من وجدت منہ المبادرۃ الیٰ شئ فدٗعائہ الیہ بعد تحصیلہ ایاہ لغو من الکلام"۔ ''ہم حی علیٰ الفلاح کہنے کے قبل کھڑے ہونے سے اس لئے منع کرتے ہیں کہ جس شخص سے کسی امر کی طرف مبادرت و مسابقت ہو چکی ہو، اب اس کو اس شئی کی طرف بلانا ایک لغو کلام ہے''۔

مکبر حی علیٰ الصلوۃ، حی علیٰ الفلاح کہہ کر نمازیوں کو بلاتا ہے کہ آؤ طرف نماز کے، آؤ طرف فلاح و بہبود کے تو چاہئے کہ اس کی تعمیل میں لوگ نماز کے لئے کھڑے ہو جائیں اور اگر وہ لوگ پہلے ہی سے کھڑے ہو چکے ہوں تو یہ کہنا بالکل لغو اور بے معنی ہوگا۔ تو کیا لغو کام سے بچانا زبردست مانع نہیں؟

تاسعاً اس کو دوسری حدیث مسلم شریف ''عن ابی ھریرۃ ان الصلوٰۃ کانت تقام لرسول اللہ صلی

الله علیه و سلم فیاخذالناس مصافهم قبل ان یقوم رسول الله صلی الله علیه و سلم مقامه'' سے بالکل عیاں ماننا طرفہ تماشا ہے۔

امام نووی، امام عینی، امام ابن حجر، شرح مسلم، عمدۃ القاری، فتح الباری میں فرماتے ہیں: ''و قولہٗ فی روایة ابی هریرة رضی الله عنه فیاخذالناس مصافهم قبل خروجه لعله کان مرة اومرتین و نحوهما لبیان الجواز اولعذر ولعل قوله صلی الله علیه و سلم فلا تقوموا حتی ترونی کان بعد ذلك''۔ ''حضرت ابو ہریرہ کا یہ فرمانا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریف لانے اور اپنی جگہ پر کھڑے ہو جانے سے پہلے ہی صحابۂ کرام اپنی اپنی جگہ صفوں میں لے لیتے تھے (تو یہ حدیث بظاہر حدیث ابوقتادہ کے مخالف معلوم ہوتی ہے تو یہ سب ائمہ محدثین، شراح بخاری ومسلم اس کا جواب دیتے ہیں کہ) شاید ایک یا دو مرتبہ کبھی ایسا ہوا ہو، وہ بھی صرف بیان جواز کے لئے (یعنی اگر ایسا بھی کوئی کرلے تو جائز ہے اور دوسرا جواب اس کا یہ ہے کہ) لوگ پہلے ایسا کرتے تھے۔ اس لئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے بعد کو اس سے منع فرمادیا کہ میرے آنے سے قبل مت کھڑے ہو جایا کرو''۔ تیسرا جواب اس کا یہ ہے کہ ایسا بھی کسی عذر کی وجہ سے ہوا ہوگا۔

چوتھا جواب اس کا یہ ہے کہ حدیث میں ''یاخذ الناس مصافهم'' ہے یعنی صحابہ کرام اپنی اپنی جگہ لے لیتے تھے یعنی اپنی اپنی جگہ جا کر بیٹھ جاتے تھے۔ حدیث ''فیقوم الناس مصافهم'' تو ہے نہیں، جس سے استدلال کیا جاسکے اور بالکل عیاں کہا جاسکے۔

عاشراً یہ خیال کہ سب سے زیادہ واضح طور پر اس مضمون ''ابتدائے اقامت کے وقت کھڑا ہونا'' کی تائید ابن شہاب کی حدیث سے ہوتی ہے کہ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین اقامت شروع ہوتے ہی کھڑے ہو جاتے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی جگہ پر نہیں آتے جب تک صفیں درست نہ ہو جاتیں، صریح دھوکہ ہے۔ یہ تو ابن شہاب زہری سے ایک روایت ہے۔ ابن شہاب کون ہیں، اہل علم سے مخفی نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال کو تو صحابہ بیان کرسکتے ہیں، نہ کہ تابعی اور وہ بھی صغیر۔ تو یہ حدیث منقطع ہوئی، اور اگر تابعی کے قول سے سند لینا ہے تو ہشام ابن عروہ جو جلیل القدر تابعی ہیں، ان کی بات کیوں پس پشت ڈالی جائے۔ حضرت ابراہیم نخعی سے کیوں نہ استدلال کیا جائے اور جب تابعی سے سند لانا ہے تو صحابہ کرام تو ان سے اہم واقدم ہیں اور وہ بھی صرف زیارت کر کے گھر چلے

جانے والے یا دو چار دن خدمت اقدس میں رہنے والے نہیں بلکہ پورے دس سال خدمت اقدس میں بسر کرنے والے، سفر وحضر میں ہر وقت ساتھ رہنے والے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے کیوں نہ استدلال کیا جائے جن کا عمل قول دوم بیانِ مذہب امام احمد میں نووی، عینی، فتح الباری سے گزرا: ''و کان انس رضی اللہ عنہ یقوم اذا قال الموذن قدقامت الصلوٰۃ وبہ قال احمد''۔ ''حضرت انس رضی اللہ تعالی عنہ اس وقت کھڑے ہوتے جب مؤذن قد قامت الصلوٰۃ کہتا اور امام احمد اسی کے قائل ہیں''۔

بلکہ ان سے بھی بڑھ کر اشداء علی الکفار رحماء بینھم، قوت وشوکتِ اسلام خلیفۂ دوم حضرت امیر المؤمنین عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کو کیوں ساقط النظر ٹھہرایا جائے جن کا عمل مبارک علامہ سرخسی نے مبسوط میں ضمنِ دلیل امام ابو یوسف رحمہ اللہ بیان فرمایا: ''وابو یوسف احتج بحدیث عمر رضی اللہ عنہ فانہٗ بعد فراغ المؤذن من الاقامۃ کان یقوم المحراب''۔ ''امام ابو یوسف حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث سے دلیل لائے کہ وہ مؤذن کی اقامت سے فارغ ہونے کے بعد محراب میں کھڑے ہوتے تھے''۔

غرض کتب حدیث وشروح حدیث وکتب متون وشروح وحواشی وفتاوی فقہیہ سے روز روشن کی طرح یہ مسئلہ واضح ہے کہ جماعت کی نماز میں امام ومقتدی سب کو اس وقت کھڑا ہونا چاہئے جب مؤذن تکبیر میں حی علی الفلاح کہے۔ واللہ الہادی وھو الموفق واللہ تعالی اعلم۔

☆☆☆☆☆

مسئلہ ثانیہ از میرٹھ

سجدہ میں جاتے وقت پیشتر ہاتھ زمین پر ٹیکنا چاہئے یا گھٹنے پر؟ اور سجدہ سے اٹھتے وقت اول گھٹنا اٹھانا چاہئے یا ہاتھ۔؟ غیر مقلدین سجدہ میں پیشتر قیام سے جاتے ہوئے زمین پر ہاتھ لگاتے ہیں پھر گھٹنے۔ اور سجدہ سے اٹھتے وقت اول گھٹنے اٹھاتے ہیں ازاں بعد ہاتھ۔ اور اپنے پیروں کے درمیان کشادہ رکھتے ہیں اور جانبین داہنے بائیں مقتدیان کا باہمی یکے بعد دیگرے پیر سے ملانا کس طرح آیا ہے؟ پس ہم گذارش رکھ کر امر واضح ہونے کے طالب ہیں کہ حضور صلی اللہ تعالی علیہ وسلم اپنے ہر دو پائے مبارک نماز میں کس قدر فاصلہ سے رکھتے تھے اور صحابہ کرام کا جماعت میں مونڈھے سے مونڈھا ملانا ثابت ہے یا پیر سے پیر؟ اور نماز میں داہنے پیر کا انگوٹھا ہل جانا وغیرہ۔ حرکات محررہ بالا اگر کوئی حنفی اختیار کرے تو اس کی نماز کیسی رہے گی؟ غیر مقلد کے پیچھے نماز پڑھنا کیسا ہے؟ آیا مقلد کی نماز ہو جاتی ہے یا نہیں؟

الجواب

سجدہ میں جاتے وقت پہلے گھٹنے پھر ہاتھ بعدہ' ناک اس کے بعد پیشانی زمین پر رکھے اور اٹھتے وقت برعکس اس کے یعنی پیشانی اٹھائے اس کے بعد ناک بعدہ' ہاتھ پھر گھٹنے۔

مسند امام الائمہ سراج الامۃ میں ہے: "ابو حنیفة عن عاصم عن ابیه عن وائل بن حجر رضی الله تعالیٰ عنه قال کان النبی صلی الله علیه وسلم اذا سجد وضع رکبتیه قبل یدیه واذا قام یرفع یدیه قبل رُکبتیه۔"

"حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم جب سجدہ کرتے تو پہلے ہاتھ پھر گھٹنے زمین پر رکھتے اور جب اٹھتے تو پہلے ہاتھ پھر گھٹنے اٹھا لیتے"۔ اخرجه الطحاوی والاربعة وقال الترمذی حدیث حسن وصححه ابن خزیمة وابن حبان۔

اصلاح ومنیہ وکنز الدقائق میں ہے: "ویسجد فیضع رکبتیه اولا ثم یدیه ثم وجهه بین کفیه ویدیه حذاء اذنیه ویرفع راسه اولا ثم یدیه ثم رکبتیه هکذا فی الصغیری والغنیة شرح المنیة وتبیین الحقائق۔"

پھر ہندیہ میں ہے: "قالوا اذا اراد السجود یضع اولا ما کان اقرب الیٰ الارض فیضع رکبتیه اولا ثم یدیه ثم انفه ثم جبهته واذا اراد الرفع یرفع اولا جبهته ثم انفه ثم یدیه ثم رکبتیه هکذا فی الطحطاوی والدر المختار وغیرهما من معتمدات الاسفار۔"

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: "اذا سجد احدکم فلیبدء برکبتیه ولا یبرك بروك الفحل۔"

"تم میں کوئی شخص سجدہ کرے تو چاہئے کہ پہلے گھٹنے کو رکھے اور اونٹ کی نشست نہ بیٹھے"۔

امام ابراہیم نخعی رضی اللہ عنہ سے ایک شخص کے بارے میں سوال ہوا، جو سجدے میں جاتے وقت پہلے ہاتھ رکھے پھر پاؤں؟۔ فرمایا" او یصنع ذلك الا احمق ومجنون۔ کیا ایسا کوئی کرتا ہے سوا بے وقوف اور پاگل کے۔

نماز کے اندر پاؤں میں فاصلہ چار انگل ہونا چاہئے۔ خلاصہ میں ہے: "وینبغی ان یکون بین قدمیه قدر اربع اصابع فی قیامه۔ هکذا فی مراقی الفلاح۔"

نماز میں حکم مونڈھے ملانے کا ہے نہ پاؤں ملانے کا۔ سجدہ میں اگر پاؤں بالکل اٹھے ہیں تو مفسد نماز ہے:

غنیۃ پھر عالمگیری میں ہے: ولو سجد ولم یضع قدمیه علیٰ الارض لا یجوز۔"

ہدایہ میں فرمایا: "واما وضع القدمین فقد ذکر القدوری انه فریضة فی السجود کذا فی مجمع الانهر معزیا الیٰ التبیین واختاره الفقیه ابو اللیث وصححه فی العیون کما فی البحر۔"

ابوداؤد میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: رصوا صفوفکم وقاربوا بینهما وحاذوا بالاعناق۔ " گھنی کرو اپنی صفوف کو کہ باہم دو شخصوں میں فاصلہ نہ رہے اور صفیں نزدیک نزدیک باندھو کہ دو صفوں میں حاجت سے زیادہ فاصلہ نہ ہو اور محاذات میں رکھو گردنوں کو"۔

ابوداؤد اور نسائی حضرت عبداللہ بن عمر بن خطاب رضی اللہ عنہما سے راوی، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

"رصوا الصفوف وحاذوا بین المناکب وسدوا الخلل۔"
محض انگوٹھا ہل جانا یا انگلیوں کو حرکت دینا مفسد نماز نہیں، مکروہ ہے۔
فتاویٰ اسعدیہ سیدنا اسعد المدنی الحسینی رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں ہے: "(سوال) رجل هو فی الصلوٰة یصلی ویرفع احدیٰ رجلیه وتارة یرفع اصابع رجلیه هل یجوز الاقتداء به ام لا افتونا؟ (جواب) اذا رفع رجله ثلث مرات متتابعات تفسد صلاته وصلاة القوم والا فلا واما حرکة الاصابع مع اثبات الرجل فلا تفسد به الصلوٰة واما الکراهة فظاهرة والحالة هذه اه۔" غیر مقلدوں کے پیچھے نماز نہیں ہوتی، فرض سر پر رہتا ہے۔ وقد فصله مجدد المائة الحاضرة فی "النهی الاکید عن الصلوٰة وراء عدی التقلید۔" والله تعالیٰ اعلم

☆☆☆☆☆

مسئلہ از شہر بریلی محلہ خواجہ قطب مرسلہ فخر الدین محصل مداری دروازہ ۲۵ جمادی الاولی ۱۳۲۳ھ

کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ مسجد میں جہاں امام نماز کھڑا ہو کر پڑھتا ہے اگر وہ پانچ انگل بلند ہو تو نماز جائز ہوگی یا نہیں؟ اور اگر اس پر نماز جائز نہیں تو اس کے نیچے کھڑا ہو اور اس پر سجدہ کرے تو کچھ قباحت ہے یا نہیں؟ اور دہلیز کا کیا حکم ہے؟ آیا دہلیز کا حکم محراب کا ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب

یہ صورت مکروہ ہے۔ لمشابهة الیهود فانهم یجعلون لامامهم دکانا والاصح ان لا تقدیر بل کلما یقع به الامتیاز یکره کما فی الدر۔
اور اگر اسے دور کریں تو امام اگر در میں کھڑا ہو تو یہ بھی مکروہ ہے۔ بقول امامنا رضی الله عنه انی اکره للامام ان یقوم بین الساریتین کما فی المعراج۔
اور اگر صحن میں کھڑا ہو کر بلندی پر سجدہ کرے تو سخت مکروہ ہے یہاں تک کہ اگر بالشت بھر ہو تو نماز ہی نہ ہوگی کما فی الدر المختار وغیرہ۔
صحن میں صفوں کے لئے زیادہ وسعت چاہیں تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ در کی کرسی بقدر سجدہ کھود کر طاق کے مثل بنائیں اور اتنا ٹکڑا صحن سے ہموار کریں۔ امام صحن میں کھڑا ہو کر اس طاق پر سجدہ کرے، اب کوئی کراہت نہیں اور دہلیز میں کھڑا ہو کر نماز پڑھنا بھی مکروہ ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم
کتبہ عبدہ المذنب احمد رضا القادری عفی عنہ بمحمد المصطفی صلی اللہ علیہ وسلم۔

الجواب: پانچ انگل بلند ہو تو کچھ حرج نہیں۔ اس لئے کہ کراہت جب ہے کہ امام اکیلا دکان پر کھڑا ہو اور دکان کی مقدار ارتفاع میں مختلف اقوال ہیں جیسا کہ فتاویٰ عالمگیریہ میں ہے: "ثم قدر الارتفاع قامة لا باس بما دونها ذکره الطحاوی وقیل انه مقدر بما یقع به الامتیاز وقیل بمقدار الذراع اعتبارا بالسترة وعلیه الاعتماد

كذا فى التبيين وفى غاية البيان هو الصحيح كذا فى البحر الرائق انتهىٰ۔"
بلندی کا اندازہ قد ہے۔اس سے کم میں کچھ حرج نہیں۔امام طحاوی نے یوں کہا کہ جس انداز سے امتیاز ہو(اس قول کو مجیب نے نقل کیا)۔بعض یہ فرماتے ہیں کہ تین گز شرعی مقدار ہے جیسا کہ سترہ۔یہی معتبر ہے اوراس آخر قول پر اعتماد ہے۔یہ تبیین میں ہے اور غایۃ البیان میں ہے کہ یہ صحیح ہے۔ كذا فى البحر الرائق۔

اسی میں اور درمختار میں ہے: "اذا تعارض امامان معتبران غير احدهما بالصحيح والآخر بالاصح فالاخذ بالصحيح اولىٰ" والله تعالىٰ اعلم۔

حررہ العبد محمد ابراهيم سنی حنفی چشتی رشیدی عفا الله عنه بجاه نبيه صلی الله علیه وسلم۔

جواب ثانی: جواب سید مولوی ابراہیم رشیدی محض غلط ہے اور دعویٰ محض بے دلیل اور عوام کے دھوکہ دہی کے لئے۔جو"اس لئے الخ" لکھا بھی،سو دعویٰ سے محض بے لگاؤ ہے۔فتاوی عالمگیریہ سے مقدار ارتفاع قامہ اور ذراع جو لکھا ہے یہ دونوں بوجہ مخالفت ظاہر الروایۃ غیر معتبر ہیں۔ظاہر الروایۃ (جس پر عمل وافتا متعین اور اس کے خلاف پر فتویٰ دینا جہل وخرق اجماع ہے) وہی ہے جو حضرت مجیب اول متع الله المسلمين بطول بقائه نے اختیار فرمائی ہے۔

ردالمحتار میں ہے: "قوله وقيل ما يقع به الامتياز هو ظاهر الرواية كما فى البدائع ـ اقول هكذا فى الطحطاوى والبحر الرائق۔"

طحطاوی میں ہے: "والرواية قد اختلفت فى المقدار والاخذ بظاهر الرواية اولىٰ ـ"

بحرالرائق میں ہے: "فالحاصل ان التصحيح قد اختلفت فالاولىٰ العمل بظاهر الرواية واطلاق الحديث۔"

اسی میں ہے: "الفتوىٰ اذا اختلف كان الترجيح بظاهر الرواية۔"

بلکہ اس میں صاف تصریح فرمادی کہ ایسے موقع پر ظاہر الروایۃ کو ڈھونڈنا ،اس کی طرف رجوع کرنا واجب ہے:"اذا اختلف التصحيح وجب الفحص عن الظاهر الرواية والرجوع اليها بلکہ انفع الوسائل میں علامہ طرطوسی فرماتے ہیں: "المقلد لا يجوز له ان يحكم الا بما هو ظاهر الرواية۔"

شرح عقود بلکہ باوجود وضوح وشیوع اس کے آپ جیسے تیز فہم کے لئے علمانے تصریح فرمادی کہ جب کبھی فتویٰ لکھنے بیٹھنا تو ظاہر الروایۃ پر عمل کرنا۔کیونکہ اس کے خلاف پر افتا جہالت ونادانی وخرق اجماع ہے۔

بحرالرائق میں ہے:"ما خرج عن ظاهر الرواية فهو مرفوع عنه۔"

درمختار میں فرمایا: "وان الحكم والفتيا بالقول المرجوح جهل وخرق للاجماع فثبت ان الحكم والفتيا على ما خرج عن ظاهر الرواية جهل وخرق للاجماع ولكن الوهابية قوم لا يعقلون۔"

ثانیاً یہ امر مسلم ہے کہ اتباع اس روایت کا کیا جائے گا جس کے موافق درایت ہو۔اور احادیث ابی داؤد وحاکم

وابن حبان وغیرہم کی اس باب میں مطلق ہیں اور ظاہر الروایۃ قدر ممتاز ہے۔ پھر اس سے عدول فقاہت سے دور بلکہ کار جہول ہے۔

ردالمحتار میں ہے: "لا ینبغی ان یعدل عن الدرایۃ ای الدلیل اذا وافقتھا روایۃ اہ۔"

ثالثاً تصحیح اور فتویٰ جب مختلف ہو تو عمل میں اعتبار موافقت اطلاق متون کا ہوتا ہے اور متون سارے کے سارے یک زبان یہی کہہ رہے ہیں: " یکرہ ان یقوم فی مکان اعلیٰ من مقام القوم اذا لم یکن بعض القوم معہ۔" تو اس سے عدول محض جہالت ونادانی ہے۔

ردالمحتار میں ہے: " اختلف التصحیح والفتویٰ کما رایت والعمل بما وافق اطلاق المتون الخ اہ" بلکہ بہت علما نے خلاف اطلاق بعض ترجیحات وافتا کو بھی نہ مانا۔

ردالمحتار باب فی البیر میں ہے: "مخالف لاطلاق المتون قاطبۃ فلا یعبئو بہ وان التی بہ ایضا کذا فی المحیط ھو الصحیح واخرہ البحر والمنح وتبعہ التنویر والدر لکن لا یعول علیہ لخلافہ اطلاق المتون الخ ۔"

رابعاً بحر الرائق میں ثابت کہ مخالف ظاہر الروایۃ کا، مرجوع عنہ ہوتا ہے اور وہ مجتہد کا قول نہیں رہتا کما فی الرد عن البحر ان ما خرج عن ظاہر الروایۃ فھو مرجوع عنہ وان المرجوع عنہ لیس قولا لہ۔

پھر باوجود ایماء حنفیت امام کے خلاف فتویٰ دینا، سواء مستثنیات خاصہ مصرحہ فتح وشامی وغیرہما کے، خلاف دیانت وعقل ہے۔ کما صرح فی التوشیح اذ ا رجع عنہ المجتھد لا یجوز الاخذ بہ۔

خامساً آپ کا فرمانا اذا تعارض اماما ن الخ۔ محرر صاحب! اولاً تو یہ مسئلہ ہی اختلافی ہے۔ جس درمختار سے آپ سند لائے، اس میں ہی مرقوم ہے: " وقال شیخنا الرملی فی فتاویہ وبعض اللفظ اکد من بعض (الیٰ ان قال) والاصح اکد من الصحیح ۔"

ردالمحتار میں ہے: "قولہ اکد من بعض ای اقویٰ فتقدم علی غیرھا" "یعنی علامہ خیرالدین رملی نے اپنے فتاوی خیریہ لنفع البریہ میں فرمایا کہ علامات افتا کے بعض الفاظ بعض سے اقویٰ ہوتے ہیں جیسے اصح کہ اقویٰ ہے صحیح سے تو یہ صحیح پر مقدم کیا جائے گا"۔

شرح عقود میں علامہ شامی قدس سرہ السامی فرماتے ہیں: " وکذا لو صرح فی احداھما بالاصح وفی الاخریٰ بالصحیح فان الاولیٰ آکد من الصحیح اہ قد بینا معنی الآکد من الطحاوی۔"

سادساً ذرا یہ تو ارشاد ہو کہ یہاں صحیح اور اصح میں اختلاف کہاں؟ بلکہ اسی روایت کو بعض علماء نے اوجہ لکھا کما فی الدر۔ محقق علی الاطلاق ابن ہمام نے فتح القدیر میں وجیہ فرمایا، فافھم۔ صاحب یہاں تو ظاہر الروایۃ اور غیر ظاہر الروایۃ میں اختلاف ہے۔ جہاں ظاہر الروایۃ ہی پر افتا متعین جسے آپ نے پس پشت ڈال کر یا اپنے پرانے کی نقل بنا کر جہل اور خرق اجماع کی راہ لی ولا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم۔

جب آپ اعتقادیات میں اہل سنت کیا بلکہ اہل اسلام کے مخالف ہیں۔ اس شخص کے جس کے گلے میں علماء عرب، وعجم نے تکفیر کی طوق ڈالی ہو، مرید مستفید تو پھر آپ کو ان مسائل میں جو فقہیہ ہیں، جو مابین ہمارے علماء کے مختلف فیہ ہو، قیل وقال کی کس عقلمند نے راہ بتائی؟ اگر اپنے زعم میں فقیہ ہو، کچھ تحریر کرنا چاہتے ہو، تو چشم ما روشن دلِ ماشاد۔ کلمہ پڑھو، علمائے حرمین محترمین کے موافق اپنے عقاید بناؤ، تب ان باتوں میں پڑنا ورنہ ایسی ہی خرافات پر جمے رہو۔ ان اختلافی فرعیات میں بحث کرنا تو احمق نمبر ۲ بننا ہے۔ جیسے کوئی قادیانی یا ہندو کسی سنی حنفی سے مناظر ہو اور کہے کہ آمین بالجہر کہنا چاہئے یا بالاخفاء؟ تو ہر ادنیٰ عقل والا بھی کہے گا کہ ارے او مسخرے! پہلے اسلام لا، سنی بن، پھر ان باتوں میں منھ کھولنا۔ اللہ تعالیٰ اصدق الصادقین کی تکذیب کریں، حضور اقدس افضل الناس واعلم الناس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی توہین کریں، ابلیس لعین کے علم کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے علم سے زیادہ بتائیں اور فقہیات میں خامہ فرسائی کریں؟ اپنے کو پانچویں سواروں میں بتلائیں؟۔ ع شرم بادت از خدا و از رسول۔

ایسے جاہل مطلق جو آداب مفتی سے محض جاہل اور اس پر طرہ تحریر کا شوق کرے، تو اس سے فتاویٰ عالمگیریہ، اذا تعارض اماماں، در المختار، حررہ العبد محمد ابراهیم سنی حنفی چشتی رشیدی، لکھنے کی کیا شکایت؟ ان سب میں الف تو ہضم ہوا ہی تھا لام تو ٹیڑھی کھیر تھا مگر حافظ جی اسے بھی چٹ کر بیٹھے۔ بالجملہ جواب اول صحیح ہے اور تحریر ثانی غلط صریح، جہل قبیح ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم وعلمہ اتم واحکم۔

کتبہ عبدہ العاصی الفقیر ظفر الدین احمد عفی عنہ بمحمد المصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم

☆☆☆☆☆

مسئلہ مرسلہ حافظ نبی بخش صاحب محصل چندہ مدرسہ اشاعت العلوم بریلی ۱۲ صفر ۱۳۲۳ھ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ ایک شخص بعد تکبیر اولیٰ کے جماعت میں شریک ہوا اور امام نے قراءت شروع کردی تو اس شخص کو سبحان (ثنا) پڑھنا چاہئے یا نہیں اور اگر پڑھے تو کس وقت پڑھے؟ بینوا وتوجروا۔

الجواب

صلوٰۃ جہریہ میں جب امام نے قراءت شروع کردی تو مقتدی ثنا نہ پڑھے بلکہ چپکا سنے۔ لان الاشتغال بہ یفوت علیہ الاستماع والانصات وکلاھما فرض والثنا سنۃ فترک السنۃ ھو المتعین دون ترک الفرض۔

منیہ میں ہے: "اذا ادرک الامام وھو یجھر یستمع وینصت" جب امام کو قراءت جہریہ کرتا ہوا پائے تو چپکا سنتا رہے۔

غنیۃ میں ہے: "لا یاتی بہ مطلقا لاطلاق النص" یعنی جب امام کو فاتحہ پڑھتا ہوا پائے تو مطلقا ثنا نہ پڑھے بوجہ مطلق ہونے نص کے۔ "وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا۔" (الاعراف: ۲۰۴) "اور جب قرآن پڑھا

جائے تو اسے کان لگا کر سنو اور خاموش رہو‘‘ (کنزالایمان)۔

حلیہ میں امام شمس الدین حلوائی سے ہے:’’لا یاتی بالثناء فیما اذا ادرکہ فی حالۃ القیام فی الرکعۃ الاولیٰ‘‘ ’’ثنا نہ پڑھے جبکہ امام کو پہلی رکعت کے قیام میں پڑھتے پائے‘‘۔

خزانۃ المفتیین میں ہے:’’المسبوق اذا ادرک الامام فی القراءۃ التی یجھر بھا لا یاتی بالثناء وقد مر۔‘‘

فتاویٰ عالمگیریہ میں ہے:’’اذا ادرک الامام فی القرائۃ فی الرکعۃ التی یجھر بھا لا یاتی بالثناء کذا فی التبیین ھو الصحیح کذا فی التجنیس وھو الاصح ھکذا فی الوجیز للکردری۔‘‘ واللہ تعالیٰ اعلم وعلمہ اتم واحکم

☆☆☆☆☆

مسئلہ مرسلہ حافظ عبدالحکیم صاحب مقام اکلہ رسول پور میرٹھ ۱۲ ربیع الثانی ۱۳۲۳ھ

چہ می فرمایند علمائے دین دریں شکوک لاحقہ ومسائل مسئولہ ادامھم اللہ تعالیٰ فی اقام الدین و الشریعۃ غیر مقلدین وہابیہ سفر وحضر میں مدام نماز دو دو وقت میں ملا کر پڑھتے ہیں یعنی نماز ظہر دو بجے پڑھی تو اس کے ساتھ ہی نماز عصر پڑھتے ہیں وعلیٰ ہذا مغرب کے ساتھ ہی عشاء پڑھتے ہیں۔ آیا یہ کیسا ہے اور پیغمبر خدا نے عذراً یا بلا عذر، اول اسلام یا آخر عمر میں ایک بار یا ہمیشہ یہ عمل رکھا؟

الجواب

ظہرین عرفہ وعشائین مزدلفہ کے سوا دو نمازوں کا قصداً ایک وقت میں جمع کرنا سفراً وحضراً ہرگز کسی طرح جائز نہیں۔ قرآن عظیم اور احادیث صحاح حضور سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم اس کی ممانعت پر شاہد عدل ہیں۔ اور یہی مذہب صحابہ کرام سے حضرت امیر المومنین عمر فاروق رضی اللہ عنہ وحضرت سعد بن ابی وقاص وحضرت عبداللہ بن مسعود وحضرت عبداللہ بن عمر فاروق وحضرت سیدتنا ام المومنین صدیقہ بنت الصدیق رضی اللہ عنھم اجمعین اور تابعین سے خلیفہ راشد عمر بن عبدالعزیز وامام سالم بن عبداللہ بن عمر وعلقمہ بن قیس واسود بن یزید وحسن بصری وابن سیرین وابراہیم نخعی وامام مکحول وجابر بن زید وعمرو بن دینار وحماد بن ابی سلیمٰن وامام اجل سراج الملۃ والدین امامنا الاعظم ابوحنیفہ اور یہی مذہب قاضی ابو یوسف وامام ابوعبداللہ محمد شیبانی وامام زفر وامام حسن بن زیاد وغیرھم تبع تابعین وائمہ دین رحمۃ اللہ علیھم اجمعین کا ہے۔ ان لوگوں کا نماز ظہر دو بجے پڑھنا اور اس کے ساتھ ہی نماز عصر ملا دینا، کسی طرح جائز نہیں۔ اور اس صورت میں نماز عصر ضائع وناکارہ رہ جائے گی۔ جیسے کوئی آدھی رات سے صبح کی نماز، پہروں چڑھے سے ظہر پڑھ رکھے، قطعاً نہ ہوگی۔ یونہی ظہر کے وقت عصر یا مغرب کے وقت عشا بنا لینے سے بھی نہ ہونا واجب۔ احادیث میں کہ حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم سے جمع منقول، اس میں صراحۃً جمع صوری (یعنی واقع میں ہر نماز اپنے وقت میں واقع ہو مگر ادا میں مل جائیں جیسے ظہر آخر وقت میں پڑھی کہ اس کے ختم پر وقت عصر آ گیا، اب ظہر آخر وقت، عصر اول وقت میں پڑھ لی تو دونوں نمازیں اپنے اپنے وقت

میں ہوئیں اور فعلاً وصورۃً مل گئیں تو ایسا ملانا بعذر مرض وضرورت سفر بلا شبہ جائز ہے۔) مذکور یا مجمل ومحتمل جو اسی صریح مفصل پر محمول۔ بالجملہ جمع بین الصلاتین یعنی دو نمازیں ملا کر پڑھنا، دو قسم ہے۔ صوری ومعنوی۔ اور ثانی بھی دو صورت پر مشتمل۔ جمع تقدیم کہ وقت کی نماز مثلاً ظہر یا مغرب پڑھ کر اس کے ساتھ ہی متصلا بلا فصل پچھلے وقت کی نماز عصر یا عشا پیشگی پڑھ لیں۔ اور جمع تاخیر کہ پہلی نماز مثلاً ظہر یا مغرب کو باوصف قدرت واختیار قصداً اٹھا رکھیں کہ جب اس کا وقت نکل جائے تب دوسری نماز کے ساتھ جمع کر کے پڑھیں۔ پچھلی صورت بحالت اختیار صرف حجاج کو صرف عصر عرفہ ومغرب مزدلفہ میں جائز ہے۔ اول میں جمع تقدیم دوم میں جمع تاخیر۔ اور اول یعنی ہر نماز اپنے اپنے وقت پر ہو فقط صورتاً جمع ہو کہ پہلی اپنے وقت کے آخر اور دوسری، اپنے وقت کے اول میں ہو، یہ بلا شبہ جائز ہے اور اب بھی مرض وسفر میں اس کی اجازت ہے۔

ردالمحتار میں ہے:"للمسافر والمريض تاخير المغرب للجمع بينهما وبين العشاء فعلا كما فى الحلية وغيرها ان تصلى فى اخر وقتها والعشاء فى اوّل وقتها اه وهكذا تاخير الظهر الىٰ العصر بل هو اولىٰ كما صرح به فى البحر الرائق۔"

کتاب الحج میں ہے:"قال ابو حنيفة رحمه الله تعالىٰ الجمع بين الصلاتين فى السفر فى الظهر فى العصر والمغرب والعشاء سواء يوخر الظهر الىٰ اخر وقتها ثم يصلى ويعجل العصر فى اول وقتها فيصلى فى اول وقتها وكذلك المغرب والعشاء ويوخر المغرب الى اخر وقتها فيصلى قبل ان يغيب الشمس وذلك آخر وقتها ويصلى العشاء فى اول وقتها حين تغيب الشمس فهذا الجمع بينهما۔" وقد فصل هذه المسئلة عالم اهل السنة مجدد المائة الحاضرة فى كتاب مستقل سماها "حاجز البحرين الواقى عن الجمع بين الصلوٰتين" فمن اراد الاطلاع على ما فيها من الفوائد فليطالعها والله تعالىٰ اعلم۔

☆☆☆☆☆

مسئلہ از موضع کہر یا ضلع پیلی بھیت مرسلہ فضل حسین ۲۵ شعبان ۱۳۲۳ھ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین محمدی اس مسئلہ میں کہ ایک جگہ نماز جمعہ میں ہمیشہ امام اپنے برابر ایک صف جماعت کھڑی کرتا ہے۔ اور باوجود ہونے جگہ کے مسجد میں ہمیشہ برابر امام کے دونوں جانب یعنی دائیں بائیں صف کھڑا کرتا ہے۔ اور وہ اس کو صف اول کہتے ہیں اور سمجھتے ہیں۔ یہ نماز ادا ہوئی یا نہیں اور اگر ہوئی تو کس طرح ہوئی؟۔ بینوا توجروا۔
رقمہ فضل حسین زمیندار۔

الجواب

صورت مسئولہ میں نماز مکروہ تحریمی، واجب الاعادہ ہے۔ کیونکہ مقتدی جب دو سے زیادہ ہوں تو امام کو آگے بڑھنا واجب ہے اور ترک واجب مکروہ تحریمی۔ اور جو نماز کہ کراہۃ تحریمی کے ساتھ ادا کی جائے، اس کا لوٹانا واجب ہے۔
درمختار میں ہے:" وكذا كل صلوٰة اديت مع كراهة التحريم تجب اعادتها۔ اسی میں ہے: (

والزوائد) بصف (خلفه) فلو توسط اثنين كره تنزيها وتحريما او اكثر وصرح به الهداية والكافى والبداية والتبيين والفتح ومجمع الانهر والمستخلص وابو السعود" جتنی نمازیں اس طرح پر پڑھی ہیں، سب دہرائی جائیں اوراس کے بدلے چار رکعت ظہر ادا کی جائے۔ والمسئلة فى الدر المختار ورد المحتار وغيرهما من معتمدات الاسفار۔ والله تعالىٰ اعلم وعلمه اتم واحكم

☆☆☆☆☆

مسئلہ مرسلہ حافظ نبی بخش سرائے خادم بریلی ۷ ربیع الثانی از تلہر ضلع شاہجہان پور ۱۳۲۳ھ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین دریں مسئلہ کہ اگر امام نے دو رکعت کے بعد سلام پھیر دیا، باقی دو رکعتوں میں مقتدیوں کو سورہ فاتحہ کا پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟ اور اگر کوئی آخر کی دو رکعتوں میں پڑھے، درمیان شرع شریف کے اور مذہب امام اعظم رضی اللہ عنہ کے ہوگی یا نہیں؟ اور اگر امام مسافر کے پیچھے کوئی شخص التحیات میں شریک ہو تو وہ اپنی نماز کس طرح ادا کرے؟ بینوا توجروا۔

الجواب

صورت مستفسرہ میں موافق مذہب اصح، باقی دو رکعتوں میں فاتحہ نہ پڑھیں۔ صرف اتنی دیر خاموش کھڑے رہیں اور کسی نے پڑھی تو نماز ہو جائے گی، نہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں بلکہ بعض کا یہی مذہب ہے اگرچہ ضعیف ہے۔

ملتقی الابحر میں ہے: "واقتداء المقيم به (اى المسافر) صحيح فيهما ويقصر هو ويتم المقيم بلا قراءة فى الاصح۔" مقیم کی اقتداء مسافر کے لئے وقت، غیر وقت دونوں میں صحیح ہیں۔ مسافر قصر کرے اور مقیم بلا قرأت اپنی نماز تمام کرے۔

تنویر الابصار میں ہے: "وصح اقتداء المقيم بمسافر فى الوقت وبعده فاذا قام (المقيم) الى الاتمام لا يقرء فى الاصح۔"

غنیۃ شرح منیہ میں ہے: "ولو اقتدىٰ المقيم بالمسافر صح سواء كان فى الوقت او خارجه لعدم المانع فاذا صلىٰ المسافر ركعتين سلم ويقوم المقيم فيتم صلاته بغير قراءة فى الاصح وقيل يتم بقراءة لانه منفرد۔"

فتاویٰ عالمگیریہ میں ہے: "وان صلىٰ المسافر بالمقيمين ركعتين سلم واتم المقيمون صلاتهم كذا فى الهداية وصاروا منفردين المسبوق الا انهم لا يقرؤن فى الاصح هكذا فى الصغيرى والتبيين والبحر وملا مسكين۔"

اور اگر امام مسافر کے پیچھے التحیات میں شریک ہو تو بعد سلام امام مثل سائر مسبوقین لاحق اپنی نماز ادا کرے۔ یعنی بعد سلام امام کھڑا ہو کر دو رکعتیں بلا قرأت بقدر فاتحہ محض سکوت کے ساتھ ادا کرے اور ان پر قعدہ کرکے دو رکعتیں مع قرأت پڑھے، جن میں تیسری کو سبحنك اللهم سے شروع کرے اور اگر عکس کیا یعنی بعد سلام امام پہلی دو رکعت با قراء

ت ادا کی پھر دو بسکوت تو مذہب مفتیٰ بہ پر نماز ہو جائے گی مگر گنہگار ہوگا۔

درمختار میں ہے: ”اللاحق من فاتته الرکعات کلها او بعضها لکن بعد اقتدائه کمقیم ائتم بمسافر وحکمه کمؤتم فلا یاتی بقراءة ولا سهو ویبدء بقضاء ما فاته عکس المسبوق ثم ما سبق به بها ان کان مسبوقا ایضا ولو عکس صح واثم لترك الترتیب۔“

ردالمحتار میں ہے: ”قوله ما سبق به بها ثم صلی اللاحق ما سبق به بقراءة ان کان مسبوقا ایضا بان اقتدیٰ فی اثناء صلاة الامام ثم نام مثلاً وهذا بیان للقسم الرابع وهذا المسبوق اللاحق وحکمه ان یصلی اذا استیقظ مثلا ما نام فیه ثم یقضی ما فاته فلو عکس بان یبتدء بما سبق بما نام صح واثم اه ملتقطا“ (الدر المختار ملخصا علی هامش رد المحتار ج ص ۵۹۴ الیٰ ۵۹۶۔) والله اعلم

☆☆☆☆☆

مسئلہ گورکھپور متصل جامع مسجد مرسلہ مولوی عبدالقیوم صاحب ۸ جمادی الاولیٰ ۱۳۲۳ھ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین دریں مسئلہ کہ ایک شخص بہرا ہے اور کریہہ الصوت اور دوسرا شخص بہرا نہیں یعنی حواس خمسہ اس کے صحیح ہیں اور نہ کریہہ الصوت ہے بلکہ اس دوسرے شخص کی قراءت وتجوید بہ نسبت بہرے کے بہتر ہے تو بحالت مساوی اعلم ہونے کے ان دونوں آدمیوں میں شرعاً مرجح ولائق امامت کون ہو سکتا ہے؟ بینوا بالبراهین والکتاب توجروا یوم الحساب۔

الجواب

اگر اور باتوں میں وہ مساوی ہوں تو شخص ثانی احق بالامامۃ ہے۔

ہندیہ میں ہے: کل من کان اکمل فهو افضل لان المقصود کثرة الجماعة ورتبة الناس فیه اکثر هکذا فی التبیین۔ بالجملہ غرض شارع کی تکثیر جماعت ہے تو چاہئے کہ احسن الصوت، کریہ الصوت پر مقدم کیا جائے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

الجواب صحیح اور ایک وجہ فضیلت اسے اس پر یہ ہے کہ اگر امام سے غلطی واقع ہو اور مقتدی اس کی اصلاح کرے تو بہرے کو سننا مشکل ہوگا مگر دیگر امور اہم مثل صحت عقیدہ وغیرہ میں مساوات کے بعد اسے دیکھیں گے، کما اشار الیه المجیب سلمه الله تعالیٰ والله تعالیٰ اعلم۔ فقیر احمد رضا قادری غفرلہ

☆☆☆☆☆

مسئلہ از موضع .... ڈاکخانہ کرتھا، ضلع گیا۔ ۲۱ رشوال ۱۳۳۱ھ

جناب مولانا! جواب سوالات ذیل بہ سند صحیح کتاب معتبر حنفی المذہب قول مفتیٰ بہ آگاہ فرمائیے۔

(۱) امامت ولد الحرام مکروہ تحریمی ہے یا تنزیہی؟ نماز اس کے پیچھے جائز یا ناجائز اور امامت صحیح یا غیر صحیح؟

(۲) صحیح النسلوں میں ولد الحرام افقہ ہے، امامت کے لئے کون افضل ہوگا؟

(۳) امام نے ارکان نماز فرائض، واجبات وغیرہ بلا مفسدات مقام پر ادا کیا۔ جماعت میں مقتدی دو قسم کے ہیں۔ بعض اس کی امامت سے رضامند اور بعض ناخوش و بے زار۔ ان میں سے کس طبقے کی نماز صحیح ہوگی، امام کی نماز کی کیا حالت ہوگی بوجہ بیزاری قوم؟

(۴) حدیث ابوداؤد ''ولا یقبل اللہ صلوۃ من تقدم قوما وھم لہ کارھون'' کا کیا مطلب ہے؟ یہ حدیث صحیحین میں ہے یا نہیں؟ محل توارد حدیث، اصول جانچ و پرتال حدیث سے جس میں درآمد بھی داخل ہے، کیا حکم رکھتی ہے؟ قسم و مدارج حدیث قوی وضعیف عمل درآمد علمائے حنفی المذہب کا اس پر اعادہ امامت، رواۃ ورجال حدیث کے کل ثقہ و محفوظ ہیں یا بعض مجروح و مخدوش؟ یہ حدیث تہدیداً یا حکماً امام کے حق میں ہے یا اور کے؟ اور ''من تقدم قوما'' سے کیا مطلب؟ آیا امام نماز مراد ہے یا اور؟ اور ''کارھون'' سے کیا مطلب؟ کس چیز سے ناخوشی وکراہت؟

الجواب

(۱) امامت ولد الزنا جائز و صحیح، مکروہ بہ کراہت تنزیہی ہے۔

حدیث میں ہے: ''صلو اخلف کل بر وفاجر''۔

درمختار میں ہے: ''ویکرہ تنزیھا امامۃ عبد (الیٰ ان قال) وولد الزنا''۔

منحۃ الخالق حاشیۂ بحر الرائق شامی میں ہے: ''قال الرملی: ذکر الحلبی فی شرح منیۃ المصلی ان کراھۃ تقدیم الفاسق والمبتدع کراھۃ التحریم واما العبد الاعرابی وولد الزنا والاعمیٰ فالکراھۃ فیھم دون الکراھۃ فیھما''۔

ہدایہ میں ہے: ''ویکرہ تقدیم العبد (الی ان قال) وولد الزنا وان تقدموا جازاہ مختصراً۔

مراقی الفلاح شرح نور الایضاح میں ہے: ''وکرہ امامۃ العبد والاعمیٰ والاعرابی وولد الزنا الجاھل فقط''۔

(۲) ولد الحرام جو افقہ ہو، اگر وہ محتقر میں نہیں، وہی امامت کے لئے افضل ہے۔ کیونکہ کراہت اس کی بے علمی عادی یا علیٰ اختلاف الاقوال نفرت حقار کی وجہ سے ہے۔

مراقی الفلاح میں بعد عبارت مسطورہ لکھا: ''الذی لاعلم عندہ ولا تقویٰ فلذا قیدہ مع ماقبلہ بقولہ: ''الجاھل'' اذ لو کان عالما تقیا لا تکرہ امامتہ لان الکراھۃ للنقائص''۔

حاشیۂ طحطاویہ میں ہے: ''فلو کان عندہ علم لا کراھۃ''۔

بحرالرائق میں ہے: ’’وولد الزنا اذا کان افضل القوم فلا کراھة اذالم یکونا محتقرین بین الناس لعدم الکراھة‘‘ فقط۔

(۳) نماز امام وہر دو قسم کے مقتدیوں کی صحیح ہے۔ البتہ کارہین کی کراہت امام کی کسی خرابی یا مقتدیوں کے احق بالامامت ہونے کی وجہ سے ہے تو ایسے شخص کو خود امام بننا مکروہ تحریمی ہے اور اگر وہ احق بالامامت ہے تو اصلاً کراہت نہیں بلکہ ایسے شخص کی امامت سے کراہت کرنا خود ہی مکروہ ہے۔

درمختار میں ہے: و لو امّ قوما وھم کارھون ان الکراھة لفساد فیه او لانھم احق بالامامة منه کرہ له ذلك تحریما لحدیث ابی داؤد: ’’لایقبل الله صلوة من تقدم قوماً وھم له کارھون‘‘، وان ھو احق لا والکراھة علیھم‘‘۔

(۴) یہ حدیث صحیحین میں حقیر کی نظر سے نہیں گذری بلکہ انہیں لفظوں سے سنن ابی داؤد وابن ماجہ میں حضرت عبداللہ عمرو بن عاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بسند ضعیف مروی ہے۔ نیز ترمذی شریف میں ابوامامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ان لفظوں سے مروی ہے: ’’فلانه لاتجاوز صلاتھم اذانھم العبد الآبق حتیٰ یرجع وامرأة بانت وزوجھا علیھا ساخط و امام قوم وھم له کارھون‘‘۔ امام ترمذی نے فرمایا: ’’حسن غریب‘‘۔

نیز طبرانی نے معجم کبیر میں حضرت طلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ان لفظوں سے روایت کیا: ’’ایما رجل امّ قوماً وھم له کارھون لم تجز صلاته‘‘۔

نیز طبرانی شریف میں حضرت جنادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ان لفظوں سے مروی ہے: ’’من امّ قوما وھم له کارھون فان صلاته لا تتجاوز ترقوته‘‘۔

نیز جمع الجوامع پھر کنزالعمال میں بروایت ابوعبید، حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی: ’’انه اتاہ قوم برجل قالوا ان ھذا یؤمّنا ونحن له کارھون فقال له لخروط۔ أتؤمّ قوماً وھم لك کارھون‘‘۔

نیز اس حدیث کو بیہقی وعراقی نے حضرت علی ابن ابی طالب اور اسود بن ہلال سے معنیً روایت کیا ہے۔ پس حدیث ابوداؤد اگرچہ ضعیف ہے مگر بوجہ تعدد طرق، جبر نقصان ہوکر لااقل حسن ٹھہرے گی۔ حدیث مذکور اگرچہ بظاہر تحریم ونفی قبول نماز پر دال ہے مگر علما سے بعض ظاہر پر حمل کر کے حرمت کی طرف گئے ہیں اور بعضوں نے تہدید پر حمل کر کے کراہت کا فتویٰ دیا ہے۔ مگر یہ کراہت اسی صورت میں ہے جب کراہت ونفرت کسی امر دینی وسبب شرعی کی وجہ سے ہو اور دنیوی خصومت یا نفسانیت کی وجہ سے کراہت کا اصلاً اعتبار نہیں بلکہ ایسا خیال خود ہی مذموم ہے، کما مر عن الدر المختار۔

شرح جامع صغیر میں حدیث ترمذی نقل کر کے لکھا: "وھم لہ کارھون لمعنی مذموم عنہ شرعا لان الامامۃ شفاعت ولا یستشفع العبد الا من یحبہ"۔ "تقدم قوما" سے امام بننا اور نماز پڑھانے کو آگے بڑھنا مراد ہے۔ واللہ تعالی اعلم۔

☆☆☆☆☆

مسئلہ از ملک پنجاب ضلع گجرانوالا مرسلہ محمد حیدر صاحب یکم جمادی الاولی ۱۳۲۳ھ

الحمدللہ وحدہ والصلوٰۃ والسلام علی من لا نبی بعدہ۔ اما بعد

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔

جناب کے پاس ایک استفتا بہ نشان ذیل آیا ہوگا: "ضلع گجرانوالا تحصیل وزیر آباد موضع پیھرو کی ملک پنجاب"۔ وہ میرے واسطے ہی لکھا ہے۔ مجھ کو ہی کہتے ہیں کہ اس کے پیچھے نماز درست نہیں، یہ آمین بالجہر کرتا ہے و رفع یدین کرتا ہے وغیرہ وغیرہ اور ضاد کو مشابہ دال کے نہیں پڑھتا ہے۔ خالصاً لوجہ اللہ ونصحا لخلق اللہ ٹھیک ٹھیک لکھ دیجئے گا۔ مجھ کو ان لوگوں نے تنگ کر رکھا ہے۔ میرے پیچھے نماز جنازہ بھی نہیں پڑھتے۔ اگر استفتا نہیں آیا ہو تو براہ مہربانی اس کارڈ پر لکھ دیجئے گا کہ آیا جو شخص ضاد کو اپنے مخرج سے نکالے اور وہ مشابہ دال نہ پڑھے اور رفع یدین اور آمین بالجہر وغیرہ کرے آیا ایسے کے پیچھے نماز درست ہے یا نہیں؟ جزاکم اللہ تعالیٰ عنا خیر الجزاء علاوہ اور علوم کے علم حدیث مولانا نذیر حسین صاحب سے پڑھی ہے۔ مفصل فتویٰ ہو اور میرے حال پر رحم کیجئے گا۔ اطلاعاً گذارش کردی ہے۔

العاجز المدعو محمد حیدر علی عفی عنہ۔

الجواب

الحمد لاھلہ والصلوٰۃ علی اھلھا فالسلام علی من اتبع الھدی۔ ایک استفتا ضلع گجرانوالا سے ضرور آیا ہوا ہے۔ جس کا جواب بوجہ کثرت کار و مشاغل افکار اس وقت تک معرض تعویق میں رہا۔ آمین بالجہر و رفع یدین منکر تقلید سے ضرور آیت بدمذہبی ہے۔ جس کے کرنے والوں کو بسبب انکار تقلید و دیگر عقاید فاسدہ کے ہرگز حق امامت حاصل نہیں بلکہ اس کے پیچھے نماز ناجائز و گناہ اور اگر پڑھ لی تو واجب الاعادہ کہ مکروہ تحریمی ہوئی کہ ایسا شخص فاسق بالاعتقاد ہے اور امام بنانا تعظیم۔ وقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من وقر صاحب بدعۃ فقد اعان علی ھدم الاسلام

بلکہ بہتیرے وجوہ سے نماز محض باطل کما حققہ حضرۃ مجدد المائۃ الحاضرۃ فی الرسالۃ المبارکۃ "النھی الاکید عن الصلوٰۃ وراء عدی التقلید۔" نیز مسئلہ ضاد کی تحقیق بھی اعلیٰ حضرت مدظلہم الاقدس نے رسالہ "الجام الصاد عن سنن الضاد" میں فرمائی ہے، جس کے مطالعہ سے حق ظاہر ہو جائے گا۔ مولوی نذیر حسین صاحب بھی انہیں غیر مقلدین میں سے تھے۔ اگر آپ ان کے ہم عقیدہ ہیں تو ہرگز آپ کے پیچھے نماز درست نہیں۔ اور اگر آپ کو خاص ان مسائل میں اشتباہ ہے تو کتب فقہیہ کا مطالعہ کیجئے یا بندہ کے پاس تشریف لے آیئے۔ اور باوجود انکار تقلید شافعیت کی آڑ

تحر الیٰ غائۃ البوار ونہایۃ الخسار ۔واللہ تعالیٰ اعلم۔

☆☆☆☆☆

مسئلہ از شہر مرسلہ............ ۱۲ شعبان ۱۳۲۳ھ

کیا فرماتے ہیں علماء دین کہ زید مسلمان دیندار اہلسنت وجماعت سے ہے۔اس کا خویش کہ پہلے اہلسنت سے تھا، بالفعل صحبت مریدان قادیان سے قادیانی ہوگیا۔ حالانکہ مرزا قادیان کو دیکھا بھی نہیں ہے۔اعتقاد فاسد ہوگیا اور اس کی زوجہ یعنی زید مذکور بالا کی دختر ہنوز دین اہلسنت پر قائم ہے۔اس واسطے زید مذکور نے اپنے خویش قادیانی سے ملنا اور بولنا ترک کردیا ہے اور اپنی دختر سے ملتا ہے اور اس کے بچوں نابالغ کو دیتا لیتا ہے۔اس صورت میں زید مذکور بالا کے پیچھے نماز درست ہوگی یا نہیں؟ بینوا بالصواب توجروا یوم الحساب۔

الجواب

قادیانی کہ اپنے لئے رسالت ونبوت کا مدعی اور انبیاء اور خصوصاً عیسیٰ روح اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو کھلی گالیاں دینے والا ہے قطعاً یقیناً اجماعاً سخت مرتد وسخت عدو اللہ، سخت دشمن اسلام ہے۔اس کا مرید ہونا تو نہایت عظیم آفت ہے۔جو اس کے کفری عقائد پر مطلع ہوکر اسے مسلمان جانے ،وہ ہرگز مسلمان نہیں ۔جو شخص اس کا مرید ہو، اس کی عورت فوراً اس کے نکاح سے نکل جاتی ہے۔اس کے ساتھ صحبت، زنائے محض ہوتی ہے۔خواہ عورت دین اسلام پر قائم رہے یا وہ بھی اسی کے ساتھ ہوجائے۔ ہر طرح زنائے محض ہے۔

عالمگیریہ میں ہے:" (ومنھا ای من الوجوہ الاربعۃ) ما ھو باطل بالاتفاق نحو النکاح فلا یجوز لہ ان یتزوج امرءۃ مسلمۃ ولا کتابیۃ ولا ذمیۃ ولا حرۃ ولا مملوکۃ۔"

پس ایسی صورت میں اگر عورت بھی اسی مذہب پر ہوجائے ،جب تو ظاہر کہ باپ پر فرض ہے کہ اسے چھوڑ دے ۔اور اگر عورت دین حق پر قائم بھی رہے تو باپ پر فرض ہے کہ اگر قدرت رکھتا ہو، اسے زنا سے بچائے اور قدرت نہ رکھتا ہو تو عورت کو تفہیم کرے کہ اسے چھوڑ دے۔ان احکام میں سے جس کی تعمیل نہ کرے گا، گناہگار ہوگا۔ پہلی دوصورتوں میں تو صریح فاسق ،شدید مرتکب کبیرہ ہے۔اس کے پیچھے نماز ممنوع وگناہ اور صورت آخرہ میں کراہت سے خالی نہیں ۔ قال اللہ تعالی: "وَاِمَّا يُنسِيَنَّكَ الشَّيْطَانُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرَىٰ مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۔(الأنعام : ٦٨) ''اور جو کہیں تجھے شیطان بھلادے تو یاد آئے پر ظالموں کے پاس نہ بیٹھ۔(کنزالایمان) حلبی اور صغیری اور کبیری میں ہے: "وفیہ اشارۃ الی ان انھم لو قدموا فاسقا یاثمون علیٰ ان کراھۃ تقدیمہ کراھۃ تحریم لعدم اعتنائہ بامور دینہ وتساھلہ فی الاتیان بلوازمہ"۔ واللہ تعالیٰ اعلم وعلمہ اتم واحکم۔

☆☆☆☆

(سوال دستیاب نہ ہوسکا ۱۲ ساحل)

بسم اللہ الرحمن الرحیم نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

(۱) استحقاق امامت کا دعویٰ محض باطل ہے۔ مسجد سنی حنفی المذہب کی بنائی ہوئی ہے۔ بانی کی اولاد سنی حنفی موجود ہے۔ امام ومؤذن مقرر کرنا، بانی مسجد اور اس کے بعد اس کی اولاد کا حق ہے۔

عالمگیری جلد اول ص ۲، فتاوی قاضیخان جلد اول ص ۳۳ پر ہے: "رجل بنیٰ مسجدا وجعله لله تعالیٰ فهو احق الناس بمرمته وعمارته وبسط البواری والحصر والقنادیل والاذان والاقامة والامامة ان کان اهلا لذلك فان لم یکن فالرأی فی ذلك الیه" (الاشباه والنظائر مع غمز العیون ص ۱۸۵) البانی اولیٰ بنصب الامام والمؤذن وولد البانی وعشیرته اولیٰ من غیرهم

(۲) عام اہل محلہ سنی حنفی ہیں۔ اور خود اہل محلہ میں اگر اختلاف ہو، بعض ایک امام کو چاہیں اور اکثر دوسرے کو، تو اکثر ہی کی رائے معتبر ہے۔ اگرچہ جسے بعض قلیل چاہتے ہیں، وہ اس سے قراءت میں افضل ہو۔

عالمگیری جلد اول ص ۳۰ پر ہے۔ اذا اختار بعضهم الاقرء واختار بعضهم غیره فالعبرة للاکثر کذا فی السراج الوهاج۔

(۳) مسجد جامع میں اقامت جمعہ اہل محلہ کے لئے ہے اور اس کا امام وخطیب مقرر موجود ہے، دوسرے کو اصلا اس میں حق نہیں۔ اگر سوا ان کے خطبہ پڑھے یا امامت کرے، ہرگز جائز نہیں۔

فتاویٰ عالمگیری جلد اول ص ۵۲ و ردالمحتار میں ہے: "خطب بلا اذن الامام والامام حاضر لم یجز۔"

فتاویٰ سراجیہ جلد اول ص ۲۹ میں ہے: "لو صلیٰ احد بغیر اذن الامام لا تجوز الا اذا اقتدیٰ به من له ولایة الجمعة۔"

(۴) غیر مقلدین اہل سنت سے خارج اور مبتدع ہیں۔

طحطاوی علی الدر المختار جلد ۴ ص ۱۵۳ میں ہے: "من کان خارجا عن هذه الاربعة فهو من اهل البدعة والنار۔" اور مبتدع کی امامت مکروہ وممنوع ہے۔

ردالمحتار جلد اول ص ۵۸۵ پر ہے: "المبتدع تکره امامته بکل حال۔"

طحطاوی مطبوعہ مصر جلد اول ص ۲۴۴ پر ہے: "الکراهة فیه تحریمیة علی ما سبق۔"

صغیری ص ۲۷۰ پر ہے: یکره تقدیم الفاسق کراهة تحریم وعند مالك لا یجوز تقدیمه وهو روایة عن احمد وکذا المبتدع۔

(۵) امام بنانا، تعظیم وتوقیر ہے اور امر دین میں مبتدع کی توقیر حرام ہے۔

مشکوٰۃ شریف مطبع مجتبائی دہلی ص ۳۱ پر ہے: "عن ابراهیم بن میسرة قال قال رسول الله صلی الله تعالیٰ علیه

وسلم من وقر صاحب بدعة فقد اعان علیٰ ھدم الاسلام۔" "جس نے کسی مبتدع کی توقیر کی اس نے اسلام کے ڈھانے پر مدد دی"۔

(۶) فاسق معلن کی امامت مکروہ وممنوع۔غنیۃ ص ۵۱۳ پر ہے: "لو قدموا فاسقا یاثمون۔" اور بدمذہبی ہر فسق سے بدتر فسق ہے۔

غنیۃ ص ۵۱۴ پر ہے: "یکرہ تقدیم المبتدع ایضا لانہ فاسق من حیث الاعتقاد وھو اشد من الفسق من حیث العمل۔"

ابوالسعود حاشیۂ کنز جلد اول ص ۲۰۸ پر ہے: "علل الزیلعی الکراھة فی الفاسق بان فی تقدیمه تعظیمه وقد وجب علینا اھانته شرعا فمفادہ کون الکراھة تحریمیة"۔

سنن ابن ماجہ ص ۷۲ا پر ہے: "عن جابر ابن عبد الله رضی الله تعالیٰ عنه قال خطبنا رسول الله صلی الله تعالیٰ علیه وسلم فقال یاایھا الناس (فذکر الحدیث الیٰ ان قال) ولا یؤم فاسق مؤمنا الا ان یقھرہ سلطان یخاف سیفه وسوطه۔" "یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبے میں بیان فرمایا: فاسق کسی مسلمان کی امامت نہ کرے۔مگر یہ کہ اس کو اپنی سلطنت کے زور سے مجبور کرے کہ اسے اس کی تلوار اور تازیانے کا ڈر ہو۔

یہاں غیر مقلدین کی سلطنت نہیں تو وہ محض ناجائز دباؤ ڈال کر ہماری مسجد میں استحقاق امامت قائم کرنا چاہتے ہیں۔

(۷) غیر مقلدین کی بدعت لزوم کفر تک پہنچی ہوئی ہے جس کا مفصل بیان مع ثبوت "کوکبہ شہابیہ" میں ہے اور ایسے اہل بدعت کے پیچھے نماز محض ناجائز ہے۔

فتح القدیر شرح ہدایہ مطبوعہ لکھنؤ جلد اول ص ۱۴۶ پر ہے: "روی محمد عن ابی حنیفة وابی یوسف ان الصلوٰة خلف اھل الاھواء لا تجوز۔"

شرح فقہ اکبر امام اعظم ابوحنیفہ ص ۵ پر ہے: "لا تجوز خلف المبتدع۔"

فواتح الرحموت شرح مسلم الثبوت ص ۵۱۹ پر ہے: "ان بدعتھم لما اشتدت الیٰ ان وصلت قریبا الیٰ الکفر اورثت شبھة فی ایمانھم فتمنع من الاقتداء بھم وحکم بفساد صلاة من اقتدیٰ بھم۔"

شرح فقہ اکبر ص ۱۸۷ پر ہے: "خیر منھم ببطلان الصلاة خلفھم احتیاطا"

(۸) حدیث نماز اہل نجران اگر صحیح وثابت ہو تو وہ کافر مستامن تھے،امان لے کر حاضر ہوئے تھے اور ایسے کفار سے تعرض منع ہے۔اس لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں مسجد میں نماز سے نہ روکنے دیا،حالانکہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے روکنا چاہا تھا۔

مواہب لدنیہ وشرح مواہب زرقانی مطبوعہ مصر جلد ۴ ص ۱۴۷ پر ہے: "(قاموا یصلون فیه فاراد الناس منعھم) لما فیه من اظھار دینھم الباطل بحضرة المصطفیٰ صلی الله تعالیٰ علیه وسلم وفی مسجدہ

(فقال صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم دعوہم) تالیفا لھم ورجاء اسلامھم ولدخولھم بامان فاقرھم علیٰ کفرھم ومنع من تعرض لھم فلیس فیہ اقرار علی الباطل۔"

امان لے کر آنے والے کفار پر مدعیان اسلام کا قیاس نہیں ہو سکتا۔ جن مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے مستامن کفار کے لئے یہ منقول ہے، انہیں نے مسلمانان تارک قربانی کو مسجد میں آنے سے منع فرمایا۔

ابن ماجہ ص ۵۸ پر ہے: "عن ابی ھریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم قال من کان لہ سعۃ ولم یضح فلا یقربن مصلانا۔"

انہیں نے کچا لہسن پیاز کھانے والے کو مسجد میں آنے سے منع فرمایا اور بقیع تک نکلوا دیا۔

صحیح بخاری شریف مطبع احمدی جلد اول ص ۱۱۸ پر ہے: "عن جابر بن عبد اللہ قال قال النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم من اکل ھذہ الشجرۃ یرید الثوم فلایغشانا فی مسجدنا۔ عن انس بن مالک قال قال النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم من اکل ھذہ الشجرۃ فلا یقربن ولا یصلین معنا۔"

صحیح مسلم جلد اول ص ۲۰۹ پر ہے: "عن ابن عمر ان رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم قال فی غزوۃ خیبر من اکل من ھذہ الشجرۃ یعنی الثوم فلا یاتین المساجد۔"

ایضاً ص ۲۰۱ پر ہے: "ان عمر ابن الخطاب خطب یوم الجمعۃ فذکر انکم ایھا الناس تاکلون شجرتین لا اراھما الا خبیثتین ھذا البصل والثوم ولقد رأیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا وجد ریحھما من الرجل فی المسجد امر بہ فاخرج الی البقیع۔"

کلمہ گو منافقین جمعہ کے مجمع میں ایک ایک کا نام لے کر مسجد سے نکلوا دیئے گئے۔

عمدۃ القاری شرح بخاری مطبوعہ قسطنطنیہ جلد ۴ ص ۲۲۱ پر ہے: "عن ابن عباس قال خطب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم یوم الجمعۃ فقال اخرج یا فلان فانک منافق واخرج یا فلان فانک منافق۔"

غیر مقلدین اگر حدیث نجران سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں تو پہلے اپنی کلمہ گوئی سے انکار کریں اور یہ ہی کافی نہیں بلکہ اپنے کافر اصلی ہونے کا ثبوت دیں۔ پھر سلطنت اسلام میں امان لے کر جائیں۔ سلطان اگر مناسب جانے گا تو انہیں بھی کفار نجران کی طرح چند روز امان دے گا اور اتنے دنوں اپنی مسجدوں میں نماز سے نہ روکے گا۔

(۹) غیر مقلدین کے نزدیک اگر وقف کا استحقاق ایسا عام ہے تو کیا وہ نوشتہ دے سکتے ہیں کہ ان کی مسجدوں میں ہنود ونصاریٰ و یہود و مجوس وروافض وغیرہم جو فرقہ چاہے جائے اور اپنے طور پر عبادت کرے۔ ناقوس پھونکیں، گھنٹے بجائیں، آگ جلائیں، چلیپا قائم کریں، انہیں کچھ انکار نہ ہوگا۔

(۱۰) انہیں حدیثوں سے ثابت ہوا کہ صرف کلمہ گو ہونے یا اپنے آپ کو مسلمان کہنے بلکہ مطلقاً مسلمان ہونے سے بھی مسجد میں آنے تک کا حق ثابت نہیں ہوتا۔ جماعت وامامت تو خاص بات ہے کہ آخر وہ منافق بھی کلمہ گو تھے، اپنے آپ کو غیر

مقلدین کی طرح مسلمان ہی کہتے۔ اور قربانی نہ کرنے یالہسن پیاز کھانے والے تو ضرور مسلمان ہیں۔ پھر بھی انہیں رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے مسجد میں آنے سے روکا اور نکلوا دیا۔

(۱۱) ہر شخص اپنے فریق کے لئے عبادت خانہ بناتا ہے۔ اور شرع نے مساجد میں انہیں کا حق مقدم رکھا ہے، جن کے لئے بانی نے مسجدیں بنائیں ولہذا اہل محلہ اپنی حاجت مقدم رکھنے کے لئے غیر اہل محلہ کو مسجد میں نماز سے منع کر سکتے ہیں۔

درمختار ہاشمی ص ۷۷ پر ہے: "لاهل المحلة منع من ليس منهم عن الصلوٰة فيه۔"

سنیوں حنفیوں کی بنائی ہوئی مسجدوں میں غیر مقلدین کا دعویٰ مساوات حق، جس کی بنا پر مزاحمت کر سکیں، بالکل بے بنیاد ہے۔

(۱۲) سنیوں حنفیوں نے مسجد بنائی اور اس کے نمازی ہیں اور ان ہی کا حق مقدم ہے۔ اور انہیں غیر مقلدین کے آنے سے ایذا پہنچتی ہے۔ ان کے خیالات منتشر ہوتے ہیں، ان کی نماز خراب ہوتی ہے۔ اور غیر مقلدین کی اپنی مسجد موجود ہے اور اس میں ان کی نماز ہو سکتی ہے اور ان کے نزدیک بھی حنفیوں کی مسجد میں پڑھنا، کچھ ان پر فرض، واجب نہیں تو اپنی عبادت اپنے معبد میں ہو سکتے ہوئے دوسروں کی مساجد پر جدید قبضہ چاہنا اور ان کا دل دکھانا اور ان کے حق مقدم میں دست اندازی کرنا، صریح مداخلت بیجا و آزار رسانی اور صاف بدنیتی پر مبنی ہے۔

(۱۳) غیر مقلدین، ہمارے ائمہ کو بُرا کہتے ہیں اور ان کی توہین کرتے ہیں۔ ہمیں مشرک بتاتے ہیں تو ہماری بنائی مسجدوں پر ان کا قبضہ کرنا، ہماری امامت کرنا، ہماری جماعت میں مل کر اپنی آوازوں اور حرکتوں سے اپنا غیر مقلد اور ہمارے اماموں کا دشمن، ہمارا مخالف ہونا، عین نماز میں جتانا، ضرور ناحق ایذا و آزار رسانی ہے۔ اور بحکم شرع ہماری مسجدوں میں ہمارا حق مقدم ہے۔ اور حدیث وفقہ کا حکم ہے کہ ایذا رساں کے لئے مسجد میں آنے کا حق نہیں اور یہ کہ مسجد سے نکال دیا جاوے۔

صحیح مسلم جلد اول ص ۲۰۹ پر ہے: "عن ابی هريرة قال قال رسول الله صلى الله تعالىٰ عليه وسلم من اكل من هذه الشجرة فلا يقربن مسجدنا ولا يوذينا بريح الثوم"۔ اس کے اخراج کی حدیث ابھی گزری۔

درمختار ص ۱۷۷ پر ہے: "يكره دخول اكل نحو ثوم ويمنع وكذا كل موذ ولو بلسانه۔"

الاشباہ مع غمز العیون ص ۳۸۱ پر ہے: "يكره لمن اكل ذا ريح كريهة ويمنع منه وكذا كل موذ فيه ولو بلسانه۔"

ردالمحتار جلد اول ص ۶۹۱ پر ہے: "قال الامام العينى فى شرحه على البخارى: علة النهى اذى الملئكة واذى المسلمين ولا يختص بمسجده صلى الله تعالىٰ عليه وسلم والحق بالحديث كل من اذى الناس بلسانه وبه افتىٰ ابن عمر وهو اصل فى نفى كل من يتاذىٰ به اه مختصرا۔"

(۱۴) مسجدیں اہل سنت حنفیہ بنائیں، وہی اس کے نمازی ہیں اور انہیں کا حق مقدم ہے۔ اور غیر مقلدین کا ان پر قبضہ

ہونا یقیناً، ان کی نفرت کا موجب ہے۔ اور شرع کا حکم ہے کہ جس شخص کے مسجد میں آنے سے اس کے نمازیوں کو نفرت ہو، وہ مسجد میں جانے کا حق نہیں رکھتا۔ وہ مسجد سے باز رکھا جائے گا۔ اس لئے جذامی ومبروص کو مسجد میں جانے سے منع فرمایا ہے حالانکہ بیماری میں ان کا اپنا کوئی قصور نہیں۔

ردالمحتار جلد اول ص ۲۹۲ پر ہے: "یلحق بما نص علیه فی الحدیث کل ما له رائحة کریهة ماکولا او غیره والقصاب والسمّاك والمجذوم والابرص اولیٰ بالالحاق وقال سحنون لا اریٰ الجمعة علیهما۔" (۱/۶٦۱ مطلب فی الغرس فی المسجد)

(۱۵) مسجدیں ہر فریق کی جدا ہیں اور ہر ایک اپنی مسجد میں اپنے طور سے عبادت کرسکتا ہے۔ کسی فریق کے نزدیک اپنی مسجد ہوتے ہوئے دوسرے کی مسجد میں پڑھنے کے لئے شرع کا کوئی حکم نہیں۔ ہم ان کی مسجد پر دعویٰ نہیں کرتے، وہ ہماری مسجد پر بالجبر قبضہ چاہتے ہیں۔ اور یہ امر حنفیہ کو ضرور اپنے مذہبی رو سے سخت آزاردہ ہے۔ اور غیر مقلدین کی وہ ایذائیں کہ بعض اوپر بیان ہوئیں، علاوہ ہیں۔ یہ امور باعث اشتعال فریقین ہوتے ہیں۔ جس کے سبب ملک میں بکثرت مقدمات ہوئے اور ہوتے رہتے ہیں۔ تو ان میں جو فریق اپنی مسجد ہوتے ہوئے دوسرے کی مسجد پر قبضہ چاہے، وہ ضرور فتنہ پھیلاتا اور اشتعال طبع دلاتا ہے۔ تو اس کو روکنا شرعاً وقانوناً ہر طرح لازم ہے۔ اگر کوئی مسجد میں کشت وخون کرنے جائے تو وہ ضرور شرعاً وقانوناً دخول مسجد سے باز رکھا جائے گا۔ اور اس وقت صرف اپنے مسلمان ہونے کو استحقاق دخول کی دستاویز نہیں بن سکتا۔ لیکن ہمارے رب عزّ وجل نے قرآن عظیم میں فرمایا ہے: "وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ" (البقرة: ۱۹۱) فتنہ قتل سے بھی سخت تر ہے۔ تو ایک فریق کے دوسرے کی مساجد میں جانے سے جب فتنہ اٹھے، جس کی نظیریں ملک میں بکثرت موجود ہیں۔ تو وہ اس ارادۂ قتل والے سے زیادہ مستحق باز رکھے جانے کا ہے۔ اور ہرگز شرعاً وقانوناً اسے ان مساجد میں جانے کا حق حاصل نہیں۔

(۱٦) غیر مقلدین اگر حنفیہ کی مسجدوں میں نہ آئیں تو یہ مساجد ویران نہ ہوں گی کہ ان کے بانی، ان کے نمازی، سنی حنفی، ان کے آباد کرنے والے کثیر ووافر ہیں۔ لیکن انہیں اگر حنفیہ کی مساجد پر قبضہ دیا جائے تو رعایا وملک کے بڑے حصے کو دو سخت ضرروں میں سے ایک ضرر ضرور پہنچے گا۔

۱- یا تو وہ اپنی نہ چھوڑیں اور غیر مقلدین کی مداخلت واقوال وافعال دل شکنی کے باعث فتنے اٹھیں اور مسجدیں ویران ہوکر جیل آباد ہوں۔

۲- یا حنفیہ اپنی عزت، اپنی عافیت عزیز رکھ کر اپنی مسجدیں چھوڑ بیٹھیں۔ ہر طرح غیر مقلدین کا قبضہ ان مساجد کی ویرانی کا سبب ہے۔ اور بحکم قرآن عظیم، جس کے آنے سے مسجدیں ویران ہوں، وہی ظالم ہے۔ اس کو مسجد میں آنے کی اجازت نہیں، وہ اس آیت کا مصداق ہے، اللہ سبحانہ فرماتا ہے: "وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ یُّذْكَرَ فِیْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِیْ خَرَابِهَا اُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ یَّدْخُلُوْهَآ اِلَّا خَآئِفِیْنَ" (البقرة: ۱۱۴) "اس سے بڑھ کر ظالم

کون جو اللہ کی مسجدوں کو ان میں نامِ خدا لئے جانے سے روکے اور ان کی ویرانی میں کوشش کرے؟ انہیں روا نہیں تھا کہ مسجدوں میں جائیں مگر خوف کھاتے۔

(۱۷) شارع عام اور اسی طرح سرِ راہ افتادہ غیر مملوک زمینوں میں قانوناً تمام رعایا کا حق بلا تفاوت یکساں ہے۔ سڑکیں، راہیں یا وہ زمینیں ہنود کی بنائی ہوئی ہیں، نہ مسلمانوں کی، نہ ان میں کوئی ان کا مالک یا کسی وجہ سے زیادہ حقدار ہے۔ بااین ہمہ قانوناً مسلمانوں کو وہاں قربانی کی ممانعت ہے۔ یہ قانون غیر مقلدین کو ہماری مسجدوں میں سے ممانعت کی ایک اعلیٰ نظیر قائم کرتا ہے۔ غیر مقلدوں کی نماز اگر ان کا امر مذہبی ہے، تو قربانی کیا ہمارا امر مذہبی نہیں؟ بفرض غلط اگر غیر مقلدین حنفیہ کی مساجد میں آ کر فتنہ نہیں اٹھاتے بلکہ حنفیہ ہی کو اشتعال طبع ہو کر فتنہ پیدا ہوتا ہے۔ تو مسلمان بھی سڑکوں پر قربانی کرنے میں ہرگز خود لڑائی کی ابتدا نہ کریں گے بلکہ ہنود ہی کو اشتعال طبع ہو کر فساد ہوگا۔ مسلمانوں کو اگر شارع عام پر قربانی کرنا ضرور نہیں بلکہ اپنے گھروں یا قرار دادہ مذبحوں میں ادا کر سکتے ہیں۔ تو غیر مقلدین کو بھی شرعاً حنفیہ کی مساجد ہی میں نماز پڑھنا ضرور نہیں۔ اپنی مسجد میں بلا تکلف پڑھ سکتے ہیں۔ پھر کیا وجہ کہ مسلمان شارع عام سے منع کئے جائیں، جس میں وہ حق مساوی رکھتے ہیں اور غیر مقلدین، حنفیہ کی مساجد سے نہ روکے جائیں، جن میں انہیں ہرگز حق مساوی بھی نہیں۔ بلکہ شارع عام درکنار مسلمان اپنے گھروں، اپنی خاص مملوک زمینوں میں قربانی سے باز رکھے جائیں، معدود مواضع مقرر دیئے جائیں، حالانکہ گھروں میں قربانی ہنود کے پیش نظر بھی نہ ہوگی۔ ایک قوم کا اشتعال طبع کہ سنی کی بناء پر فرض کرلیا جائے، دوسری قوم کو اپنا امر مذہبی خاص اپنے ملک میں بجالانے سے باز رکھے۔ اور غیر مقلدین کے آنے سے اشتعال طبع کہ خاص نظر کے سامنے اور وہ بھی ان مساجد میں جو حنفیہ کی بنائی ہوئی ہیں اور انہیں کا حق ان میں مقدم ہے، غیر مقلدوں کو ان مساجد سے منع نہ کرے؟ یہ انصاف سے بہت دور ہے۔

(۱۸) ہمارے اور غیر مقلدوں کے مذہب میں بہت اختلاف ہے۔ جس کی رو سے ہمارے مذہب میں ان کی نماز محض باطل و فاسد ہوتی ہے۔ وہ جب اپنے طرز کی نماز میں بھی ہمارے نزدیک خارج ہیں، فضول بے معنی حرکات کر رہے ہیں۔ ازاں جملہ غیر مقلدوں نے خون اور مردار اور شراب کو ناپاک نہ جانا۔ جیسا کہ ان کی مذہبی کتاب روضۂ ندیہ کے ص ۱۲ پر ہے۔ تو اگر غیر مقلد کے دامن میں سیر بھر گوشت مردار کا بندھا ہو اور خون نے ناک سے نکل کر تمام داڑھی اور سینے کو رنگ دیا ہو اور سارے چہرے پر شراب کا غازہ ملا ہو بلکہ شراب کے مٹکے میں غوطہ کھالیا ہو، نماز ہو جائے گی۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ نماز نہیں اور اشیائے مذکورہ سب ناپاک ہیں۔

عالمگیری جلد ۱ ص ۷۱ پر ہے: ”الخمر والدم والمیتة نجس نجاسة غلیظة هکذا فی فتاوی قاضی خان۔“ نیز غیر مقلدوں کا مسئلہ ہے کہ پانی کتنا ہی کم ہو، نجاست پڑنے سے ناپاک نہیں ہوتا جب تک رنگ یا مزا یا بو نہ بدل جائے۔ یہ مسئلہ بھی ان کی کتاب طریقۂ محمدیہ ترجمہ درر بہیہ مطبع فاروقی دھلی کے ص ۹۶، ۷ اور انہی کی دوسری کتاب فتح المغیث مطبع صدیقی لاہور کے ص ۵ پر موجود ہے۔ تو خون تو بڑی چیز ہے۔ اگر پاؤ بھر پانی میں دو چار ماشے اپنا یا کتے کا

پیشاب پڑ جائے، غیر مقلدوں کے نزدیک پاک رہے گا اور اس سے وضو نماز صحیح ہے۔ لیکن ہمارے مذہب میں اگر کسی عظیم الشان کنویں میں بھی ایک بوند نجاست پڑ جائے، سارا پانی ناپاک ہو جائے گا۔

عالمگیری ص ۸ جلد ا پر ہے: "فارة تفسخت فی الحب ثم صب قطرة من ذلك الماء فی البئر ینزح جمیعا كذا فی خزانة المفتیین"۔

نیز اسی فتح المغیث کے ص ۶ پر ہے: "کافی ہے مسح کرنا پگڑی پر" لیکن ہمارے مذہب میں پگڑی کا دھونا بھی کافی نہیں، سر کا مسح فرض ہے کہ قرآن عظیم میں فرمایا "وَامْسَحُوا بِرُءُوسِكُمْ" (المائدہ: ۶) "اور سروں کا مسح کرو" (کنز الایمان) اسی طرح بہت مسائل ہیں۔ تو اختلاف مذہب کی حالت میں انہیں کیونکر ہماری امامت کا استحقاق ہو سکتا ہے؟ بلکہ ایسی حالت میں اگر وہ ہماری صف میں کہیں آ کر شامل ہوں تو ہمارے مذہب میں اصلاً جائز نہیں۔ کہ جب وہ نماز سے خارج ہیں تو یہ ایسا ہوا کہ نماز کی صف بندھی اور بیچ میں ایک شخص بے نیت نماز حائل ہے۔ یہ قطع صف ہوا جو حرام ہے۔

سنن نسائی ص ۱۳۷ پر ہے: "عن عبد الله بن عمر ان رسول الله صلی الله تعالیٰ علیه وسلم قال من وصل صفا وصله الله ومن قطع صفا قطعه الله"۔

"یعنی رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فرماتے ہیں: جو صف کو وصل کرے، اللہ تعالیٰ اسے صلہ عطا فرمائے اور جو صف کو قطع کرے، اللہ تعالیٰ اسے قطع کر دے۔

تو غیر مقلدین کا ہمیں ان کے پیچھے نماز پڑھنے یا اپنی نماز میں انھیں شریک کرنے پر مجبور کرنا، صراحۃً ہمارے مذہب میں دست اندازی ہے۔ جس کا حق انھیں شرعاً و قانوناً کسی طرح حاصل نہیں۔

(۱۹)　قانون ہمیں ہرگز مجبور نہیں کرتا کہ ہم اپنے مذہبی خیالات سے باز رہیں یا ان کی مخالفت پر مجبور کیے جائیں۔ ہمارے مذہب میں غیر مقلدین، مبتدع بد دین ہیں۔ جس کا ایک ثبوت اوپر طحطاوی علی الدر المختار سے گذرا۔ اور اس بارے میں مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ تک کے علمائے کرام کے فتاویٰ موجود ہیں۔ اور حدیث میں ہے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فرماتے ہیں: "اهل البدع شر الخلق والخلیقة۔" "بدمذہب سارے جہان سے بدتر، بہائم سے بدتر ہیں۔

مسند امام احمد مطبوعہ مصر ہامش جلد اول ص ۱۱۰ پر ہے، نیز حدیث میں ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: "اصحاب البدع كلاب النار"، بدمذہب لوگ دوزخیوں کے کتے ہیں۔ ایضا کتاب مذکور ص ۱۱۰۔

جب ہم شرعاً و قانوناً ہرگز مجبور نہیں کہ کتے کو اپنی نماز کی صفوں میں کھڑا کریں یا اپنی مسجدوں میں آنے دیں۔ تو جو ہمارے مذہب میں بحکم حدیث اس سے بدتر ہیں، انہیں اپنی نماز میں شریک کرنے پر ہمیں مجبور کرنا، ضرور ہمیں مذہبی نقصان پہنچانا ہے، جو کسی طرح قرین انصاف نہیں۔

(۲۰)　ان کی کتابیں شاہد ہیں کہ وہ ہمیں مشرک جانتے ہیں اور مشرکوں کی بنائی ہوئی مسجدیں شرعاً مسجد نہیں۔ قرآن مجید میں ہے: "مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يَّعْمُرُوْا مَسٰجِدَ اللّٰهِ شٰهِدِيْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ بِالْكُفْرِ اُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ

وَفِی النَّارِ هُمْ خَالِدُوْنَ ۝ اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَلَمْ يَخْشَ اِلَّا اللّٰهَ" (التوبۃ: ۱۷-۱۸) " مشرکوں کو نہیں پہنچتا کہ اللہ کی مسجدیں آباد کریں خود اپنے کفر کی گواہی دے کر، ان کا تو سب کیا دھرا اکارت ہے اور وہ ہمیشہ آگ میں رہیں گے۔ اللہ کی مسجدیں وہی آباد کرتے ہیں جو اللہ اور قیامت پر ایمان رکھتے اور نماز قائم کرتے اور زکوٰۃ دیتے اور اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے ہیں۔" (کنز الایمان)

تو غیر مقلدین حقیقۃً ہماری مسجدوں کو مسجد ہی نہیں جانتے۔ دھوکا دینے کے لئے اسے مسجد کہنا اور یہ ادعائی اسلام، اپنا حق ان میں مساوی ہونے کا دعویٰ کرنا، خود ان کے اپنے مذہب کے خلاف اور محض ایذا دہی و آزار رسانی و بدنیتی ہے۔ کوئی استحقاق، کوئی دعویٰ انہیں ہماری مساجد پر نہیں ہوسکتا۔ یہ بعینہ ایسا ہے کہ چند ہنود ہماری مساجد پر دعویٰ کریں کہ یہ ہمارے مذہب کے مقدس تیرتھ ہیں۔ ہمیں ان میں پوجا پاٹ کی اجازت ملے۔ حالانکہ یہ دعویٰ صراحۃً فریب اور خود ان کے برخلاف مذہب ہوگا۔ مذہبی معاملے میں خود اپنے مذہب کے خلاف ایک بات کا دعویٰ دوسروں کے حق پر قبضہ پانے کے لئے کرنا، سوائے بدنیتی و آزار رسانی کے کیا ہوسکتا ہے؟ ایسے ناجائز و فاسد المبنیٰ دعویٰ قابل سماعت نہیں ہوتے۔ لہٰذا حنفیہ کی مساجد کو فریق مخالف کے دست تعرض سے محفوظ رکھنا ہی قرین انصاف ہے۔

(۲۱) اس سے تنزل کرتے ہیں کہ غیر مقلدین مبتدع نہیں، مگر اس قدر تو یقیناً معلوم، جس سے کسی فریق کو انکار کی گنجائش نہیں کہ ہمارا ان کا اختلاف عقائد میں ایسا ہے کہ دونوں فریق سے ایک ضرور بدمذہب و گمراہ ہے۔ کما قال اللہ تعالیٰ: "وَاِنَّآ اَوْ اِيَّاكُمْ لَعَلٰى هُدًى اَوْ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ" (سبا: ۲۴) "اور بے شک ہم یا تم یا تو ضرور ہدایت پر ہیں یا کھلی گمراہی میں" (کنز الایمان) اس کے ثبوت کے لئے فریقین کی بکثرت کتابیں کہ چھپ کر شائع ہوچکیں، کافی ہیں۔ بلکہ کسی ثبوت کی حاجت نہیں تم ہمیں گمراہ کہتے ہو اور ہم تمہیں اور اگر تم اس وقت مصلحۃً نہ کہو تو ہمارا فریق تو ضرور تمہیں گمراہ و بددین کہتا اور لکھتا اور چھاپتا ہے۔ اب دو حال سے خالی نہیں۔ یا تم فی الواقع گمراہ ہو تو مطلب حاصل۔ یا واقع میں تم ہدایت پر ہو تو جو فریق ہدایت کو ضلالت جانے، وہ گمراہ ہے۔ اب یا تو تم ہمیں، ہمارے جمیع اعتقادیات میں حق پر جانتے ہو یا نہیں؟ اگر نہیں تو معلوم ہوا کہ ہمارے بعض اعتقاد تمہارے نزدیک حق نہیں۔ اور اگر ہاں، تو ہمارے اعتقادیات سے ایک یہ بھی ہے کہ تم گمراہ و بددین ہو، یہ بھی حق ہوا۔ بہر حال دونوں تقدیر پر ایک ضرور گمراہی پر ہے۔ اور شرع مطہر کا اہل حق کو حکم ہے کہ گمراہوں سے میل جول نہ کریں۔ ان سے دور بھاگیں، ان کی نماز میں نہ شریک ہوں، اور وہ بیمار پڑیں تو عیادت کو نہ جائیں، وہ مر جائیں تو جنازے کی نماز نہ پڑھیں۔ اب اگر معاذ اللہ ہم گمراہ ہیں تو تم کو حکم ہے کہ ہم سے دور رہو، ہماری نماز میں شرکت نہ کرو۔ اور اگر تم اہل بدعت ہو تو ہم کو حکم ہے کہ ہم اپنی نماز میں تمہیں شریک نہ ہونے دیں۔

بہر حال! حاصل حکم یہ ہے کہ تم ہماری مساجد میں نہ آؤ۔ ایسا حکم کہ شرع کا متفق علیہ ہے، اسے چھوڑ کر بے بنیاد دعویٰ پیش کرنا، کوئی وجہ نہیں رکھتا۔ اب قرآن کی آیت سنئے۔

اللہ عز و جل وعلا قرآن عظیم میں فرماتا ہے: "وَاِمَّا يُنْسِيَنَّكَ الشَّيْطٰنُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرٰى مَعَ الْقَوْمِ

الظّٰلِمِیْنَ۔" (الأنعام: ٦٨) "اور جو تجھے شیطان بھلادے تو یاد آنے پر پاس نہ بیٹھو"۔

تفسیر احمدی مطبوعہ بمبئی ص ۳۸۷ پر ہے: "ان القوم الظلمین یعم المبتدع و الفاسق والکافر و القعود مع کلهم ممتنع۔" "یعنی ظالم لوگ مبتدع اور فاسق اور کافر ہیں۔ اوران سب کے پاس بیٹھنا منع ہے۔"

ارشادالساری شرح بخاری جلد۹ ص ۳۹ پر ہے: "ان هجرة اهل الهواء والبدع دائمة علیٰ ممر الاوقات ما لم تظهر التوبة والرجوع الیٰ الحق" "یعنی بدمذہبوں سے جدائی ہمیشہ ہے چاہے کتنا زمانہ گزرے، جب تک ان سے توبہ اور حق کی طرف رجوع ظاہر نہ ہو۔

کنزالعمال ہامش مسند امام احمد جلد اول ص ۱۱۲ پر ہے: "عن انس قال قال رسول الله صلی الله تعالیٰ علیه وسلم "اذا رأیتم صاحب بدعة فاکفهروا فی وجهته فان الله تعالیٰ یبغض کل مبتدع۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب کسی بدعتی، بدمذہب کو دیکھو اس کے ساتھ ترشروئی کرو، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ ہر مبتدع کو دشمن رکھتا ہے۔

مرقاۃ شرح مشکوٰۃ مطبوعہ مصر جلد اول ص ۱۴۹ پر ہے: "مجالسة الاغیار تجر الیٰ غایة البوار ونهایة الخسار"۔ "یعنی غیروں کے پاس بیٹھنا، بربادی اور کمال تباہی کی طرف کھینچ لے جاتا ہے۔

شفا شریف امام قاضی عیاض مطبع صدیقی بریلی ص ۱۹۷ پر ہے: "قال رسول الله صلی الله تعالیٰ علیه وسلم لا یومن احدکم حتی اکون احب الیه من ولده ووالده والناس اجمعین وقال النبی صلی الله تعالیٰ علیه وسلم لن یؤمن احدکم حتی اکون احب الیه من نفسه" ص ۲۰۰ پر ہے: "فالصادق فی محبة النبی صلی الله تعالیٰ علیه وسلم من تظهر علامات ذلك علیه"۔ ص ۲۰۱ پر ہے: "ومنها مجانبة من خالف سنته وابتدع فی دینه"۔

"یعنی رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: تم میں کوئی مسلمان نہ ہوگا جب تک میں اس کی اولاد اور ماں باپ اور سب آدمیوں سے زیادہ محبوب نہ ہوں اور رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: ہرگز تم میں کوئی مومن نہیں جب تک میں اسے خود اس کی جان سے زیادہ عزیز نہ ہوں اور نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی محبت میں سچا وہ ہے، جس پر محبت کی علامتیں ظاہر ہوں۔ ان علامتوں میں سے ایک یہ ہے کہ مخالفوں اور مبتدعوں سے دوری اختیار کرے۔

شفا شریف میں ہے: "ومنها بغض من ابغض الله ورسوله ومعاداة من عاداه ومجانبة من خالف سنته وابتدع فی دینه۔" (۲/۲۲) ۔والله تعالیٰ اعلم

☆☆☆☆☆

مسئلہ از شہر بریلی مرسلہ احمد حسن صاحب ٦ رمضان المبارک ۱۳۲۳ھ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ زید کے بواسیری مسوں سے رطوبت ہر وقت

جاری رہتی ہے۔تو اس صورت میں ایک وضو سے نماز عشا اور تراویح زید پڑھ سکتا ہے یا نہیں؟ درصورت دیہات میں نہ ہونے کسی شخص خواندہ کے، زید نماز جماعت سے فرض عشاء اور تراویح پڑھ سکتا ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب

جب بواسیری مسوں سے رطوبت جاری ہو یعنی نماز کا کوئی پورا وقت شروع سے ختم تک ایسا گذر گیا ہو کہ اس کو وضو کر کے فرض پڑھنے کی مہلت نہ ملی ہو اور جب سے اب تک پانچوں وقت نماز کے ہر وقت میں بلا ناغہ آ رہی ہو اگرچہ ہر وقت میں ایک ہی دفعہ آتی ہو تو جب تک یہ حالت باقی رہے، اسے حکم معذور کا ہے۔ وہ پانچوں وقت وضو تازہ کرے اور اس وضو سے وقت کے اندر واجب، سنت نفل، سب کچھ پڑھ سکتا ہے۔

کنز الدقائق مع البحر میں ہے: ''وتتوضأ المستحاضة ومن به سلسل البول او استطلاق بطن او انفلات ریح او رعاف دائم او جرح لا یرقأ لوقت کل فرض ویصلون به فرضا (کان او واجبا) او نفلا وهذا اذا لم یمض علیهم وقت فرض الا وذلك الحدث یوجد فیه (ولو مرة)'' وہ ایک وضو سے نماز عشا اور تراویح پڑھ سکتا ہے۔ مگر اس کی اقتداء طاہروں اور دوسرے عذر سے معذوروں کے لئے درست نہیں، فرائض میں نہ تراویح میں۔ تراویح وغیرہا نوافل ہیں۔

ہدایہ میں ہے: ''ولا یصلی الطاهر خلف من هو فی معنی المستحاضة اه کمن به سلس البول واستطلاق البطن وانفلات الریح والجرح السائل والرعاف ویجوز له اقتداء ای معذور بمثله اذا اتحد عذرهما لا ان اختلف اه''

فتح، غنیۃ شرح منیہ میں ہے: ''لا یصح اقتداء الطاهر لصاحب العذر۔'' واللہ تعالیٰ اعلم۔

☆☆☆☆☆
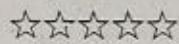
مسئلہ از کانپور مسجد رنگیان مرسلہ مولوی نثار احمد صاحب

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیانِ شرع متین اس مسئلہ میں کہ زید مع اہل و عیال کانپور میں بہ نیت اقامت مقیم ہوا۔ عرصہ دراز کے بعد ایک شادی بھی کانپور میں کی اور مکان ذاتی بنایا اور حیثیت کے موافق کچھ معاش بھی ہے۔ تخمینا ستائیس برس یا کچھ زیادہ مقیم رہا۔ اب ان کا انتقال ہو گیا۔ وقت اقامت کانپور کے ایک پسر مسمّی بہ عمرو تخمینا دو تین سال کا ہمراہ تھا۔ اب اس عمرو کی عُمر ستائیس سے زیادہ ہے۔ زید نے اس مدت میں عمرو کا عقد لکھنو میں کرا دیا تھا۔ عمرو صاحب اولاد بھی کانپور میں ہوا اور عمرو کانپور سے کوچ کا ارادہ بھی نہیں رکھتا تھا۔ اس قدر زمانہ کے بعد اتفاق سے دوسرے شہر میں نوکر ہو کر چلا گیا اور ارادہ ہے کہ کوچ کرے گا۔

اس صورت مسئولہ میں زید کا وطن اصلی کانپور ہوا یا نہیں؟ ہوا تو کیوں اور نہیں تو کیا وجہ؟ جب زید کا وطن اصلی بن جاوے تو عمرو پسر کا باوجود اس کیفیت کے کہ ارادہ کوچ نہیں اور اس قدر عمر بھی اس نے شہر میں گذاری ہو، وطن اصلی بنایا

نہیں اور کون سی علت نہیں کی۔ اور نہ ہونے کی بر تقدیر بن جانے کے دوسرے شہر کے نوکری باوجود کوچ کے ارادہ کے وطن اصلی کو باطل کرے گی یا نہیں؟ اور کیا علت؟ بینوا توجروا۔

الجواب

جب زید مع اہل وعیال کانپور آ کر بہ نیت اقامت مقیم ہوا اور اپنا ذاتی مکان بنایا اور وہیں شادی بھی کر لی اور کہیں کوچ کا بھی ارادہ نہ کیا۔ یہاں تک کہ اس کا انتقال بھی ہو گیا۔ اسی طرح عمرو کہ وہاں ۲۴ سال سے زائد سے مقیم ہے، وہیں صاحب اولاد ہوا، کہیں کوچ کا ارادہ بھی نہ کیا، تو کانپور ضرور ان دونوں کا وطن اصلی ہے۔

بحر الرائق میں ہے: ''الوطن الاصلی هو وطن الانسان فی بلدته او بلدة اخری اتخذها دارا وتوطن بها مع اهله وولده ولیس من قصده الارتحال عنها بل التعیش بها۔''

تبیین الحقائق میں ہے: ''وهو (الوطن الاصلی) مولد الرجل او البلد الذی تاهل فیها۔''

حاشیہ علامہ شلبی میں فتح القدیر سے ہے: ''ای ومن قصد التعیش به لا الارتحال (۴۰۳/۱)''

جامع الرموز میں ہے: ''الوطن الاصلی ان یکون مولده وماهله ومنشأه کما فی المحیط وغیره من الاختیار علی الاولیین لکونه ابعد من الخلاف۔''

در مختار میں ہے: ''الوطن الاصلی موطن ولادته او تاهله او توطنه۔''

رد المحتار میں ہے: ''قوله: او تاهله ای تزوجه، قال فی شرح المنیة: ولو تزوج المسافر ببلد ولم ینو الاقامة به فقیل لا یصیر مقیما وقیل یصیر مقیما وهو الاوجه۔ قوله ای توطنه ای عزم علی القرار فیه وعدم الارتحال وان لم یتاهل قلت فبالاولی اذا تاهل۔''

عمرو کا دوسری جگہ قیام کہ نہ اس کی مولد ہے، نہ وہاں اس نے شادی کی، نہ اسے اپنا وطن بنا لیا یعنی یہ عزم نہ کر لیا کہ اب یہیں رہوں گا اور یہاں کی سکونت چھوڑوں گا۔ بلکہ وہاں کا قیام صرف عارضی، بر بنائے تعلق نوکری ہے۔ تو وہ جگہ وطن اصلی نہ ہوئی، اگر چہ وہاں بضرورت معلومہ قیام زیادہ ہو، اگر چہ وہاں تا حاجت اقامت بعض یا کل اہل وعیال کو بھی لے جائے کہ بہر حال یہ قیام ایک وجہ خاص سے ہے، نہ مستقل متقر۔ تو یہ صرف وطن اقامت ہے۔

عالمگیریہ میں ہے: ''ووطن اقامته وهو البلد الذی ینو المسافر الاقامة فیه خمسة عشر یوما او اکثر۔''

تبیین میں ہے: ''ووطن اقامته وهو الموضع الذی ینو المسافر ان یقیم فیه خمسة عشر یوما فصاعدا۔''

حاشیہ شلبی میں ہے: ''ای علی نیته ان یسافر بعد ذلك اه فتح۔''

وہ وطن اصلی کو باطل نہیں کر سکتا۔ تبیین الحقائق پھر عالمگیریہ میں ہے: ''ولا یبطل الوطن الاصلی بانشاء السفر وبوطن الاقامة۔''

ح ط ش میں ہے: ''لم یبطل الوطن الاصلی بوطن الاقامة۔''

عمر وجب کانپور آئے گا، بمجرد دخول مقیم ہوجائے گا اور اتمام واجب۔ جامع الرموز میں ہے: یبطل الاصلی (السفر) ای وطن السفر المسمی بوطن الاقامة والوطن المستعار الحادث ایضا فلو خرج الیٰ الاول صار مقیما بمجرد دخول فیه۔ والله تعالیٰ اعلم۔

☆☆☆☆☆☆

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ جمعہ کے دن خطبہ کے وقت جواذان دی جاتی ہے وہ کہاں ہونی چاہئے اور زمانہ رسول اللہ میں وہ اذان کہاں ہوتی تھی، اندر مسجد کے یا باہر؟ بینوا توجروا۔ السائل سید محمد عمر غفرلہ از شہر پیلی بھیت محلہ احمد زئی۔

الجـــواب

اذان نبوی جمعہ کے دن خطبہ کے لئے خطیب کے منبر پر چڑھنے کے وقت مواجہہ خطیب میں اذان عثمانی کی طرح بیرون مسجد ہی ہونی چاہئے۔ یہی سنت نبوی وصدیقی وفاروقی ہے صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ورضی اللہ تعالیٰ عنہما۔

(۱) عمدۃ الرعایۃ فی حل شرح الوقایۃ مولوی عبدالحی صاحب لکھنوی میں ہے: "قوله بین یدیه ای مستقبل الامام فی المسجد کان او خارجه والمسنون هو الثانی" یعنی لفظ بین یدیه کے معنی تو یہ ہیں کہ امام کے روبرو ہونا چاہئے مسجد میں یا بیرون مسجد۔ مگر مسنون وہی دوسری صورت ہے۔ یعنی اذان کا خارج مسجد ہونا۔

(۲) اسی میں ہے: "وبسند آخر عنه کان یوذن بین یدی رسول الله صلی الله تعالیٰ علیه وسلم اذا جلس علیٰ المنبر یوم الجمعة علی باب المسجد وابی بکر وعمر" یعنی دوسری سند سے حضرت سائب بن یزید رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ سرور عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم وصدیق اکبر وفاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے مواجہہ، میں جب جمعہ کے دن منبر پر تشریف فرما ہوتے، دروازہ مسجد پر اذان دی جاتی تھی۔ رواہ ابوداؤد

(۳) تعلیق الممجد حاشیہ مؤطا امام محمد (۴) میں ہے: "وعند الطبرانی (۵) کان یوذن بلال علیٰ باب المسجد علیٰ عهد رسول الله صلی الله تعالی علیه وسلم وابی بکر وعمر۔"

(۶) کشف الغمہ میں ہے: "وکان الاذان الاول علیٰ عهد رسول الله صلی الله علیه وسلم وابی بکر وعمر رضی الله تعالیٰ عنهما اذا جلس الخطیب علیٰ المنبر علیٰ باب المسجد۔" مسجد میں اذان کہنا حسب تصریح فقہائے کرام مطلقاً ممنوع ومکروہ ہے۔

(۷) فتح القدیر میں ہے: "الاقامة فی المسجد ولابد واما الاذان فعلی المئذنة فان لم تکن ففی فناء المسجد وقالوا یوذن فی المسجد" (فتح القدیر، باب الاذان: ۱/۲۱۵)

(۸) اسی میں ہے: "هو ذکر الله فی المسجد ای فی حدوده لکراهة الاذان فی داخله۔"

(۹) غنیۃ المصلی شرح منیۃ المصلی میں ہے: "الاذان انما یکون فی المسجد والاقامة فی داخله۔"

(۱۰) فتاوی تاتارخانیہ (۱۱) مجمع البرکات، (۱۲) عالمگیریہ، (۱۳) قاضی خان، (۱۴) خلاصہ (۱۵)، خزانۃ

المفتیین ،(۱۶) بحر الرائق میں ہے:" ینبغی ان یوذن علی المئذنة او خارج المسجد ولا یوذن فی المسجد ۔"
اذان منذنہ پر ہو یا بیرون مسجد کہی جائے ۔ اور مسجد میں اذان نہ دی جائے ۔
(۱۷) شرح مختصر وقایہ علامہ برجندی میں ہے:" وفیه اشعار بانه لا یوذن فی المسجد"
(۱۸) طحطاوی حاشیہ مراقی الفلاح میں ہے:" یکره ان یوذن فی المسجد کمافی القهستانی" (۱۹) (حاشیة الطحطاوی علی مراقی الفلاح ص۱۰۷) (۲۰) النظم (۲۱) شرح طحاوی پھر (۲۲) شرح قدوری محمود زاہدی میں ہے: ولا یوذن الا فی فناء المسجد او علی مئذنة ۔
ان تمام تصریحات جلیلہ میں عموم واطلاق صاف بتارہا ہے کہ مطلقا اذان چاہے جمعہ کی ہو یا پنجگانہ، مسجد میں مطلقا مکروہ ہے۔ ومن ادعیٰ التخصیص فعلیه ان یاتی بالتنصیص هذا ما عندی والله اعلم بالصواب۔

کتبه عبده العاصی ظفر الدین البهاری

عفی عنه بمحمد المصطفیٰ النبی الامی صلی الله علیه وسلم

☆☆☆☆☆

مسئلہ مرسلہ مولانا محبوب علی خان رضوی احاطہ ڈاکٹر عبد السبحان خان محلہ کرنیل گنج کانپور ۔ ۱۱ ذیقعدہ ۱۳۶۸ھ

کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ اذان خطبہ جمعہ مسجد یعنی موضع اعد للصلاۃ میں مکروہ نہیں ہے اور حضور پر نور سیدنا اعلیٰ حضرت رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کسی فتویٰ میں کوئی عبارت ایسی نہیں لکھی، جس سے اذان خطبہ کا مسجد میں ہونا مکروہ ثابت ہو ۔ لہٰذا مسجد میں یہ اذان مکروہ نہیں ہے ۔ عمرو کہتا ہے کہ اذان خطبہ، اذان ہی نہیں ہے ۔ اس کو تغلیباً اور بر بنائے تقویٰ اذان کہہ دیا ہے ۔ اور اذان خطبہ کا مقصود اعلام نہیں ہے ۔ حکم شرعی سے آگاہ فرمایا جائے ؟ بینوا توجروا۔

الجواب

زید کا یہ دعویٰ کہ اذان خطبہ جمعہ، مسجد یعنی موضع اعد للصلاۃ میں مکروہ نہیں، بالکل غلط، بے بنیاد وخلاف عقل ونقل وتصریح علماء ہے ۔ زید سے پوچھا جائے کہ اذان خطبہ اذان ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو مطلق ممانعت وکراہت اس کو کیوں شامل نہیں؟ کیا زید دکھا سکتا ہے کہ یہ اذان، اذان نہیں؟ یا علماء نے اس کو مستثنیٰ فرمایا ہے؟ جب دو بات میں سے ایک بھی نہیں، تو زید کا دعویٰ بالکل محض ہے ۔ اور اگر بالفرض مان لیا جائے کہ یہ اذان نہیں، لازم آئے گا کہ حضور اقدس صلی المولی علیہ وسلم وحضرات شیخین کرام کے زمانہ مبارکہ میں نماز جمعہ بغیر اذان ہوا کرتی تھی ۔ وهذا لا یقول به جاهل تمیزیه کہنا کہ اعلیٰ حضرت نے فتوائے مبارکہ میں کوئی عبارت ایسی نہ لکھی جس سے اذان خطبہ کا مسجد میں ہونا مکروہ ثابت ہو، یہ بھی بالکل غلط ۔ اعلیٰ حضرت کی تحریر میں عبارت فتح القدیر ملاحظہ ہو: فی المسجد ای فی حدوده لکراهة الاذان فی داخله یعنی جمعہ کا خطبہ مثل اذان مسجد میں ذکر الٰہی ہونے سے مراد حدود مسجد میں ہونا ہے ۔ اس لئے کہ مسجد کے اندر اذان مکروہ ہے ۔ اس عبارت میں خود اذان خطبہ مسجد کے اندر مکروہ ہونے کا صاف افادہ ہے ۔ جسے منکرین مخالفین کو بھی انکار

کرتے نہ بنی۔ اسی طرح غایۃ البیان شرح ہدایہ میں ہے۔ عمرو کا کہنا بھی بالکل لغو ومہمل ہے۔ اگر اذان خطبہ سرے سے اذان ہی نہیں، تو اس کا کیا جواب ہے کہ سرکار دو عالم صلی المولیٰ علیہ وسلم وحضرات شیخین رضی اللہ عنہما کے زمانہ مبارکہ میں جمعہ کی نماز بے اذان ہوا کرتی تھی۔ یہ مسئلہ ایسا واضح ہے کہ عربی کی بڑی بڑی کتابوں کی شان عظیم ہے، فارسی کی چھوٹی کتابوں میں بھی مذکور ہے۔ زاد التقویٰ میں ہے: اذان ثانی وقتیکہ برائے خطبہ الخ

ترغیب الصلاۃ میں ہے: در عہد امیر المومنین عثمان رضی اللہ عنہ بنا نہادو بانگ مکرر شد۔ اب کوئی عمرو صاحب سے پوچھے کہ جب اذان خطبہ، اذان ہی نہیں تو اذان ثانی، کے کیا معنی اور "مکرر شد" کا کیا مطلب ہے؟ اللہ تعالیٰ ہدایت نصیب کرے اور ضد اور ہٹ دھرمی سے بچائے۔ آمین واللہ اعلم۔

☆☆☆☆☆

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین دریں مسئلہ کہ خطبہ پڑھنا سنت ہے یا فرض؟ اور سننا سامعین پر فرض ہے یا سنت؟ بعض لوگ نصف خطبہ کے بعد سنت پڑھا کرتے ہیں، یہ فعل کیسا ہے؟ بینوا وتوجروا۔

الجـــــــواب

خطبہ تین طرح کے ہیں:

(۱) خطبہ جمعہ کہ فرض ہے۔ اس واسطے بے خطبہ نماز درست نہیں۔ کما ذکر عن الزھری قال بلغنا انہ لا جمعۃ الا بخطبۃ

شرح وقایہ میں ہے: "وشرط لادائہا المصر (الیٰ ان قال) والخطبۃ۔"

فتاویٰ قاضی خاں میں ہے: "الجمعۃ لا تجوز بدون الخطبۃ۔"

عالمگیریہ میں ہے: "حتی لو صلوا بلا خطبۃ لم یجز۔"

(۲) خطبۂ عیدین۔ اور وہ سنت ہے۔

درمختار میں ہے: "تجب صلاتہما بشرائطہما سویٰ الخطبۃ فانہا سنۃ۔"

ردالمحتار میں ہے: "انہا فیہما سنۃ حتی لو لم یخطب اصلا صح واساء لترک السنۃ۔"

فتاویٰ قاضی خاں میں ہے: "وصلاۃ العید تجوز بدون الخطبۃ۔"

ہندیہ میں ہے: "والخطبۃ بعد الصلاۃ وتجوز الصلاۃ بدونہا۔"

(۳) خطبہ نکاح اور وہ مستحب ہے اور اسماع اور انصات سب میں فرض ہے۔

درمختار میں ہے: "وکذا یجب الاستماع لسائر الخطب کخطبۃ نکاح وختم وعید علی المعتمد" پھر نصف خطبہ کے بعد سنت پڑھنا، کس طرح درست ہوسکتا ہے۔؟

رسول علیہ السلام فرماتے ہیں: "اذا قعد الامام علیٰ المنبر فلا صلاۃ" بلکہ پڑھنا گناہ وممنوع ہے۔ عقبہ

بن عامر رضی اللہ عنہ سے مروی: ''قال الصلوۃ والامام یخطبه معصیة"۔
اس لئے کہ خطبہ میں حکم استماع اور انصات ہے۔ فلا یشتغل بها لان الاشتغال بها یفوت علیه الاستماع هکذا فی الهدایة والدر المختار وغیر ذلک من معتمدات الاسفار۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

☆☆☆☆☆☆

مسئلہ بازار شفاخانہ ضلع نینی تال مرسلہ محمد عبدالرحمٰن ٹھیکہ دار ۱۱ ربیع الاول شریف ۱۳۲۳ھ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ دیہات میں نماز جمعہ پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟ بینوا وتوجروا۔

الجواب

دیہات میں جمعہ جائز نہیں۔ ابوبکر بن ابی شیبہ اور عبدالرزاق اپنے مصنفات میں مولیٰ علی کرم اللہ وجہہ سے راوی کہ فرماتے ہیں:

لا جمعة ولا تشریق ولا صلوۃ عید ولا اضحیٰ الا فی مصر جامع او مدینة عظیمة

''نہیں ہوتی نماز جمعہ اور نہ تشریق نہ عیدین مگر مصر جامع یا بڑے شہر میں۔''

''صححه ابن حزم فی المحلی'' اور یہی مذہب ہے صحابہ سے، خاتم الخلفاء مولیٰ علی وحذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور تابعین سے عطا اور حسن ابن ابی الحسن وابراہیم نخعی ومجاہد وابن سیرین اور ثوری وسحنون وغیرہم رضی اللہ تعالیٰ عنہم کما فی الغنیة شرح المنیة۔

ملتقی الابحر میں ہے: ''لا تصح الجمعة الا بستة شروط المصر او فنائه الخ کذا فی الکنز والاصلاح وتنویر الابصار ومراقی الفلاح وشرح الوقایة والسراجیة"۔

تبیین میں ہے: '' حتی لا یجوز اداؤها فی المفاوزة ولا فی القریٰ کذا فی مجمع الانهر والصغیری والبحر والغنیة والحلیة وملا مسکین۔"

خزانۃ المفتیین میں ہے: ''لا یجوز اقامتها الا بشرائط ستة منها المصر الجامع فلا یجوز اقامتها فی القریٰ ولا المفاوز البعیدة من الامصار۔"

یعنی'' جمعہ بغیر چھ شرطوں کے درست نہیں جس سے مصر جامع ہے۔ تو نہیں جائز ہے گاؤں میں اور نہ ان میدانوں میں جو مصر سے دور ہیں۔ اگر پڑھیں گے گنہگار ہوں گے''۔

''لانه اشتغال بما لا یصح ومع ذلک اما ترک الظهر وهو فرض او ترک جماعة وهی واجبة ثم الصلاۃ فرادیٰ مع الاجتماع وعدم المانع شنیعة اخری غیر ترک الجماعة فان من صلیٰ فی بیته معتزلا عن الجماعة فقد ترک الجماعة وان صلوا فرادیٰ حاضرین فی المسجد فی وقت واحد فقد ترکوا الجماعة

واتوا بهذه الشنيعة زيادة عليه فيودى الىٰ ثلث محظورات بل اربع بل خمس لان ما يصلونه لما لم يكن مفترضا عليهم كان نفلا واداء النفل بالجماعة والتداعى مكروه ثم هم يعتقدونها فريضة عليهم وليس كذلك قاله فى "العطايا النبوية" وكذا افيد على هامش رد المحتار۔"

فرض ظہر ذمہ سے ساقط نہ ہوگا۔ لما فی رد المحتار عن الجواهر: "لو صلوا فى القرىٰ لزمهم اداء الظهر۔"

اور شہر کی تعریف یہ ہے کہ وہ آبادی جس میں متعدد کوچے ہوں، دائمی بازار ہو اور وہ پرگنہ ہو جس کے متعلق دیہات گنے جاتے ہوں اور اس میں کوئی حاکم مقدمات رعایا فیصل کرنے پر مقرر ہو، جس کی حشمت وشوکت اس قابل ہو کہ مظلوم کا انصاف ظالم سے لے سکے۔

بحر الرائق میں ہے: "وفى حد المصر اقوال كثيرة اختاروا منها قولين، احدهما فى المختصر ثانيهما ما رووه لابى حنيفة انه بلدة كبيرة ،فيها سكك واسواق ولها رساتيق وفيها والٍ يقدر على انصاف المظلوم من الظالم بحشمه وعلمه او علم غيره والناس يرجعون اليه فى الحوادث۔"

اور یہی ظاہر الروایۃ ہمارے ائمہ ثلثہ رضی اللہ عنہم سے ہے کما فى الغنية والحلية والدر والهندية والخانية والخلاصة والعناية وفتح الله المعين والسراجية وحاشية الدر لمولانا عبد الحكيم۔ اور وہ تعریف کہ مالا يسع اكبر مساجده اهله مصر ظاہر الروایۃ کے خلاف ہے۔ اور جو کچھ ظاہر الروایۃ کے خلاف ہے مرجوع عنہ اور متروک ہے۔ کمافی البحر اور فتویٰ جب مختلف ہو تو ظاہر الروایۃ پر عمل واجب، کما فی الدر۔ تو اس قول کا اختیار، ظاہر مذہب سے عدول اور اس کے ماخذ کا صریح خلاف ہے۔ بلکہ اس تعریف کے بموجب حرمین محترمین جن کے مصر ہونے پر اتفاق ہے، جن میں زمانہ اقدس سے جمعہ قائم ہے، شہر ہونے سے خارج ہوئے جاتے ہیں۔ اور جس تعریف سے وہ دونوں شہر پاک مصریت سے خارج ہوں، غیر معتبر ہے۔ غنیۃ شرح منیۃ ص ۵۵۰ میں ہے: "الفصل فى ذلك ان مكة والمدينة مصران تقام بهما الجمع من زمنه صلى الله عليه وسلم فكل موضع كان مثل احدهما فهو مصر وكل تفسير لا يصدق علىٰ احدهما فهو غير معتبر حتىٰ التعريف الذى اختاره جماعة من المتاخرين كصاحب المختار والوقاية وغيرهما وهو ما لو اجتمع اهله فى اكبر مساجده لا يسعهم فانه منقوض بهما، اذ مسجد كل منهما يسع اهله وزيادة۔"

اسی لئے مجمع الانہر میں ہے: "اذ هذا الحد غير صحيح عند المحققين۔" بالجملہ دیہات میں نماز جمعہ جائز نہیں۔ اگر پڑھیں گے گنہگار ہوں گے، ظہر ذمہ سے ساقط نہ ہوگا۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

☆☆☆☆☆

مسئلہ از راکباب ڈاک خانہ منکڈ و محلہ حسین باڑہ مرسلہ مولوی عبد الشکور صاحب ۲۵ ذی الحجہ ۱۳۲۳ھ

مقتدائے زماں، پیشوائے اہل ایماں، جناب مولانا صاحب مدظلہ۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

یہ فتویٰ مفتی قاضی لطف اللہ صاحب رامپوری کا، حضور کے پیش کرنا ہے۔ اگر صحیح ہو تو اس میں حضور کا مہر و دستخط چاہئے۔ ورنہ اس کی غلطی سے ہم لوگوں کو اطلاع فرمادیں والسلام۔

ما قولکم ایها العلماء الکرام دریں مسئلہ کہ نماز جمعہ در دیہات جائز است یا نہ؟ واگر خواندہ شود شرائط صحت آن چیست؟ وبحالت در وجود ہمہ شرائط جمعہ ظہر احتیاطی خواند یا نہ؟ بینوا توجروا۔

الجواب

منجملہ شروط صحت نماز، مصر بودہ ست۔ و در دیہات جمعہ نزد حنفیہ بحکم ایں روایت ہدایہ: "صلوٰة الجمعة لا تصح الا فی الجامع او مصلّی المصر ولا تجوز فی القریٰ" ادا نمی شود۔ لیکن در تعریف مصر اختلاف است۔ فقہا متقدمین مصر آنرا گویند کہ حاکم وقاضی آنجا قدرت اجرائے احکام شرعیہ، حدود وقصاص داشتہ باشد۔ مگر چوں تسلط کفار غالب شد و دین اسلام ضعیف گردیدہ تحقق شرط مذکور مفقود شد، یعنی باوجود حاکم، اسلام عنقا صفت شد واگر جائے حاکم اسلام باقیست، قدرت اجرائے حد ندارد۔ واز فقہائے متاخرین فقط کثرت اسلام را اعتبار نمودہ، جائے را کہ وسیع تر مساجد آنجا گنجائش نمازیاں مکلف نداشتہ، آنرا مصر بموجب روایت مفتیٰ بہ قرار دادہ اند۔

چنانچہ در ردالمختار مذکور است: "ویشترط لصحتها سبعة اشیاء الاولیٰ المصر وهو ما لایسع اکبر مساجده اهله المکلفین بها وعلیه اکثر الفقهاء لظهور التوانی فی الاحکام وظاهر المذهب ان کل موضع له امیر وقاضی یقدر علی اقامة الحدود" (الدر المختار علی هامش رد المحتار ۱۳۷/۱)

علامہ شامی محشی درمختار در تائید روایات مذکور می آرد: "(لقوله ما لا یسع الخ) هذا یصدق علی کثیر من القریٰ(قوله المکلفین بها) احتراز عن اصحاب الاعذار مثل النساء والصبیان والمسافرین عن ط: القهستانی(قوله وعلیه فتویٰ اکثر الفقهاء الخ) وقال ابو شجاع هذا احسن ما قیل وفی الولوالجیة هو صحیح بحر وعلیه منتهی الوقایة ومتن المختار وشرحه وقدمه فی متن الدر علی القول الاخر وظاهره ترجیحه وایده صدر الشریعة لقوله لظهور التوانی فی احکام الشرع سیما فی اقامة الحدود فی الامصار۔" (رد المحتار :۱۳۷/۱)

پس بر تحقیق مذکورہ بالا آنجا تعریف مصر صادق ست۔ یعنی دہیکہ دراں چند مسجد باشند و اہل اسلام کہ نماز برآنہا فرض است، این قدر کثیر باشد کہ در مسجد کلاں آنجا گنجائش متصور نہ باشد، آنرا حکم مصر است۔ واگر دراں موضع از جانب حاکم اسلام، امام جمعہ مقرر نہ باشد، اہل اسلام ہر کہ امام خود مقرر کردہ باشند، پس او جمعہ ادا سازند۔ نماز جمعہ ادا خواہد شد، بحکم ایں روایت فتاویٰ عالمگیریہ: "بلاد علیها ولاة کفار یجوز للمسلمین اقامة الجمعة ومصر القاضی بتراضی المسلمین اه۔"

وبحالت شک در وجود شرائط جمعہ یعنی بودن مصر وحاکم اسلام یا نائب آں در صحت جمعہ شک آوردہ ظہر اقتضائی

روایت مشہور بخوف عدم اعتقاد عدم فرضیت جمعہ بہتر ست کہ عوام نخواہند۔ واہل گرخوانند درخانۂ خود خفیہ خوانند تا فساد اعتقاد بر آں نشود۔ وبحکم ایں روایت درمختار وفی البحر وقد افتیت مرارا بعدم صلوٰۃ الاربع بعدها بنية اخر ظهر خوف اعتقاد عدم فرضية الجمعة وهو الاحتياط فى زماننا واما من لا يخاف عليه مفسدة منها فالاولىٰ ان تكون فى بيته خفية هذا ما القى فى الخاطر الفاطر محمد لطف الله غفر له۔

الجواب صحیح ۔ فی الواقع نماز جمعہ نزدیک سادات کرام حنفیہ خصهم الله تعالىٰ باللطف العام کے دیہات میں درست نہیں ۔ اگر پڑھیں گے، گنہگار ہوں گے ۔ ظہر ذمہ سے ساقط نہ ہوگا مگر تعریف مصر غیر ظاہر الروایۃ وغیر معتبر کو اختیار کرنا فقاہت سے از بس دور۔ حسب اقرار خود وتصریح علمائے کرام ظاہر الروایۃ، كل موضع له امير وقاضى يقدر علىٰ اقامة الحدود كما فى الهندية والظهيرية والخانية والعناية والبحر والدر المختار وغيرها من معتمدات الاسفار، علما نے غیر ظاہر الروایۃ پر فتویٰ دینے کو جہالت ونادانی وخرق اجماع فرمایا ہے۔

بحر الرائق میں ہے: ''ما خرج عن ظاهر الرواية فهو مرفوع عنه۔''

درمختار میں ہے: "ان الحكم والفتيا بالقول المرجوح جهل و خرق للاجماع اقول فكيف بالافتاء بالمرجوع عنه۔"

بلکہ علامہ شامی نے شرح عقود میں اور انفع الوسائل میں علامہ طرطوسی سے نقل کیا: "المقلد لا يجوز له ان ان يحكم الا بما هو ظاهر الرواية اه۔" اس پر اکثر فقہا کا فتویٰ ہونا اور ولوالجیہ میں صحیح کہنا اس تعریف کے اختیار کرنے کی وجہ نہیں ہوسکتی ہے، کہ تعریف كل موضع الخ پر بھی اکثر فقہا كما فى العناية وعلى هذا شارح منیہ نے اس کی بھی تصریح فرمائی۔ پس جبکہ تصحیح فتویٰ مختلف ہوئی تو ترجیح ظاہر الروایۃ کی ہوگی۔

بحر الرائق میں ہے: '' الفتوىٰ اذا اختلف كان الترجيح لظاهر الرواية۔''

اسی میں ہے: "اذا اختلف التصحيح وجب الفحص عن ظاهر الرواية والرجوع اليها ۔ "علىٰ هذا توانی فی الاحکام کو وجہ اختیار اس روایت کی گرداننا بھی بعد غور معلوم ہوسکتا ہے کہ کس درجہ ضعیف ہے کہ تعریف ظاہر الروایۃ میں "يقدر على اقامة الحدود" ہے، نہ يقيم الحدود۔ بالجملہ وجہ اختیار اس تعریف کی کوئی نہیں ۔ وجوہ مذکورہ یا مشترک یا مردود۔ اور وجہ ترک قوی (اولاً غیر ظاہر الروایۃ ہونا ثانیاً اس تعریف کی رو سے مکہ معظمہ ومدینہ منورہ، جہاں زمانہ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے جمعہ قائم ہے، کا مصریت سے خارج ہونا) موجود۔

غنیۃ میں ہے: "والفصل فى ذلك ان مكة والمدينة مصران تقام بهما الجمعة من زمنه عليه السلام الى اليوم فكل موضع كان مثل احدهما فهو مصر و كل تفسير لا يصدق على احدهما فهو غير معتبر حتى التعريف الذى اختاره جماعة المتاخرين كصاحب المختار والوقاية وغيرهما وهو ما لو اجتمع اهله فى اكبر مساجده لا يسعهم فانه منقوض بهما، اذ مسجد كل منهما يسع اهله وزيادة فلا

یعتبر هذا التعریف اه۔" (غنیة المستملی شرح منیة المصلی ص ۵۵۰)
اور سبب اختیار موضع لہ امیر وقاضی الخ ظاہر و بیّن ۔ ولہٰذا اسی کا اختیار انسب ۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب والیه المرجع والماب۔

☆☆☆☆☆

مسئلہ از بنگالہ مرسلہ مولوی ولی اللہ بنگالی ۲ر رجب ۱۳۲۳ھ متعلم مدرسہ عالیہ رامپور

چہ می فرمایند رازداران دین متین ودقیقہ شناسان شرع متین اندریں مسئلہ کہ آخر الظہر باحتیاط الظہر بعد فرض الجمعہ بدیار ما مروج است، اصل آں چیست؟ وباادائے آں در ہر چہار رکعت بعد الفاتحہ سورت خواندہ شود یا نہ؟ بینوا توجروا۔

الجواب

اللھم ارنا الحق حقا والباطل باطلا چوں جمعہ مشروط بشرائط نزد ائمہ ما سادات کرام حنفیہ علیهم الرضوان من الملك العلام بود و وجود ہمہ شروط دریں بلاد محل تامل اختلاف است ۔ بدیں وجہ اکثر مشائخ بخارا بلکہ جمہور ائمہ دین وعلماء معتمدین بمقامیکہ در جواز صلاۃ جمعہ شک افتد، بعد ادائے چہار رکعت سنت بعد جمعہ بنیت سنت وقت بایں نیت کہ نماز یکہ وقت او یافتم وہنوز او نکردہ ام یا نماز جمعہ متعدد جا خواندہ شود۔ (اگرچہ حسب مذہب مفتیٰ بہ تو ارد جمعہ مطلقاً جائز و درست ست۔ کما اعتمد علیه فی الکنز والوافی، والملتقی والکافی و الطحطاوی، والهندیة والشامی، والمحیط وجواهر الاخلاطی، وصححه مفتی الجن والانس نجم الدین والعلامه الشرنبلالی فی المراقی، قال فی شرح الوقایة" وبه یفتیٰ" وفی شرح المجمع والحاوی القدسی وجواهر الاخلاطی" وعلیه الفتویٰ"۔ وفی فتح القدیر "علیٰ المفتی به"، وفی المحیط وتکملة الرازی" وبه ناخذ"۔
خواص را حکم چہار رکعت سنت بعد الجمعۃ بنیت سنت وقت بایں نیت کہ آخرین ظہرے کہ وقت او یافتہ ام وہنوز ادا نکردہ ام۔

قال فی الحلیة شرح المنیة "وقد یقع الشك فی صحة الجمعة بسبب فقد بعض شروطها ومن ذلك اذا تعددت فی المصر وهی واقعة اهل مرو فیفعل ما فعلوه" قال المحسن "لما ابتلی اهل مرو باقامة الجمعة فی موضعین مع اختلاف العلماء فی جوازها امر ائمتهم باداء الاربع بعد الجمعة حقا احتیاطا"
در فتاویٰ عالمگیریہ ست: "ثم فی کل موضع وقع الشك فی جواز الجمعة لوقوع الشك فی المصر او غیره واقام اهله الجمعة ینبغی ان یصلوا بعد الجمعة اربع رکعات وینووا بها الظهر حتی لو لم تقع الجمعة موقعها یخرج عن عهدة فرض الوقت بیقین۔" کذا فی الصغیری والغنیة شرحی المنیة والکافی،

وفتح القدير والقنية والطحطاوى وحاشية المراقى والحاوى القدسى، والبحر الرائق ومجمع الانهر وشرح المجمع ونهر الفائق، والفتاوىٰ الظهيرية والحجة وخزانة المفتيين ومختار الفتوىٰ والسراجية وشرح الكنز لملا مسكين، والتاتارخانية، والفتاوىٰ الصوفية، وجامع المضمرات، والدر المختار والفتاوىٰ الرحمانية وخزانة الروايات، واختاره الامام محسن والتمرتاشى والعلامه ابن الشحنة والباقانى والمقدسى وابو السعود والقاضى بديع الدين وشيخ الاسلام وغيرهم من الائمة الكرام عليهم الرحمة والرضوان من الملك العلام۔

اما عوام کہ بہ تصحیح نیت قدرت ندا ند یا بہ سبب ایں رکعات اربعہ جمعہ را فرض ندانند وآنہا قائل فرضیت صلاتین شوند، محکوم بایں حکم نیند۔ بلکہ اوشاں را بروئیش اطلاع نشود کہ ایں فتنۂ آ کدواہم مفسدہ اشدواعظم ست۔ درحق شان ہمیں بس ست کہ بربعض روایات نماز اوشاں ادامی شود۔ ولہذا در "نور الشمعہ" تصریح فرمود: "نحن لانامر بذلك امثال هذه العوام بل ندل عليه الخواص ولو بالنسبة اليهم۔"

درمراقی الفلاح مذکوراست: "بفعل الاربع مفسدة اعتقاد الجهلة ان الجمعة ليست بفرض او تعدد المفروض فى وقتها ولا يفتىٰ بالاربع الا الخواص ويكون فعلهم اياها فى منازلهم اه۔"

ولہذا در طحطاوی فرمود: "فالاولىٰ ان تكون فى بيته خفية خوفا من مفسدة فعلها اقول وهو اعتقاد الجهلة الخ وبمثله صرح غير واحد من الائمة۔"

ودرضم سورۃ اختلاف لکن احوط ضم دررکعات اربعہ ست۔

دربحر الرائق نویسد: "ثم اختلفوا فى القراءة فقيل يقرء الفاتحة والسورة فى الاربع وقيل فى الاولين كالظهر۔"

صاحب منحۃ الخالق فرمائد: "ويقرؤن فى جميع ركعاتها۔"

درفتح اللہ المعین ست: "واختلفوا فى ضم السورة للفاتحة فى الاربع او فى الاولين فقط والاحتياط ان يقرء هما فى الاربع هكذا فى العالمگيرى عن فتاوى (أهو) "ينبغى ان يقرء الفاتحة والسورة فى الاربع التى يصلى بعد الجمعة فى ديارتنا كذا فى التتارخانية" اه

اقول لكن الحق هو التفصيل اے شخصے کہ قضاہائے ظہر برگردن ندارد، دررکعات اربعہ ضم نمائد وگرنہ در اولین فقط۔

قال الحلبى: "وينبغى ضمها فى الكل ان لم يكن عليه قضاء فان وقعت فرضا فالسورة لا تضر وان وقعت نفلا فالضم واجب وان كان عليه قضاء لا يضم فى الاخيرين لانها فرض البتة۔" والله تعالىٰ اعلم۔

☆☆☆☆☆

مسئلہ از ڈاکخانہ شاہی مرسلہ شاہزادہ علیخان صاحب ۱۴ رجب ۱۳۲۳ھ

جو شخص دیہات میں جمعہ نہ پڑھے اس کو معاف ہے کیا کوئی گرفت نہ ہوگی؟ بینوا توجروا۔

الجواب

جمعہ نہ پڑھنے میں کوئی گرفت نہیں بلکہ پڑھنے میں ہے۔ جمعہ کے بدلے اور روز کی طرح نماز ظہر ادا کریں۔ واللہ تعالیٰ اعلم

☆☆☆☆☆

مسئلہ از قصبہ جادو ضلع مندسور، گوالیار مرسلہ مولوی عبدالملک ۳ ربیع الاول شریف ۱۳۲۳ھ

کیا حکم ہے شرع شریف کا موافق مذہب احناف کے اس مسئلہ میں کہ جادو ایک قصبہ ہے جہاں تین مسجدیں ایک محلہ میں قریب قریب آباد ہیں۔ جمعہ روز ہر مسجد والے اپنی اپنی مسجدوں میں مثل صلاۃ خمسہ نماز جمعہ ادا کرتے ہیں۔ ایک مولوی صاحب کہتے ہیں کہ اس طرح نماز صحیح نہیں۔ کیونکہ منجملہ اس کے شرائط کے حضور سلطان ہے اور وہ یہاں پر مفقود ہے۔ ایسے مقام پر مسلمانوں کو چاہئے کہ کسی شخص کو اپنا قاضی وسردار بنا کر اس کے پیچھے نماز جمعہ پڑھا کریں۔ دوسرے مولوی صاحب کہتے ہیں کہ جمعہ کی اقامت کے لئے سلطان یا اس کے نائب یا ماذون کا حاضر ہونا کچھ ضرور نہیں۔ اگر اس میں سے ایک بھی نہ ہو تو بھی جمعہ صحیح ہے۔ اور مسلمانوں کو قاضی بنانا اور اس کے پیچھے نماز پڑھنا، یہ کچھ ضرور نہیں۔ اسی طرح اپنی اپنی مسجدوں میں، جمعہ پڑھنا صحیح ہے۔ ایک جگہ جمع ہونے میں حرج ہے۔ امیدوار قول فیصل ہوں۔

الجواب

اگر جادو ایسا قصبہ ہے کہ اس میں متعدد کوچے، دائمی بازار رہتا ہے اس کے متعلق گاؤں گنے جاتے ہیں، اس میں کوئی حاکم مقدمات رعایا فیصل کرنے پر بھی مقرر ہے، جو از روئے حشمت وشوکت کے اس قابل ہے کہ اس سے مظلوم کا انصاف ظالم سے ہو سکے، تو وہاں نماز جمعہ درست ہے۔ اور یہی ظاہر الروایۃ ہمارے ائمہ ثلثہ رضی اللہ تعالیٰ عنھم سے ہے۔ کما فی الخانیۃ والھدایۃ والدر والخلاصہ وغیرھا اور اگر یہ تعریف اس پر صادق نہیں تو وہاں نماز جمعہ جائز نہیں رہی۔ رہ گئی شرط سلطان تو اگر سلطان نہ ہو تو اس کا نائب یا ماذون وماذون الماذون وھلم جرا چاہئے۔ اور اگر ان سب میں کوئی نہ ہو تو بضرورت مسلمانوں کے اتفاق سے جسے چاہیں، امام بنالیں۔ اور اس کے پیچھے نماز پڑھیں۔

خزانۃ المفتیین میں ہے: "وان لم یکن ثمہ قاضی ولا خلیفۃ المیت فاجتمع العامۃ علی تقدیم رجل جاز لمکان ضرورۃ۔ ھکذا فی الصغیری والبحر والطحطاوی والبزازیۃ والسراجیۃ والخلاصۃ والفتاوی لقاضیخان وغیرھا۔"

درمختار میں ہے: "واما مع عدمھم فیجوز للضرورۃ۔"

ردالمحتار میں ہے: "فی معراج الدرایۃ عن المبسوط "البلاد التی فی ایدی الکفار بلاد الاسلام لا بلاد الحرب لانھم لم یظھروا فیھا حکم الکفر بل القضاۃ والولاۃ مسلمون یطیعونھم عن ضرورۃ او بدونھا وکل مصر فیہ وال من جھتھم یجوز لہ اقامۃ الجمعۃ والاعیاد"۔

اقول ولیس حضور السلطان فی الصلاۃ شرطا قطعا والا لم یجز الا فی موضع واحد من المملکۃ جمیعا بل المراد اذنہ بالاقامۃ کما یدل علیہ قول العلامۃ محمد علاء الدین الحصکفی صاحب الدر المختار او ماموره باقامتها فالکل من القولین له وجه لکن الاظهر والابین هو الاول والاحسن ما حررنا۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

☆☆☆☆☆

مسئلہ مرسلہ سید محمد ظہور احمد۔ پیتھو شریف۔ ۶ ر صفر ۱۳۲۲ھ

دیہات میں نماز عیدین جائز ہے یا نہیں؟

الجواب

دیہات میں نماز عید جائز نہیں۔ اگر پڑھیں گے گنہگار ہوں گے۔ کیونکہ شرائط اس کے سوا خطبہ کے، شرائط جمعہ ہیں۔

شرح وقایہ میں ہے: "وشرط لها شروط الجمعۃ وجوبا واداءً الا الخطبۃ هکذا فی الغنیۃ والاصلاح۔"

خلاصہ میں ہے: ''ویشترط للعید ما یشترط للجمعۃ من المصر والسلطان الخ هکذا فی العالمگیریۃ وقاضی خان والخزانۃ ولفظها لها۔"

اور جمعہ دیہات میں درست نہیں۔ شرح وقایہ میں ہے: ''وشرط لادائها المصر او فناؤہ۔'

عالمگیریہ میں ہے: "ومنها المصر هکذا فی الکافی کذا فی الاصلاح والسراجیۃ۔"

غنیۃ میں فرمایا: ''اما شروط الاداء فستۃ ایضا الشرط الاول المصر او فنائہ فلا یجوز فی القریٰ عندنا هکذا فی الصغیری۔"

اور یہی مذہب صحابہ سے خاتم الخلفا مولیٰ علی وحذیفہ رضی اللہ عنہما اور تابعین سے عطا، حسن بن ابی الحسن، نخعی، مجاہد ابن سیرین، ثوری، سحنون، ہے کما فی الغنیۃ۔

خزانۃ المفتیین میں ہے: ''والجمعۃ لا یجوز اقامتها فی الرساتق ولا المفاوز البعیدۃ من الامصار۔"

"جمعہ بغیر چھ شرطوں کے درست نہیں۔ جس میں سے ایک مصر ہے۔ تو جائز نہیں ہے گاؤں میں اور نہ ان میدانوں میں جو امصار سے دور ہیں۔

ابوبکر بن ابی شیبۃ اور عبد الرزاق اپنے مصنفات میں مولیٰ علی رضی اللہ عنہ سے راوی، فرماتے ہیں: "لا جمعۃ ولا تشریق ولا صلوٰۃ فطر والاضحی الا فی مصر جامع او مدینۃ عظیمۃ۔"

''نہیں ہوتی نماز جمعہ اور نہ تشریق اور نہ عیدین مگر مصر جامع یا بڑے شہر میں" صححه ابن حزم فی المحلی۔

اور اسی پر عمل خیر القرون صحابہ کرام کا رہا کہ اس وقت بحمد اللہ کثرت سے بلاد فتح ہوئے لیکن بجز امصار کہیں نصب

منبروا قامۃ جمعہ وعیدین کے ساتھ مشغول نہ ہوئے۔

درمختار میں ہے: "وفی القنیۃ صلوٰۃ العید فی القریٰ تکرہ تحریما ای لانہ اشتغال بما لا یصح لان المصر شرطہ۔"

قنیہ میں ہے: عید کی نماز گاؤں میں مکروہ تحریمی ہے۔ کیونکہ یہ ایسی چیز کے ساتھ اشتغال ہے جو درست نہیں۔ اس کے لئے مصر شرط ہے۔ وانتفاء الشرط یستلزم انتفاء المشروط۔ واللہ تعالیٰ اعلم

☆☆☆☆☆

مسئلہ مرسلہ شاہ سلامت اللہ مصنف "الشمس الطالع" از رامپور ۱۳۲۳ھ

کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ شاہجہاں پور کے رہنے والے دو شخص، ثقہ عادل، بمبئی سے آئے اور انہوں نے بیان کیا کہ ہم نے خود ۲۹ ذیقعدہ کو بمبئی میں چاند دیکھا تو بمبئی کے آئے ہوئے لوگوں کی شہادت پر شاہجہاں پور میں عید ۲۹ کے حساب سے ہوگی یا ۲۹ کے حساب سے نہ ہوگی؟۔ بینوا توجروا۔

الجواب

فی الواقع موافق ظاہر الروایۃ (کہ اسی پر عمل واجب اور اس کا خلاف مرجوح ومرجوع عنہ ہوتا ہے۔ جس پر افتا جہل وخرق اجماع۔ کما فی الدر المختار) شاہجہاں پور میں ۲۹ کا چاند ثابت ہو کر چہارشنبہ کو عید اضحیٰ کرنی لازم ہے کہ نصاب شہادت کامل۔ ان کی شہادت واجب الاعتبار اور اختلاف مطالع کا موافق ظاہر الروایۃ اور مذہب مفتیٰ بہ وتصریحات علماء، اصلاً اعتبار نہیں۔

عالمگیریہ میں ہے: "ولا عبرۃ لاختلاف المطالع فی ظاہر الروایۃ کذا فی فتاویٰ قاضی خان وعلیہ فتویٰ الفقیہ ابی اللیث وبہ کان یفتی شمس الائمۃ الحلوائی، قالوا: رایٰ اہل مغرب ہلال رمضان یجب الصوم علیٰ اہل مشرق کذا فی الخلاصۃ۔"

اور ہلال عید الفطر کی طرح حکم ہلال عید اضحیٰ ہے۔ خزانۃ المفتیین میں خلاصہ سے ہے:

"وہلال ذی الحجۃ کالفطر وہو ظاہر المذہب۔" پس اسی پر عمل واجب۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

☆☆☆☆☆

مسئلہ مرسلہ سید محمد ظہور احمد از سرکار بیتھو شریف ۶ صفر ۱۳۲۳ھ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ نماز جنازہ میں جو کچھ امام کو پڑھنا چاہئے، وہ مقتدی کو بھی پڑھنا چاہئے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب

مقتدی بھی سب پڑھیں کہ نماز جنازہ صرف ذکر ودعا ہے، قراءت قرآن نہیں۔ اور مقتدی کو بھی صرف قراءت

قرآن عظیم ہی منع ہے، باقی دعا واذکار میں وہ امام کے شریک ہیں، مثل امام سب کچھ پڑھیں۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: "اذا صلیتم علی المیت فاخلصوا له الدعاء" جب تم کسی کے جنازہ کی نماز پڑھو تو خلوص کے ساتھ اس کے لئے دعا مانگو۔

فی العطایا النبویۃ: "فی الرحمانیة فی الطحاوی یکبرون الافتتاح مع رفع الیدین ثم یقرؤن ثم یکبرون ویصلون علیٰ النبی صلی الله علیه وسلم ثم یکبرون ویستغفرون للمیت ثم یکبرون ویسلمون ولا یرفعون ایدیهم فی التکبیرات الثلث ولا قراءة فیها۔"

خزانۃ المفتیین میں ہے: "فان کان المیت غیر بالغ فان الامام ومن خلفه یقولون اللّٰهم اجعله لنا فرطا واجعله لنا اجرا وذخرا واجعله لنا شافعا ومشفعا۔" والله تعالیٰ اعلم۔

☆☆☆☆☆

بسم الله الرحمن الرحیم نحمده ونصلی علی رسوله الکریم

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین مسئلہ مسئولہ ذیل میں؟

ایک بستی کی مجموعی آبادی ۱۵۰ گھر کی ہے اور مسلمانوں کی آبادی تقریباً ۵۰ گھر کی ہے۔ مسلمانوں کی آبادی مسلسل ہے اور مسلمانوں کا محلہ اتر دکھن لانبا ہے، شمالی کنارے سے جنوبی کنارے تک، محلہ کی لانبائی تقریباً چار سو قدم ہے۔ زمانہ قدیم سے ایک مسجد محلہ کے بالکل شمالی کنارے پر ہے، جس میں پنج وقتی اور جمعہ کی بھی نماز ہوتی ہے۔ محلہ چونکہ جنوبی کنارے پر زیادہ آباد ہے اور مسجد شمالی کنارے پر ہے۔ اس لئے بیشتر نمازی پنج وقتی نماز میں مسجد نہیں پہونچ سکتے ہیں۔ اس مسجد میں زیادہ تر لوگوں کے نہیں پہونچنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ مسجد کا راستہ ایک کھار کے کنارے سے ہے، جو برسات کے چار مہینوں میں دس ہاتھ تک (لانبائی میں) دوفٹ پانی میں ڈوبا رہتا ہے اس لئے آمدورفت میں سخت دقت ہوتی ہے۔

متذکرہ بالا مجبوریوں کی وجہ سے بستی کے لوگوں کی اور محلہ کے جنوبی کنارے پر رہنے والے لوگوں کی خواہش ہے کہ جنوبی کنارے پر ایک مسجد پنج وقتی نماز ادا کرنے کے لئے بنائیں (جو لب سڑک وشاہراہ ہوگی)۔ اس لئے دریافت طلب ہے کہ ایسی صورت میں اس مسجد کی بنا درست ہوگی یا نہیں؟ بینوا وتوجروا۔

المستفتی: عبد الغنی عفی عنہ۔ تاریخ بست وچہارم ماہ شوال المکرم ۱۳۶۱ھ

الجواب

صورت مسئولہ میں، جیسا کہ بیان سائل سے معلوم ہوا کہ جس جگہ اب مسجد ہے اور جہاں پر دوسری مسجد بنانی چاہتے ہیں، ان دونوں میں اس قدر بُعد اور دوری ہے کہ اس مسجد کی اذان اُس مسجد تک نہیں جاتی۔ اور بستی کا نقشہ دیکھنے سے بھی معلوم ہوا کہ مسلمانوں کی آبادی اس خطۂ زمین کے قریب ہے۔ جہاں لوگ مسجد بنانی چاہتے ہیں اور اس مسجد بنانے

سے ہرگز اس پہلی مسجد کو نقصان پہونچانا مقصود نہیں، نہ اس کا خیال ہے۔ بلکہ اس مسجد سے یہ فائدہ ہوگا کہ جو لوگ دور ہونے کی وجہ سے اس مسجد میں نہیں جاتے ہیں، اپنے گھروں میں نماز پڑھ لیتے ہیں، اس مسجد کے بن جانے سے وہ لوگ بھی مسجد میں نماز پڑھنے کی وجہ سے ثواب پانے کے مستحق ہو جائیں گے۔ تو ایسی صورت میں اس مسجد کے بنانے میں کوئی مضائقہ نہیں بلکہ بنانے والے اجر و ثواب کے مستحق ہوں گے۔

حدیث شریف میں ہے: "من بنیٰ للہ مسجدا بنی الله له بيتا في الجنة۔" "جو شخص اللہ کے لئے مسجد بنائے یعنی مقصود اس سے خداوند عالم کی رضامندی وخوشنودی ہو، نہ ریا و شہرت، تو اس کے لئے اللہ تعالیٰ جنت میں گھر بنائے گا"۔

بلکہ جتنے لوگ اس میں چندہ دیں گے اور مسجد کے بنانے میں شریک ہوں گے، سب کے لئے یہی اجر ہے کہ خداوند عالم جنت میں ان کے لئے گھر بنائے گا۔

تفسیر روح البیان جلد۲ص ۵۸۲ میں ہے: "واذا اشترك جماعة فى عمارة مسجد فهل يحصل لكل منهم بيت فى الجنة كما لو اعتق جماعة عبدا مشتركا بينهم فانهم يعتقون من النار ويجوزون العقبة لقوله تعالى: "مَا اَدْرَاكَ مَاالْعَقَبَةُ ،فَكُّ رَقَبَةٍ" وقد فسر النبى صلى الله عليه وسلم فك الرقبة بعتق البعض والقياس الحاق المساجد بالعتق لان فيه ترغيبا وحملا للناس على انشاء المساجد وعمارتها۔"

"یعنی اگر ایک جماعت کسی مسجد کی تعمیر کرنے میں شریک ہو تو کیا ہر ایک کے لئے جنت میں گھر ہوگا؟ جس طرح ایک جماعت اپنے مشترک غلام کو آزاد کرے تو وہ سب کے سب آتش دوزخ سے آزاد ہو جائیں گے اور ان سب لوگوں کو عقبہ کی جزاء دی جائے گی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تمہیں کیا معلوم کہ عقبہ کیا چیز ہے؟ غلام آزاد کرنا ہے۔ اور حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فك رقبة کی تفسیر بعض غلام آزاد کرنا، فرمایا ہے۔ اور قیاس یہ ہے کہ مسجد بنانے کو بھی غلام آزاد کرنے کے ساتھ ملحق کیا جائے۔ اس لئے کہ اس میں لوگوں کو ترغیب ہے، مسجد بنانے اور اس کی عمارت پر"۔

رہا قرآن شریف میں ایک مسجد قبا کے ہوتے ہوئے دوسری مسجد بنانے کا ذکر وعید کے ساتھ "وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّكُفْرًا وَّتَفْرِيْقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَاِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ مِنْ قَبْلُ۔" (التوبۃ: ۱۰۷) میں اس وجہ سے ہے کہ ان منافقین نے دوسری مسجد اس لئے بنائی تھی کہ پہلی مسجد کو ضرر پہونچائیں۔ اس کا منشا ان کے اندرونی کفر کو تقویت دینا، مسلمانوں کی جماعت میں تفرقہ اندازی، تشتت وتفرق پیدا کرنا تھا۔ تو جہاں یہ باتیں نہ ہوں گی، دوسری مسجد بنانا، ناجائز نہ ہوگا۔ واللہ اعلم

محمد ظفر الدین قادری رضوی غفرلہ سینیر مدرس مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ، پٹنہ

جواب صحیح ہے مگر فاضل مجیب نے جو شرائط تحریر فرمائے ہیں، ان کی رعایت ضروری ہے۔ خصوصا تشتت وتفرق پیدا کرنا کسی طرح لازم نہ آئے۔

محمد اصغر حسین عفی عنہ ۴؍ ذی الحجہ ۱۳۶۱ھ

مسئلہ مولوی محمد رضوان از کانپور مسجد رنگیان ۱۵ صفر ۱۳۲۳ھ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ مسماۃ ہندہ نے اپنے شوہر کو چھوڑ کر کسب ناجائز اور قدرے تجارت بھی کرتی ہے۔ یعنی سال میں ہزار پانسو کا مال خرید کر فروخت کرتی ہے اس درمیان میں دو چار مکان بھی اس نے خریدا اور وہ مال اس کے پاس کچھ کسب حرام سے پیدا ہوا تھا اور کچھ بطور حلال۔ لیکن یہ امر کہ کس قدر حلال اور کس قدر مال حرام ہے، کچھ معلوم نہیں۔ بعد چند دنوں کے اس مال کی وارث اس کی ماں یعنی ہندہ کی ماں نے اپنی رائے سے ایک مسجد کی تعمیر کیا۔ اب لوگ اس خیال سے کہ مسجد میں روپیہ ناجائز بھی لگا ہے، نماز پڑھنے سے گریز کرتے ہیں۔ لہٰذا عرض ہے کہ من کل الوجوہ اس سے آگاہی دی جائے کہ یوں ہی مسجد بنوانا مال مختلط سے بلا جریان ارث جائز ہے یا نہیں؟ بینوا وتوجروا۔

الجواب

ایسی مسجد میں نماز صحیح ہونے میں تو کلام نہیں۔ اولاً لعدم الاخلال برکن او شرط۔

ثانیاً یہ مسجد مال مختلط سے بنی ہے، نہ خاص حرام سے۔ ایسے مقام پر ہمارے ائمہ ثلٰثہ رضی اللہ عنہم تصریح فرماتے ہیں کہ حرام پر محمول نہ کریں گے جب تک تحقیق نہ ہو جائے کہ یہ شی بعینہ حرام سے ہے۔ فتاویٰ ہندیہ میں ہے فتاویٰ ظہیریہ سے، کہا امام فقیہ ابو اللیث نے، بعضوں نے فرمایا: "یجوز ما لم یعلم انه یعطیه من حرام قال محمدو به نا خذ ما لم نعرف شیئا حراما بعینه وهو قول ابی حنیفة واصحابه۔"

ثالثاً اگر بالفرض مال حرام ہی سے ہے اور مسجد تعمیر کی تو اگر زر حرام دکھا کر بائع سے کہے کہ اس کے بدلے فلاں چیز دیدے پھر وہی روپیہ ثمن میں ادا کرے۔ اور اگر وہ روپیہ نہ دکھایا یا مطلقاً خریدا پھر ثمن میں زر حرام دیا گیا، زر حرام پر عقد کیا اور دیتے وقت مال حلال ادا کیا، تو یہ خریدی شی حسب مذہب مفتیٰ بہ امام کرخی کے حلال ہے۔

تنویر الابصار میں ہے: "تصدق لو تصرف فی المغصوب والودیعة وربح اذا کان متعینا بالاشارة او بالشراء بدراهم الودیعة او الغصب ونقدها وان اشار الیها ونقد غیرها والیٰ غیرها او اطلق ونقدها لا وبه یفتیٰ۔"

درمختار میں ہے: "اکتسب حراما واشتریٰ به او بالدراهم المغصوبة شیئا قال الکرخی ان نقد قبل البیع تصدق بالربح والا لا۔"

ردالمحتار ج ۴ ص ۲۴ پر ہے: "توضیح المسئلة ما فی التتارخانیة حیث قال رجل اکتسب مالا من حرام ثم اشتریٰ فهٰذا علیٰ خمسة اوجه اما ان دفع تلك الدراهم الیٰ البائع اولا ثم اشتریٰ منه بها او اشتریٰ قبل الدفع بها ودفعها او اشتریٰ قبل الدفع بها ودفع غیرها او اشتریٰ مطلقا ودفع تلك الدراهم او اشتریٰ بدراهم اخر ودفع تلك الدراهم قال ابو نصر یطیب له ولا یجب علیه ان یتصدق الا فی الوجه الاول والثانی لا یطیب وفی الثلاث الاخیرة یطیب وقال ابو بکر لا یطیب فی الکل لکن الفتوی الان علیٰ قول الکرخی دفعا للحرج عن الناس اه وفی الوالجیة وقال بعضهم لا یطیب فی الوجوه کلها وهو

المختار لکن الفتوی الان علی قول الکرخی دفعا للحرج بکثرۃ الحرام اھ۔"

رابعاً کسب ناجائز سے جو کچھ ہندہ نے حاصل کیا تھا، جب مخلوط ہو کر وارث یعنی اس کی ماں کے پاس پہنچا اور اس کو اس مال کی کوئی تفصیل معلوم نہیں کہ کس کس سے لیا اور کتنا کتنا لیا، تو اس کے لئے یہ حلال ہے۔

شامی میں ہے: "وان کان مالاً مختلطا مجتمعا من الحرام ولا یعلم اربابه ولا شیئا منه بعینه حل له والاحسن دیانة التنزه عنه اھ۔"

اسی کے باب الحظر والاباحۃ میں ہے: "فی المجتبیٰ مات و کسبه حرام فالمیراث حلال۔" اور مال حلال سے جو مسجد بنائی گئی، وہ مسجد ہی ہوگی اور اس کو ویران اور خراب کرنا، اپنے دین کو ویران اور خراب کرنا ہے کہ اس مسجد میں صحت نماز میں شک نہیں۔ اور مال مخلوط سے جو مسجد بنائی جائے، وہ بھی مسجد ہے۔ لیکن بنانے والے کو اس کی اجازت نہ تھی کہ جب تک اس حرام سے میراث حاصل نہ کر لیتا مال مخلوط کو دوسرے کام میں صرف کرتا۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

☆☆☆☆☆

مسئلہ از سنبھل ضلع مرادآباد مرسلہ محمد مدنی صاحب ۲ ربیع الآخر ۱۳۳۳ھ

ہادی و رہنما بعد سلام مسنون ملتمس ہوں کہ قصبہ سنبھل میں ایک مسجد کے نیچے دکان ہے۔ جس کے بابت علماء صاحبان فرماتے ہیں کہ اس کا کرایہ لینا منع ہے۔ اور اس وجہ سے اب وہ تہ خانہ یعنی دکان بند کرائی جا رہی ہے۔ جس کے باعث سے مسجد کے دو روپیہ ماہوار کی آمدنی میں فرق آنے والا ہے۔ امر دریافت طلب ہے کہ یہ بات اگر جائز ہو تو معزز فرمائیں کہ اس کو کرایہ پر دیا جائے یا نہیں؟ اور اس کا روپیہ مسجد کے صرف میں آنا چاہئے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب

بلاشبہ مصارف مسجد کے لئے ایسی دکان کو کرایہ پر دینا، اس کا مسجد میں صرف کرنا، موافق مذہب ظاہر الروایۃ جائز و درست ہے، جبکہ تعمیر مسجد سے وہ دکان بنائی گئی ہو۔ جس کا مانع محض جاہل یا مجنون لا یعقل ہے۔ اس کے ثبوت میں تصریحات علماء بکثرت موجود، جس کے آگے مانعین کے اوہام بالکل مردود ہیں۔

بحر الرائق میں ہے: "بخلاف ما اذا کان السرداب او العلو موقوفا لمصالح المسجد فانه یجوز له اذ لا ملك فیه لاحد بل هو من تتمیم مصالح المسجد فهو کسرداب بیت المقدس۔ هذا هو ظاهر المذهب کذا فی ملا مسکین شروح الکنز و حاشیة فتح الله المعین معزیا الی الفتح۔"

درمختار میں ہے: "واذا جعل تحته سردابا لمصالحه جاز کمسجد المقدس کذا فی حاشیته للطحطاوی و رد المحتار للشامی۔"

مگر یہ انہی صورتوں میں ہے جبکہ تعمیر مسجد کے وقت دکان بنائی گئی ہو۔ اور اگر بعد تمامی مسجدیت پھر کسی نے بنا لیا ہو تو درست نہیں۔ کما صرح به العلامة الشلبی لقوله: "فان قیل لو جعل تحته حانوتا و جعله وقفا علی المسجد

قیل لایستحب ذلك ولكنه لو جعل ذالك فی الابتداء ھکذا صار مسجدا وما تحته صار وقفا علیه ویجوز المسجد والوقت الذی تحته ولو انه بنیٰ المسجد اولا ثم اراد ان یجعل تحته حانوتا للمسجد فھو مردود باطل" ھکذا فی الدر المختار ورد المحتار من معتمدات الاسفار۔ واللہ تعالیٰ اعلم

☆☆☆☆☆

مسئلہ از شہر محلہ قراولان مسئولہ مولوی امین اللہ صاحب ۱۳ ؍رجب المرجب ۱۳۲۳ھ

ما قولکم رحمکم اللہ تعالیٰ اس بارے میں کہ مسجد میں خرچہ دینا کیسا ہے؟ اور دینے والے کی فضیلت اور جو کوئی دینے والے کو منع کرے تو کیا عقاب ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب

مسجد میں خرچہ دینا یعنی اس کی تعمیرات میں فروش وحوض وحمام، ودیگر مصارف میں مثل روشنی وغیرہ کے صرف کا اتنا ثواب ہے جس کو شمار میں نہیں لاسکتے۔ اس کا ثواب بما لا عین رأت ولا اذن سمعت ولا خطر علی قلب بشر ہے۔ جو نہ کسی آنکھ نے دیکھا نہ کسی کان نے سنا نہ کسی دل پر اس کا خطرہ گذرا۔

رب العزۃ جل وعلا فرماتا ہے: "اِنَّمَا یَعۡمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنۡ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ" "خدا کی مسجدیں وہی تعمیر کرتے ہیں جو اللہ اور پچھلے دن پر یقین رکھتے ہوں"۔

سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: "ان مما یلحق المومن من عمله بعد مماته مسجدا بناه"۔ "بے شک مسلمان کے ان عملوں سے جن کا ثواب بعد موت بھی ملتا رہتا ہے، وہ مسجد ہے جس کی بنا میں اس نے شرکت کی"۔ اخرجه ابن خزیمة وابن ماجة والبیهقی عن ابی هریرة رضی الله عنه۔

حضور اقدس نبی مکرم نور مجسم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: "من بنیٰ للّٰه مسجدا بنی الله له بیتا فی الجنة۔" "جو شخص اللہ کے لئے مسجد بنائے اللہ اس کے بدلے جنت میں گھر بنائے گا"۔ وفی روایة ولو کمفحص قطاة اگرچہ قطاۃ کے گھونسلے جیسی اور بعض روایت میں ہے موتی اور یاقوت سے۔ رواہ احمد والبخاری ومسلم وابن ماجة وابن حبان وابو حنیفة وابن خزیمة والبزار فی المسند والطبرانی فی الصغیر والترمذی وھو فی الکبیر وایضا فی الاوسط وابن عدی عن سیدنا عثمان وعمر وجابر بن عبد الله وابی ذر وانس بن مالك وابی امامة وابی هریرة واسماء بنت سیدنا الصدیق رضی الله عنهم اجمعین۔

پھر یہ ثواب صرف اسی پر نہیں کہ ساری مسجد خود بنائے یا مال کثیر سے شرکت کرے۔ بلکہ ہر شرکت والے کو، چاہے شرکت پیسوں سے ہو یا روپوں سے یا اشرفیوں سے، سب کو بے کم وکاست اتنا ہی ثواب ملے گا۔ لا ینقص من اجورھم من شیء۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ہزار روپے والے کا سو اور دس روپیہ والے کا ایک روپیہ اور دس آنہ کے مالک کا چار پیسہ، سب ایک حیثیت میں ہے۔ اور جو شخص اسے روکے، سخت گناہگار، آثم، فاسق، مرتکب گناہ کبیرہ، مستحق وعید، مناع للخیر ہے۔ اعاذنا الله

منہ ومن سائر اهل الاسلام بصدقة نبيه صاحب التاج والمقام عليه الصلوٰة والسلام والله تعالیٰ اعلم۔

☆☆☆☆☆

چہ می فرمائید علمائے دین ومفتیان شرع متین اندریں مسئلہا:

اول اینکہ مسجد کہنہ را بجائے دیگر نقل کردن جائز است۔

دوم: آنکہ زیارت قبور از قرآن مجید ثابت است یا از حدیث شریف؟

سوم: گزاردن نماز جنازہ بے نمازی جائز است یا نہ؟

چہارم: اگر شخصے بمیرد، درآں خانہ اندرون سہ روز اتخاذ ضیافت، خواہ دفن کنندگان باشد یا غیر اوشاں جائز است یا حرام؟

پنجم: زیارت قبور بے نمازی چہ حکم دارد؟

ششم: قربانی بقر کردن از قرآن مجید ثابت است یا از حدیث؟

الجواب

(۱) معاذ الله من ذلك مسجد کہنہ را بجائے دیگر نقل ہرگز روا نیست کہ ایں ابطال غرض وقف است کہ اصلا روا نیست۔ لا يجوز تغيير الوقف۔

صاحب فتح القدیر فرمائید: "الواجب ابقاء الوقف علیٰ ما كان عليه" علمائے کرام فرمودہ اند کہ مسجد را مدرسہ یا قبرستان وعکس نتواند کرد۔

در فتاوی عالمگیریہ از سراج الوہاج است: "لايجوز تغيير الوقوف عن هيأته فلا يحول الدار بستانا ولا الخان حماما ولا الرباط دكانا" پس چوں تبدیل ہیئت جائز نیست، تغیر اصل مقصود چگونہ روا باشد۔ آرے اگر حول مسجد ہمہ ویران شد ومسجد از آبادی دور افتادہ ماند وہیچ کس در نمی آید، اگر نقل نہ کنند غاصبان وظالمان مال اورا می برند، ایں گاہ بضرورت بر جواز نقل فتویٰ دادہ اند۔ كما فصله فی رد المحتار۔

(۲) رسول اللہ ﷺ فرمودند: "كنت نهيتكم عن زيارة القبور فزوروا القبور۔" الخمسة عن ابن مسعود رضی الله تعالیٰ عنه۔ ودر قول اللہ عز وجل: "وَلَا تُصَلِّ عَلٰى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ۔" (التوبة: ۸۴) اشارہ است بزیارت قبور مسلمانان۔

(۳) نماز جنازہ بر ہر مسلم متقی باشد یا فاسق سوائے اربعہ مذکورین فی کتب الفقہ کہ در آں تارک الصلوۃ نیست فرض است۔ صاحب درمختار فرمائد: "وهی فرض علی كل مسلم مات خلا اربعة بغاة وقطاع طريق اذا قتلوا فی الحرب الخ۔"

(۴) رسم مذکور سخت قبیح واتخاذ ضیافت مذکور گناہ وناجائز است۔ امام محقق علی الاطلاق در فتح القدیر وعلامہ

حسن شرنبلالی درمراقی الفلاح وامام بزازی درفتویٰ وغیرہم من الاعلام در مصنفات خودش آوردہ اند وعبارت چنیں است
:"یکره اتخاذ الضیافة من الطعام من اهل المیت لانه شرع فی السرور لا فی الشرور وهی بدعة
مستقبحة۔" والله تعالی اعلم۔

(۵) جائز است کہ رقت قلب ودموع چشم وذکر از وہم حاصل است۔ لاجرم علامہ تصریح فرمودند:
"والزیارة بهذا القصد یستوی فیها جمیع القبور۔"

(۲) ازہردو۔ قال الله تعالیٰ:" وَالْبُدْنَ جَعَلْنَاهَا لَكُم مِّن شَعَائِرِ اللّٰهِ لَكُمْ فِيهَا خَيْرٌ
الآیة۔"(الحج: ۳۶)
خود حضور اقدس ﷺ از ازواج مطہرات بقرہ ذبح فرمودہ، صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم را امر فرمودہ اند۔
البخاری عن ام المؤمنین الصدیقه رضی الله تعالیٰ عنها قالت:" ضحّی رسول الله ﷺ عن نسائه با
لبقر۔" وشیخین وابوداؤد از جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما راوی:" امرنا رسول الله ﷺ ان نشترک فی الابل
والبقرة کل سبعة منا فیه بذاته۔" والله تعالیٰ اعلم۔

☆☆☆☆☆

کتاب الزکوٰۃ ۳

مسئلہ از بارہ بنکی قصبہ ردولی مرسلہ محمد الطاف الرحمٰن ۵ جمادی الاخریٰ ۱۳۲۳ھ

کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیانِ شرع متین اس مسئلہ میں کہ زید کے پاس ایک ہزار روپیہ تھا، جس کی تجارت کی۔ بعد ایک سال کے دوسو روپیہ منافع ہوا۔ سال اول میں زکوٰۃ صرف دوسو روپیہ منافع پر لازم ہوگی یا صرف ایک ہزار اصل پر یا دونوں پر؟ بینوا توجروا۔

الجواب

جس تاریخ سے وہ مالک نصاب ہوا، جب اس تاریخ پر سال گزرے گا، اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔ تاریخ مذکور پر دیکھنا یہ ہے کہ اس کے پاس اموال زکوٰۃ میں سے دَین وغیرہ ضروریات سے فاضل، اس وقت کتنا مال ہے؟ خواہ نقد، خواہ مال تجارت، خواہ دوسروں پر قرض۔ ان سب پر زکوٰۃ آنے کی صورت یہ ہے کہ مال تجارت جتنا اس وقت موجود ہو، بازار کے بھاؤ سے اس کی قیمت لگائی جائے۔ جو نفع مال تجارت ہے، وہ اگر اس تاریخ سال، تمام نصاب سے پہلے مل گیا تو وہ بھی حساب کیا جائے گا۔ اگر چہ تمامی سال سے ایک ہی گھڑی پیشتر ملا ہو۔ اور جو نفع اس تاریخ کے بعد ہوگا، وہ اس سال میں محسوب نہ کیا جائے گا۔ سال آئندہ میں اس کا حساب لگایا جائے۔

فتاویٰ عالمگیریہ میں ہے: "ومن كان له نصاب كاملا وفی اثناء الحول وجد مالا من جنسه، ضمه الی ماله وزكاه ولو كان من غير جنسه من كل وجه كالغنم مع الابل فانه لا يضم هكذا فی الجوهرة النيرة فان استفاه بعد حولان الحول فانه لا يضم ويستانف له حول آخر بالاتفاق۔ هكذا فی شرح الطحاوی۔"

والله تعالیٰ اعلم۔

☆☆☆☆☆

مسئلہ مسئولہ واجد علی خاں بریلی محلہ سوداگران ۲۵ ربیع الآخر شریف ۱۳۲۴ھ

مولانا! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

گھانس یعنی پولوں پر عشر واجب ہے یا نہیں؟ اور اس کے مصارف، مصارف زکوٰۃ ہیں یا کیا؟ بینوا توجروا۔

الجواب

پولوں کا طریقہ جس طرح آپ کے گاؤں میں مروج ہے کہ اس کی احتیاط اور نگاہداشت ہوتی ہے، ضرور ان پر عشر ہمارے امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک واجب ہے۔ علماء نے جو حطب اور قصب کو مستثنیٰ فرمایا، اس سے مراد وہی ہے کہ جس سے استغلال ارض مقصود نہ ہو۔ یہاں تک کہ عامہ کتب مذہب مثل بحر، بدائع وردالمحتار ودرمختار وخانیہ وخزانۃ

المفتیین وغیرہا، میں تصریح فرمایا:

واللفظ للاول" انما استثنیٰ الثلاثة لانه لا یقصد بها استغلال الارض غالبا حتی لو استغل بها ارضه وجب العشر اھ۔" "یعنی صاحب کنز نے ان تین چیزوں کو اس لئے مستثنیٰ کیا کہ غالباً ان سے مقصود استغلال ارض نہیں ہوتا۔ حتیٰ کہ اگر کوئی مشغول کرے ان جزؤں کے ساتھ زمین کو، ان میں بھی عشر واجب ہوگا۔

اور مصارف اس کے مصارف زکوٰۃ ہیں۔ فتح القدیر، ردالمحتار اور خانیہ اور فوائد متفرقہ پھر خزانۃ المفتیین میں ہے:" ویصرف العشر الیٰ من یصرف الیه الزکوٰۃ اھ قال فی الجوھرۃ: مصرفه مصرف الزکوٰۃ۔" واللہ تعالیٰ اعلم۔

☆☆☆☆☆

مسئلہ از بنارس محلہ پتر کنڈہ مرسلہ مولوی سید حسن ۲۹ جمادی الاولیٰ ۱۳۲۳ھ

نانا، نانی، بچا کو زکوٰۃ دینا لینا جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب

نانا نانی کو نہیں دے سکتا۔ بچا کو دینا جائز ہے بلکہ اس میں دوہرا ثواب ہے، صدقہ اور صلہ رحمی۔

خانیہ ج ا ص ۱۲۸ میں ہے:" (ای لا یجوز دفع الزکوٰۃ) الیٰ والدیه واجداده وجداته وان علوا من قبل الاباء والامهات ویجوز الیٰ سائر قرابته نحو الاخوۃ والاخوات والاعمام والعمات والاخوال والخالات اھ۔" هکذا فی کنز الدقائق وشرحیه البحر وتبیین الحقائق ۔واللہ تعالیٰ اعلم۔

☆☆☆☆☆

مسئلہ از ملک کاٹھیاوار ضلع راجکوٹ، دھوراجی مرسلہ موسیٰ الان ۴ ربیع الاول ۱۳۲۴ھ

بخدمت فیض درجت، مجدد مائۃ حاضرہ، عالم اہلسنت، مولانا وبالفضل اولانا، کمترین حاجی موسیٰ الان مقام دھوراجی بعد السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ کے عرض رساں ہے کہ بندہ سے زکوٰۃ کے بارے میں جو کچھ کوشش ہوتی ہے، وہ خود بھی کرتا ہے اور دوسروں سے دلا کر حق الٰہیہ ادا کرتا ہے۔ اور اس دینے میں حضرات سادات کرام کو بھی بقول شامی و بحر الرائق ومراقی الفلاح شامل کرتا ہے۔ پر اب مولانا مولوی عبدالحئی صاحب لکھنوی مرحوم کے فتاویٰ جلد اول میں ایک فتویٰ دیکھنے میں آیا، جس میں صاف ممانعت حضرات سادات کو دینے کی لکھی ہے بلکہ شامی بحر الرائق اور مراقی الفلاح کے قول کو صاف نامعتبر لکھا ہے۔ لہٰذا میں متردد ہوں کہ حضرات سادات کرام کے لئے غیروں کے پاس میں جو کوشش کرتا ہوں تو محنت برباد اور گناہ لازم ہوتا ہے۔ اس لئے گذارش ہے کہ حضرات سادات کو زکوٰۃ دینے اور نہ دینے کا جواز یا عدم جواز موافق حکم شریعت غراء کے لکھ کر نا چیز کو اس مخمصہ سے نجات بخشیں اور عنداللہ ماجور وعندالناس مشکور ہوں۔ بینوا توجروا۔

الجواب

بنی ہاشم کو زکوٰۃ وصدقات دینا زنہار جائز نہیں۔ نہ انہیں لینا حلال۔ سیدنا سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے متواتر حدیثیں

اس کے تحریم میں وارد آئیں۔ ہمارے ائمہ ثلثہ بالاجماع بنی ہاشم پر تحریم صدقات فرماتے ہیں اور کافہ فقہا علی الاطلاق اسی پر ماشی اور اجلہ محققین اہل شروح وفتاویٰ وارباب تصحیح وفتویٰ مثل امام ابوبکر مرغینانی صاحب ہدایہ وامام فقیہ النفس قاضی خاں وامام طاہر صاحب خلاصہ وامام صاحب کافی وغیرہم رحمۃ اللہ علیہم اجمعین بے اشعار خلاف، امر جازم کہ مسئلہ میں کوئی روایت ضعیفہ مخالفہ کو بھی نہیں دیتی۔ قابل التفات سمجھنا تو درکنار اور جن بعض نے اس کا ذکر کیا تھا، ساتھ میں یہ بھی فرمایا کہ مذہب کے خلاف اور ظاہر الروایۃ سے جدا ہے۔ جس کے حاکی فقط نوح جامع ہیں۔

مجمع الانہر میں ہے: ”لا تدفع الیٰ ہاشم وھو ظاھر الروایۃ وروی ابو عصمۃ عن الامام انہ یجوز فی زمانہ الخ۔“

اور علماء تصریح فرماتے ہیں کہ جو کچھ ظاہر الروایۃ کے خلاف ہے ہمارے ائمہ کا قول نہیں بلکہ مرجوع عنہ ہے اور مرجوع عنہ پر عمل ناجائز۔

امام خیر الدین ازملی عالم فلسطین اپنے فتاویٰ میں فرماتے ہیں: ”ھذا ھو المذھب الذی لا یعدل عنہ الی غیرہ وما سواہ روایات خارجۃ عن ظاھر الروایۃ وما خرج عن ظاھر الروایۃ فھو مرجوع عنہ لما قرروہ فی الاصول من عدم امکان صدور قوانین مختلفین متساویین عن مجتھد والمرجوع عنہ لم یبق قولا لہ کما ذکروہ وحیث علم ان القول ھو الذی تواردت علیہ المتون فھو المعتمد المعمول بہ الخ۔“

رہا یہ کہ پھر اس زمانہ پر آشوب میں حضرات سادات کرام کی مواسات کیونکر ہو؟

اقول: بڑے مال والے اگر اپنی خاص جیب سے بطور نذر وہدیہ ان حضرات کی خدمت نہ کریں، تو یہ ان کی بے سعادتی بھی ہے۔ وہ وقت یاد کریں جب ان حضرات کے جد امجد صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا ظاہری آنکھوں کو بھی ملجا وماویٰ نہ ملے گا۔ کیا پسند نہیں آتا کہ وہ مال، جو انھیں کے صدقہ میں انھیں کی سرکار سے عطا ہوا، جسے عنقریب چھوڑ کر پھر ویسے ہی خالی ہاتھ زیر زمین جانے والے ہیں، ان کی خوشنودی کے لئے ان کے پاک مبارک بیٹوں پر اس کا ایک حصہ صرف کیا کریں۔ کہ اس سخت حاجت کے دن اس جواد وکریم رؤف ورحیم علیہ افضل الصلوٰۃ والتسلیم کے بھاری انعاموں سے مشرف ہوں اور متوسط حال والے اگر مصارف مستحبہ کی وسعت نہیں دیکھتے تو بحمد اللہ تعالیٰ وہ تدبیر ممکن کہ زکوٰۃ کی زکوٰۃ ادا ہو اور خدمت سادات بھی بجا ہو۔ یعنی کسی مسلمان مصرف زکوٰۃ معتمد الیہ کو جو اس کی بات سے نہ پھرے، مال زکوٰۃ میں کچھ روپے بہ نیت زکوٰۃ دے کر مالک کر دے۔ پھر اس سے کہے کہ تم اپنی طرف سے فلاں سید کو نذر کر دو۔ تو قرض ادا ہو گیا اور خدمت سید کا کامل ثواب اسے اور فقیر دونوں کو ملا۔

ذخیرہ میں اور ہندیہ میں ہے: ”اذا اراد ان یکفن من زکوٰۃ مالہ لا یجوز والحیلۃ ان یتصدق بھا علی فقیر من اھل المیت ثم ھو یکفن بہ فیکون لہ ثواب الصدقۃ ولاھل المیت ثواب التکفین وکذلک فی جمیع البر الخ۔“

مگر اس میں اتنی دقت ہے کہ اگر اس نے نہ مانا تو اس پر کوئی راہ جبر کی نہیں کہ آخر وہ مالک مستقل ہو چکا۔ اسے اختیار ہے، چاہے دے یا نہ دے۔ لہذا فقیر غفر اللہ لہ کے نزدیک اس کا احسن طریقہ یہ ہے کہ مثلاً زکوٰۃ سے بیس روپیہ سید کو نذر یا مسجد میں صرف کیا چاہتا ہے۔ کسی فقیر، عاقل، بالغ، مصرف زکوٰۃ کو کوئی کپڑا مثلاً ٹوپی یا سیر، سوا سیر غلہ دکھائے کہ ہم یہ تمہیں دیتے ہیں مگر مفت نہ دیں گے، بیس روپیہ کو بیچیں گے۔ یہ روپیہ تمہیں ہم اپنے پاس سے دیں گے کہ ہمارے مطالبہ میں واپس کردو۔ اب بیع شرعی کر کے روپے بہ نیت زکوٰۃ اُسے دے۔ جب وہ قابض ہو جائے، اپنا مطالبہ ثمن میں پہلے اول تو خود ہی لے اور وہ انکار نہ کرے گا۔ اور اگر کیا بھی تو یہ جبراً چھین لے کہ وہ اس قدر میں اس کا مدیون ہے۔ اور دائن جب اپنے دَین کی جنس سے مال مدیون پائے تو بالاتفاق بے اس کی رضامندی کے لے سکتا ہے۔ اب یہ روپیہ لے کر بطور خود سید یا بنائے مسجد میں صرف کردے کہ یہ دونوں مرادیں حاصل ہیں۔

درمختار میں ہے: ''یعطی مدیونه الفقیر زکوٰة ماله ثم یاخذ ها من دینه ولو امتنع المدیون مد یده واخذها لکونه ظفر بجنس حقه اه۔'' من الزهر الباسم فی حرمة الزکوٰة علیٰ بنی هاشم لعالم اهل السنة مجدد المأ ة الحاضرة سیدی احمد رضا خان متع اللّٰه المسلمین بطول بقائه۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

☆☆☆☆☆

مسئلہ مرسلہ رحیم بخش خان بہادر

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ! بعد آداب وتسلیمات کے عرض خدمت اقدس ہے۔ جناب عالی! ایک شخص سید زادہ ہے اور وہ شخص قرض دار ہے۔ اور اس شخص کے معاش سے قرض ادا نہیں ہوسکتا ہے۔ اگر زکوٰۃ کے مال سے اس کا قرض ادا کردیا جائے تو جائز ہے یا نہیں؟ ایک شخص کہتا ہے کہ جائز ہے اور ایک شخص کہتا ہے کہ ناجائز ہے۔ تو آپ کیا فرماتے ہیں؟ صحیح طور پر بدلیل لکھ کر روانہ فرمائیں۔ بینوا توجروا فقط۔

الجواب

زکوٰۃ اور اسی طرح تمام صدقات واجبہ، اوساخ الناس حضرات سادات کرام کو دینا ناجائز وحرام، نہ ان کے دیے زکوٰۃ ادا ہو۔

فتح القدیر میں ہے: ''لا تدفع الی بنی هاشم هذا ظاهر الروایة۔''

مجمع الانہر میں ہے: ''لا تدفع الی بنی هاشم وهو ظاهر الروایة۔''

رہا یہ کہ پھر ایسی حالت میں حضرات سادات کرام کی مواسات کیونکر ہو؟ تو اس کا آسان طریقہ یہ ہے کہ کسی مسلمان، مصرف زکوٰۃ، معتمد علیہ کو جو اپنی بات سے نہ پھرے، مال زکوٰۃ سے کچھ روپے بہ نیت زکوٰۃ دے کر مالک کردے۔ پھر اس سے کہے: تم اپنی طرف سے فلاں سید صاحب کو نذر کردو، اس میں دونوں مقصود حاصل ہو جائیں گے کہ زکوٰۃ اس فقیر کو گئی اور یہ جو سید نے پایا، نذرانہ تھا۔ اس کا فرض ادا ہو گیا اور خدمت سید کا کامل ثواب اسے اور فقیر دونوں کو ملا۔

ذخیرہ وہندیہ میں ہے: ''واذا اراد ان یکفن میتا من زکوٰۃ ماله لا یجوز والحیلة ان یتصدق بها علیٰ فقیر من اهل المیت ثم ہ و یکفن به، یکون له ثواب الصدقة ولاهل المیت ثواب التکفین و کذٰلك فی جمیع ابواب البر کعمارة المساجد وبناء القناطیر، الحیلة ان یتصدق بمقدار زکوٰته علیٰ فقیر ثم یامره بالصرف الیٰ هذه الوجوه فیکون للمتصدق ثواب الصدقة وللفقیر ثواب بناء المسجد والقنطرة اه ملخصا۔''

اقول ویظهر لی ان ثواب تلك القرب لهما جمیعا لان من دل علیٰ خیر کان کفاعله والتفصیل فی فتاوینا والله تعالیٰ اعلم۔

صح الجواب **فقیر احمد رضا قادری غفرله**

☆☆☆☆☆

کتاب الصوم ٤

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیانِ شرع متین اس مسئلے میں کہ کیا روزہ ارکان اسلام میں شامل ہے؟ اور قرآن کریم میں ''فَمَنْ شَهِدَ مِنكُمُ الشَّهْرَ'' کی آیت میں ''شهد'' سے کیا مراد ہے؟۔ اہم کتابوں کے حوالے سے مزین کر کے جواب عنایت فرمائیں۔ بینوا توجروا۔

الجواب

بلاشبہ روزہ ماہ مبارک بھی اہم واعظم فرائض اسلام سے ہے۔ جس کی فرضیت خود قرآن شریف میں مذکور اور احادیث صحیحہ ثابتہ سے مدلل ہے۔ قال تعالیٰ: ''شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنَاتٍ مِّنَ الْهُدَىٰ وَالْفُرْقَانِ فَمَن شَهِدَ مِنكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ''۔ (البقرة: ١٨٥) رمضان کا مہینہ وہ ہے (متبرک مہینہ) جس میں قرآن نازل کیا گیا لوگوں کی ہدایت اور رہنمائی کے لئے اور فیصلہ کی روشن باتیں، تو جو شخص پائے تم میں سے اس مہینہ کو اسے چاہئے کہ روزہ رکھے۔ ''فَمَنْ شَهِدَ مِنكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ'' کی تفسیر میں مفسرین کے متعدد اقوال ہیں۔ چند اقوال جو اس وقت نظر فقیر میں ہیں، قلمبند ہوتے ہیں۔

(۱) تفسیر بیضاوی، جلالین، مدارک، تفسیر خازن، ابن جریر طبری، تفسیر نیشاپوری، درمنثور، تفسیر واحدی، تفسیر حسینی، معالم التنزیل، تنویر المقیاس، روح المعانی، بحر المحیط، النہر، تفسیر کبیر، تفسیر کشاف، تفسیر ابن کثیر، فتح البیان قنوجی، میں ہے: واللفظ للاول ''فمن حضر فی الشھر ولم یکن مسافرا فلیصمه'' یعنی جو شخص رمضان کا مہینہ اپنے گھر میں پائے اور مسافر نہ ہو تو اسے چاہئے کہ روزہ رکھے۔

(۲) تفسیر بیضاوی، تفسیر حسینی، روح البیان، بحر المحیط میں ہے: واللفظ للبیضاوی ''فمن شهد منکم هلال شهر فلیصمه'' یعنی جو شخص تم میں سے رمضان کا چاند پائے تو اسے چاہئے کہ روزہ رکھے۔

روح المعانی میں اتنا اور بڑھایا ''وتیقن به'' یعنی رمضان کا چاند پائے اور اسے تیقن ہو تو اسے چاہئے کہ روزہ رکھے۔ بحر المحیط میں یہ معنی لکھ کر محاورہ کے اعتبار سے اس معنی کو ضعیف کہا کہ محاورہ شهدت الهلال نہیں کہتے بلکہ شاهدت۔

اقول وهذا کما تری لانك تقول شهدت الهلال لما رأيته وشهدت الهلال اعم منه کما صرح به فی نفسه لقوله وشهد من الشهود والترکیب یدل علی الحضور اما ذاتا او علما وقد قیل لکل منهما۔

(۳) تفسیر فتح الرحمان علامہ شیخ علی مہائمی میں ہے: ''(فمن شهد) ای علم (منکم الشهر) باستکمال شعبان او شاهد الهلال (فلیصمه)۔'' یعنی تم میں سے جس کو ماہ رمضان کا علم ہو شعبان کے دیکھنے سے تو اسے چاہئے کہ روزہ رکھے۔

(۴) تفسیر کبیر میں ہے: "(فمن شهد) ای من شاهد الشهر بعقله و معرفته (فليصمه)" یعنی جو شخص ماہ رمضان کو حاضر جانے اپنی عقل سے، معرفت سے تو اسے چاہئے کہ روزہ رکھے۔ اگر چہ بظاہر متعدد اقوال معلوم ہوتے ہیں مگر سب ایک ہیں لما فيه بمنزله قيود و احترازات۔ خلاصہ یہ کہ جسے رمضان شریف کا علم ہو، خواہ چاند دیکھ کر یا ثقہ عادل کی گواہی سے، ورنہ شعبان کے تیس دن پورا کر کے اس پر فرض ہے کہ رمضان کا روزہ رکھے، جب کہ عاقل بالغ مکلف مقیم تندرست غیر معذور ہو۔ اس لئے کہ شہود کا معنی علم کے ہیں۔ کما صرح به المهائمی فی فتح الرحمان و اشار اليه النووی فی "روح المسائل فی الفروع" لقوله شهود الشهر اما بالروية والسماع و الخازن لقوله" وقيل هو محمول على العادة شهود الشهر ای روية الهلال ولذالك قال النبی صلی الله عليه وسلم صوموا الروية و افطروا الروية اخرجاه فی الشيخين ولا خلاف انه يصوم رمضان من رائ الهلال ومن استكمل شعبان وفصله الامام الرازی فی الكبير كما هو دابه حيث قال: "اعلم ان قوله تعالى فمن شهد منكم الشهر فليصمه يستدعی بحثين ۔ البحث الاول ان شهود الشهر بما ذا يحصل؟ فنقول اما بالروية واما بالسماع فنقول اذا رأى انسان هلال رمضان فأما ان يكون منفردا بتلك الروية أو لا يكون؟ فان كان منفردا بها فأما ان يرد الامام شهادته أو لا يردها؟ فان تفرد بالروية ورد الامام شهادته لزمه ان يصوم لأن الله تعالى جعل فی حقه فوجب ان يجب عليه الصوم واما ان انفرد بالروية وقبل الامام شهادته أو لم ينفرد بالروية فلا كلام فی وجوب الصوم واما السماع فنقول اذا شهد عد لان على روية الهلال حكم به فی الصوم والفطر جميعا و اذا شهد على هلال رمضان يحكم به احتياطا لامر الصوم۔" (التفسير الكبير ۲۵۶/۵)

ان دونوں اکابر مفسرین کی تصریح سے یہ بات صاف طور پر معلوم ہوئی کہ من شهد منكم الشهر کے معنی من علم کے ہیں۔ اور یہی مفہوم حدیث شریف "صوموا الروية و افطروا الروية" کا ہے۔ كما نص عليه الخازن و بعد تصريحات العلماء فی كتب اللغة لسان العرب بين الروية النظر بالعين و القلب۔ اسی میں ہے: "وروية القلب هو العلم"

تو حدیث شریف کا مطلب یہ ہوا کہ روزہ رکھو رمضان کا، خود چاند دیکھ کے یا دو عادل کی رویت پر بھروسہ کر کے یا شعبان کے تیس دن پورے کرلو کہ اس کے بعد کا دن ضرور رمضان ہی کا ہے۔ یونہی افطار کرو عید کا چاند دیکھ کر ورنہ دو عادل کی رویت پر بھروسہ کر کے ورنہ ماہ رمضان کا تیس دن پورا کر کے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

☆☆☆☆☆

عید کا چاند

(رسالہ مبارکہ "عید کا چاند" کے آغاز میں مرتب قیس محمد خاں قادری رزاقی کے وہ مراسلات ہیں جوانہوں نے امیر جماعت اہل حدیث اور امیر شریعت پھلواری شریف کی خدمت میں چاند کی بابت ارسال کئے تھے۔ پھر ان پر

مفصل تنقیدی تبصرہ اور ماہنامہ نقیب کے ایڈیٹر کے مضمون کا علمی محاسبہ ہے۔ چونکہ یہ چیزیں زیر نظر کتاب سے غیر متعلق تھیں، اس لئے انہیں حذف کر دیا گیا۔۱۲ ساحل)۔

کیا فرماتے ہیں علمادین ومفتیان شرع متین ان مسئلوں میں:

(۱) روزہ رکھنا کب فرض ہوتا ہے اور کب روزہ کھولنا اور عید کرنا واجب ہوتا ہے؟

(۲) چاند دیکھنے سے کیا مراد ہے؟ ہر مقام اور ہر شہر والوں کو خود ان کے دیکھنے پر حکم ہوگا یا ایک جگہ کی رویت سے دوسری جگہ روزہ رکھنے اور کھولنے کا حکم ہوگا اور کب؟

(۳) اگر اس بارے میں علما کے اقوال مختلف ہیں تو ان قولوں میں کس پر فتویٰ ہے کس پر عمل کرنا چاہئے؟

(۴) مشرق مغرب کا ایک حکم ہونا اس وقت تھا جب رسل ورسائل کے ذرائع محدود تھے۔ اب سارے کرۂ زمین کی خبر چند منٹوں میں معلوم ہو جاتی ہے۔ ایسے وقت لندن کے افق پر چاند ہونے کو ہندوستان کے افق پر ماننا کیونکر ممکن ہے؟

(۵) زمانے کی ایجادات ریڈیو، تار، ٹیلیفون، ٹرنک کال وغیرہ سے جب خبروں کی آسانیاں پیدا ہو چکی ہیں تو ان کو نہ ماننا اور لکیر کے فقیر بنے رہنا خود کو سو برس پیچھے دھکیل دینے کے مرادف ہے اور اس بارے میں عام علمائے ہندوستان کا کیا فتویٰ ہے؟

(۶) سننے میں آیا ہے ۱۹؍اگست کو مراد آباد میں جمعیت العلما نے متفقہ طور پر فتویٰ دیا ہے کہ ریڈیو کے ذریعہ ثبوت ہلال کی خبر دی جا سکتی ہے۔ اس فتوے کے متعلق جناب کی کیا رائے ہے؟

امید کہ ان سوالوں کے جوابات آیات واحادیث وکتب فقہیہ کے علاوہ حضرت امیر شریعت اول جناب مولانا سید شاہ بدرالدین صاحب سجادہ نشین پھلواری شریف قدس سرہٗ کی تحقیقات کی روشنی میں تحریر فرمایا جائے تو بہت بہتر ہو کہ خود غرضوں کے سوا صوبہ بہار کے علما وعوام کسی کو ماننے میں نہ عار ہو اور نہ کسی کو ہمت انکار ہو۔ بینوا توجروا۔

قیس محمد خاں قادری رزّاقی عفی عنہٗ محلہ مغلپورہ پٹنہ سٹی ۲۲؍اگست ۱۹۵۱ء

الجواب

جواب سوال اول: قال اللہ تعالیٰ: شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنْزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ هُدًى لِلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ: ''رمضان کا مہینہ جس میں قرآن اترا لوگوں کے لئے ہدایت اور راہ نمائی اور فیصلہ کی روشن باتیں تو تم میں جو کوئی پائے یہ مہینہ ضرور اس کے روزے رکھے۔

مَن سے مراد عاقل بالغ تندرست مسلمان ہیں۔ شہد یا شہود سے ہے جس کے معنی ہیں حاضری یا حضر میں ہونا جو سفر کا مقابل ہے یعنی جو مسلمان عاقل بالغ اس مہینے رمضان میں مسافر نہ ہو بلکہ مقیم ہو تو اس پر روزے رکھنا

فرض ہیں۔ یا مشاہدہ سے بنا ہے یعنی تم میں سے جو کوئی ماہ رمضان کا چاند مشاہدہ کر لے تو اس میں روزہ رکھے۔

تفسیر ابو سعود میں ہے: ''فمن شهد منكم الشهراى حضر فيه ولم يكن مسافرا وقيل من شهد منك هلال الشهر فليصمه''

تفسیر کبیر میں ہے: ''(المسئلة الثانية) شهداى حضر و الشهود الحضور ثم ههنا قولان احد هما ان مفعول شهد محذوف لان المعنى فمن شهد منكم البلدا و بيته بمعنى لم يكن مسافرا والقول الثانى مفعول شهد هو الشهرو التقدير من شاهدا لشهر بعقله ومعرفته فليصمه'' تفسير كبير جلد (۲ ص ۱۸۴)۔

حدیث شریف میں ہے: ''اذا رايتم الهلال فصوموا واذا رايتم فافطروا وان غم عليكم فعدوا ثلثين يوما'' ''جب دیکھو رمضان شریف کا چاند تو روزہ رکھو اور جب دیکھو شوال کا چاند تو افطار کرو اور اگر چاند نظر نہ آئے تو گنتی تیس دن پوری کرو''۔ رواه الامام احمد والبيهقى عن جابر رضى الله عنه ورواه الامام احمد ومسلم والنسائى وابن ماجه عن ابى هريره ورواه النسائى و ابن ماجه عن ابن عباس ورواه ابو داؤد من حذيفة''۔

دوسری حدیث میں ہے: ''اذا جاء رمضان فصم ثلاثين الا ان نرى الهلال قبل ذلك'' ''جب رمضان شریف کا مہینہ آئے تو تیس دن روزہ رکھو مگر یہ کہ تیس کے قبل عید کا چاند دیکھا جائے تو ۲۹ ہی دن روزہ رکھنا ہوگا''۔ رواه الطبرانى فى الكبير عن عدى بن حاتم رضى الله عنه۔

تیسری حدیث میں ہے: ''اذا رائيتم الهلال فصوموا واذا رايتموه فافطروا فان غم عليكم فاقدروا له رواه البخارى و مسلم والنسائى وابن ماجه وفى رواية فان غم عليكم فعدوا ثلثين''۔ رواه الطبرانى فى الكبير عن طلق بن على رضى الله عنه۔

اس مضمون کی حدیثیں اس قدر ہیں جو اہل علم سے مخفی نہیں، جن کا خلاصہ حکم یہ ہے کہ رمضان کا چاند دیکھ کر روزہ رکھو اور عید کا چاند دیکھ کر روزہ افطار کرو اور اگر ۲۹ کو چاند نظر نہ آئے تو تیس دن پورے کرو۔ حضرت امیر شریعت اول رحمہ اللہ استفتائے رویت ہلال کے ص ۳ میں فرماتے ہیں: فمن شهد منكم الشهر فليصمه۔ تو جو کوئی تم میں سے حاضر ہو یعنی پائے اس مہینہ کو تو چاہے کہ اس میں روزہ رکھے شهد کے معنی حضر کے ہیں۔ یہاں مقصود یہ ہے کہ جو مسلمان اس مہینے کو پائے اس حال میں کہ مکلف بالشرع اور تندرست و مقیم ہو، اس پر اس مہینہ کا روزہ فرض ہے۔ بیمار و مسافر کو اس کے بعد کی آیہ شریفہ میں قضا کرنے کی رخصت دی گئی ہے۔ مفسرین نے فمن شهد منكم الشهر فليصمه کے کئی معنی کیے ہیں۔ از انجملہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے: هو اهلاله بالدار اپنے گھر میں

مقیم ہو اور رمضان مبارک کا چاند دیکھے تو چاہئے کہ روزہ رکھے۔ یعنی ضرور ہے، فرض ہے کہ روزہ رکھے۔ اس آیت کریمہ سے ثابت ہے کہ شہود ماہ رمضان سے اہل اسلام پر روزہ فرض ہو جاتا ہے اور شہود رمضان سے غرض ماہ رمضان کا چاند دکھائی دینا ہے۔

پھر اسی استفتا کے ص ۵ پر تحریر فرماتے ہیں اور اگر آسمان صاف ہونے کے ساتھ ۲۹/ کو چاند نہ دیکھا گیا، وہاں کے آدمی نے چاند نہ پایا، وہ شعبان کا ۳۰ دن پورا کرنے کے بعد ماہ رمضان جانے اور روزہ رکھے پھر اگر ۲۹/ شعبان کو ابر ہونے کے سبب سے چاند ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ نہ ہو سکے تو بھی شعبان کا ۳۰ دن پورا کرنا ہوگا۔ کیونکہ آیۂ کریمہ کے موافق اس نے رمضان کا مہینہ ابھی پایا نہیں ہے۔ ہاں اگر قرب وجوار سے ۲۹ کے چاند ہونے خبر کی تحقیق ہو جائے، مسلمان چاند دیکھنے والے کی گواہی سے چاند ہونے کی تصدیق ہو جائے تو ۲۹ ہی کے حساب سے مہینہ لیا جائے گا اور روزہ بھی اسی حساب سے فرض ہوگا۔

پھر اسی استفتاء کے ص ۹ پر اس مسئلہ کو حدیث جامع ترمذی: ''صوموا لرویتہ وافطروا لرویتہ فان حالت دونکم غیابۃ فاکملوا ثلثین یوما'' ''چاند دیکھ کر روزہ رکھو اور افطار کرو چاند دیکھ کر، اور اگر بدلی حائل ہو جائے (چاند دیکھنے سے) تو تیس دن مہینے کا پورا کرو''، سے مدلل کرنے کے بعد فرماتے ہیں: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ حکم یہ ہے کہ بدلی حائل ہونے کے سبب سے اگر ۲۹ شعبان کو چاند نہ ہو تو تیس دن پورا کر کے روزہ رکھو اور اگر عید کا چاند ۲۹ رمضان کو نظر نہ آئے تو تیس دن روزے کے پورے کرو، نہ یہ کہ دور کے شہر و ملک کی روایت کی خبر تار برقی پر منگاؤ اور اس برقی خبر پر ۲۹ دن کے بعد روزہ رکھ لو یا عید مناؤ اور روزہ کو رخصت کر دو۔

پھر بحوالہ علامہ عینی ابو عمر یعنی ابن عبد البر کا قول نقل کرتے ہیں: ''لا یصح اعتقاد رمضان الا برویۃ فاشیۃ او شہادۃ عادلۃ او اکمال شعبان ثلثین یوما وعلیٰ مذہب جمہور فقہاء الامصار بالحجاز والعراق والشام والمغرب'' ماہ رمضان ہونے کا اعتقاد صحیح نہیں مگر صاف ظاہر رویت ہلال سے یا عادل کی گواہی سے یا ماہ شعبان کا تیس دن پورا کرنے سے۔ اسی پر بلاد حجاز اور عراق اور شام اور ملک مغرب کے جمہور فقہا کا مذہب ہے۔

پھر فرماتے ہیں: اور جمہور فقدروا کے معنی کہتے ہیں اکملوا! یعنی پورا کرو تیس دن۔ حدیث کا مفاد یہ ہے کہ ابتدائے ماہ میں روزہ کا واجب ہونا اور انتہائے صوم میں افطار کا واجب ہونا، دونوں ہی کا تعلق چاند ہو جانے سے ہے اور چاند کا ہونا اپنی جگہ یا قرب وجوار کی رویت پر ہے، نہ حساب نجوم پر، نہ اور شہروں سے برقی خبر منگانے پر۔

نیز امیر شریعت اول رحمہ اللہ اسی استفتا کے ص ۱۳ پر فرماتے ہیں: ابر کی حالت میں تیس دن کا مہینہ پورا کرنا شعبان میں ہو یا رمضان، ہر ایک میں ہے۔ عقود الجواہر ''المنیفۃ فی روایۃ الامام ابی حنیفہ رحمہ اللہ''

میں مرتضی زبیدی رحمۃ اللہ لکھتے ہیں: ”وفیہ عن الحکم یتعلق بالرویۃ ولا عبرۃ بقول الموقنین وان کانو اعدو لا فی الصحیح و ھو مذھب الجمھور الامن شذمن المتاخرین۔“ اس روایت میں حکم چاند دیکھنے کے متعلق ہے اور یقین سے بتانے والے کے قول کا اعتبار نہیں اگر چہ وے عادل ہوں۔ صحیح اور جمہور کا مذہب یہی ہے کہ اگر چاند نکلنے کی جگہ آسمان میں ابر یا غبار کی وجہ سے رویت نہ ہو اور قرب وجوار سے رویت کی خبر آئے تو ماہ رمضان کے چاند کی تصدیق ایک مسلمان کی گواہی سے ہو جائے گی عادل ہو یا نہ لیکن فاسق نہ ہو اور ماہ شوال کی رویت کے لئے دو گواہ عادل کا ہونا چاہئے۔ غیر عادل یا ایک کی گواہی افطار کے لئے معتبر نہیں“

یہ چند اقتباسات استفتائے رویت ہلال کے بحوالہ صفحے لکھے گئے۔ اب حضرت امیر شریعت اول رحمہ اللہ کے جواب استفتائے رویت ہلال کے چند اقتباسات تمام علمائے ہند خصوصاً حضرات صوبہ بہار کے لئے پیش کرنا مناسب جانتا ہوں جس سے مسئلہ روز روشن کی طرح واضح اور ابین ہو جائے۔ جواب ص ۵ پر لکھتے ہیں: درمنثر میں جلال الدین سیوطی لکھتے ہیں: ”واخرج الحاکم و صححہ والبیھقی فی سننہ عن ابن عمر قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: جعل اللہ الا ھلۃ مواقیت للناس فصوموالرویتہ وافطر والرویتہ فان غم علیکم فعد واثلثین“۔ ”حاکم نے اس کو روایت کیا اور صحیح بتایا ہے اور بیہقی نے اپنی سنن میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: خدا نے چاندوں کو لوگوں کے اوقات بتانے کو بنایا ہے تو روزہ رکھو اسے دیکھ کر اور افطار یعنی فطر یوم عید کرو اس کو دیکھ کر۔ پھر اگر وہ تم پر پوشیدہ ہو جائے تو تیس دن رمضان کے شمار کرلو“۔

پھر ص ۱۰ پر فرماتے ہیں: قاضی ابوبکر بن عربی مالکی اپنی تفسیر احکام القرآن میں لکھتے ہیں: ”محمول علیٰ العادۃ بمشاھدۃ الشھروھی رویۃ الھلال و کذلك قال صلی اللہ علیہ وسلم: صوموالرویتہ وافطر والرویتہ“ یہ مہینہ دیکھنے کی عادت پر محمول ہے اور وہ چاند دیکھنا ہے۔ ایسا ہی آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: روزہ رکھو چاند دیکھ کر اور افطار کرو (یعنی مہینہ تمام کرو) چاند دیکھ کر۔

پھر اس جواب کے ص ۱۲ پر تحریر فرماتے ہیں: رمضان مبارک کا چاند ہونے کے بعد روزہ کی ابتدا ہوتی ہے۔ اسی طرح رویت شوال پر روزہ کا تمام ہونا بھی ہے۔ تفسیرات احمدیہ میں ملا احمد لکھتے ہیں: ”وفیہ اشارۃ الیٰ ان الصوم والفطر یعتبر برویۃ الھلال وھو الذی علیہ اسم الشھر سواء کان تسعۃ وعشرین او ثلاثین یوما کاملا“ ”اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ روزہ اور فطر کا اعتبار کیا جاتا ہے چاند دیکھنے پر اور اسی پر مہینے کا نام ہے، خواہ انتیس دن کا ہو یا پورے تیس دن“۔

پھر فرماتے ہیں: اور تفسیرات احمدیہ میں ملا احمد معروف بہ ملا جیون لکھتے ہیں: ''ای یرید الله ان تکملوا مدة رمضان من الھلال الیٰ الھلال کاملة اذا کان خطابالکل من علیه الصوم او تکملوا عدة قضائه اذا کان خطابا بالمسافر والمریض خاصة"۔ "حضرت تعالیٰ چاہتے ہیں کہ رمضان کا شمار ایک چاند سے دوسرے چاند تک کامل پورا کرو، جب خطاب ان کی طرف سمجھا جائے کہ جن پر روزہ فرض ہے یا یہ معنی کہ قضا شدہ روزہ کو گن کر پورا کرو جب خطاب خاص کر مسافر یا بیمار کے لئے سمجھا جائے'' اور اسی قول کو علامہ عبدالعزیز کی تفسیر فتوحات ربانیہ اور ابو حبان اندلسی کی تفسیر بحرالمحیط اور امام جلال الدین سیوطی کی تفسیر درمنثور کی عبارات سے اور تقویت پہونچائی۔

الحمدللہ کہ جواب سوال اول کا آیۂ کریمہ تفسیر، حدیث کے علاوہ حضرت امیر شریعت اول رحمہ اللہ کے استفتائے رویت ہلال و جواب استفتائے رویت ہلال کے اقتباسات سے جن کو حضور نے بیس کتابوں کی عبارات سے مبرہن و مدلل فرمایا ہے، مختصراً ہدیۂ ناظرین ہے۔ وہ سوال و جواب جس کو ذاتی رائے کہہ کر رد کیا جاتا ہے اور حضرت امیر شریعت اول رحمہ اللہ کے فتویٰ کی پرواہ نہیں کی جاتی ہے۔ یہ وہ تحریر ہے جس سے روز روشن کی طرح واضح ہوگیا کہ رمضان شریف کی ابتدا اور اسی طرح عید بھی چاند دیکھنے ہی سے ہوتی ہے اور ۲۹ شعبان کو چاند نہ ہو تو تیس دن پورے کر کے روزہ رکھنا فرض ہوگا اور اسی طرح اگر شوال کا چاند ۲۹ر رمضان کو نہ ہو تو تیس دن پورے روزہ رکھ کر عید کرنی ہوگی۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

جواب سوال دوم: اس بارے میں علما کے تین قول ہیں:

پہلا قول: ہر شہر کی رویت اسی شہر والوں کے لئے ہوگی۔ دوسری جگہ والوں کے لئے اس کا حکم نہ ہوگا۔ یہ قول قاسم، سالم، عکرمہ، اسحٰق وغیرہ کا ہے۔ یہی مذہب اہل حدیث کا ہے۔

امیر جماعت اہل حدیث مولانا حکیم سید عبدالخبیر صاحب اپنے فتویٰ مسلکہ جامعہ الاقوال فی رویۃ الھلال ص ۴۷ میں سوال ایک جگہ کے چاند دیکھنے سے دوسری جگہ کے لوگوں کے لئے روزہ، عید الفطر، عید اضحیٰ کا حکم ہوگا یا نہیں؟ کے جواب میں لکھتے: ہیں ایک جگہ کے لوگوں کے چاند دیکھنے سے دوسری جگہ کے لوگوں کے لئے اس چاند کا حکم نہیں چل سکتا: جیسا کہ صحیح مسلم کی روایت میں حضرت کریب کے واقعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ ملک شام سے مدینہ منورہ پہونچے اور انہوں نے شب جمعہ کے چاند دیکھنے کی خبر دی اور مدینہ والوں نے چاند شب شنبہ کو دیکھا تھا تو حضرت عبداللہ ابن عباس نے اس روایت کو مدینہ والوں کے لئے نہیں قبول کیا اور یہ کہا کہ ہم اپنی رویت کے حساب سے روزہ رکھیں گے اور یہ صرف اپنی ہی رائے نہیں بیان فرمائی بلکہ فرمایا ھکذا امرنا رسول الله صلی الله علیه وسلم۔

حضرت امیر شریعت اول رحمہ اللہ استفتائے رویت ہلال ص ۷ پر حدیث مسلم شریف مذکور ترمذی شریف سے

نقل کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں: جامع ترمذی میں اس مضمون کا ایک باب ہی قائم کیا ہے باب ماجاء لکل بلد رویتهم پھر اس حدیث کو نقل اور ترجمہ کر کے شرح مسلم نووی سے اس کے فوائد و اقوال نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں: اس روایت میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا اپنا اجتہاد نہیں ہے کہ انہوں نے بتادیا کہ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں ایسا ہی کرنے کو حکم فرمایا ہے اور اس بنا پر اہل ملک شام کے چاند دیکھنے اور ان سب کے مع امیر کے روزہ رکھنے کی خبر سننے کے ساتھ امر نبوی ہی پر اپنا معمل رہنا ظاہر کیا۔

نیز جواب استفتائے رویت ہلال ص ۳۳ پر محمد ابوالطیب سندی کی شرح جامع ترمذی سے نقل فرماتے ہیں

''قوله هكذا امرنا رسول الله صلى الله عليه وسلم يحتمل ان يكون معناه انه امرنا ان لانقبل شهادة الواحد فى حق الا فطار او انه امر نابان نعتمد علىٰ روية اهل بلد نا و لا يعتمد علىٰ روية غير اهل بلد نا و المصنف حمله علىٰ المعنى الثانى فلذا استدل به''۔ ''حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا کہنا کہ ہم کو ایسا ہی حکم دیا ہے حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے، احتمال رکھتا ہے اس کا معنی ہو کہ آپ نے ہم کو حکم دیا ہے کہ ایک شخص کی شہادت افطار کے بارے میں ہم قبول نہ کریں یا یہ کہ ہمیں آپ نے حکم دیا ہے کہ اپنے شہر والوں کی رویت پر ہم اعتماد کریں اور اپنے شہر کے سوا دوسرے شہر کی رویت پر اعتماد نہ کیا جائے۔ مصنف (امام ترمذی) نے اس کو معنی دوم پر حمل کیا اور اسی بنا پر اس حدیث سے استدلال کیا''۔

پھر ص ۳۹ پر ترمذی شریف کے دوسرے شارح سراج احمد رحمہ اللہ سے نقل فرماتے ہیں: ''ظاهره اعتبار اختلاف المطالع قال الخطابى ذهب الىٰ ظاهره القاسم و سالم وعكرمة وهومذهب اسحٰق وقالوا ان لكل قوم رويتهم انتهى''۔

''اس حدیث کا ظاہر اختلاف مطالع کا اعتبار کرنا ہے خطابی نے کہا کہ اس حدیث کے ظاہر کی طرف قاسم، سالم اور عکرمہ رحمہم اللہ گئے ہیں اور یہ مذہب اسحٰق کا ہے اور ان سب نے کہا کہ ہر قوم کے لئے ان کی رویت معتبر ہے۔ انتہیٰ''۔

دوسرا قول: یہ ہے کہ دوسری قریب جگہ کی رویت کا اعتبار کیا جائے گا، دور کی رویت معتبر نہ ہوگی۔ پھر قریب اور دور کی حدوں میں اختلاف ہوا ہے۔ اس بارے میں علما کے پانچ قول ہیں:

(۱) جہاں تک نماز قصر نہیں کی جاتی ہے، وہ قریب ہے اور جہاں نماز قصر کی جاتی ہے وہ دور ہے۔

(۲) جہاں تک مطلع واحد ہو وہ قریب ہے اور جہاں کا مطلع دور ہو وہ دور ہے

(۳) جہاں تک اقلیم کا اتحاد ہو، وہ قریب ہے اور دوسری اقلیم دور ہے یعنی ایک اقلیم میں کسی جگہ چاند ہونے سے پورے اقلیم میں روزہ رکھنا افطار کرنا فرض ہوگا۔ دوسری اقلیم میں یہ حکم نہ ہوگا۔

(۴) ایک مہینہ سے کم کی راہ ہو تو وہاں ایک حکم ہوگا اور مہینہ بھر سے زیادہ کی راہ ہو تو وہاں چاند ہونے سے دوسری جگہ نہ ہوگا اور مراد اس راہ سے پیدل چلنے کی راہ ہے، نہ موٹر، ریل گاڑی، ہوائی جہاز سے۔

(۵) ۲۴ فرسخ سے کم ہو تو ایک حکم ہوگا اور اس سے زائد فاصلہ ہو تو دور سمجھا جائے گا۔

حضرت امیر شریعت اول استفتا رویت ہلال ص ۶ پر تحریر فرماتے ہیں: ''ہاں اگر قرب وجوار سے ۲۹ کے چاند ہونے کی تحقیق ہو جائے، مسلمان چاند دیکھنے والے کی گواہی سے چاند ہونے کی تصدیق ہو جائے تو ۲۹ ہی کے حساب سے مہینہ لیا جائے گا اور روزہ بھی اسی حساب سے فرض ہوگا۔ کیونکہ یہاں ابر کے حائل ہونے کی وجہ سے چاند نظر نہ آیا اور قرب وجوار میں کسی جگہ مطلع سے ابر ہٹا ہونے کے سبب سے نظر آ گیا اور وہاں سے خبر تصدیقی آ گئی تو یہاں کے لوگ بھی مہینہ پانے والے سمجھے جائیں گے اور روزہ رکھنا فرض ہوگا جب قرب وجوار کے دیکھنے کی تصدیق ہو گئی تو اگر ابر کا حجاب نہ ہوتا تو یہاں بھی دیکھا جاتا، اس کی تصریح کی حدیث شریعت سے ظاہر ہوتی ہے (اس جگہ حضور نے حدیث اعرابی مروی عن ابن عباس نقل کر کے ترجمہ کیا پھر فرمایا) اور منزلوں دور سے ۲۹ کے چاند کی خبر آئے تو اس پر اعتبار نہ ہوگا اس لئے کہ فمن شهد منكم سے مخاطب وہیں تک کے لوگ ہو سکتے ہیں جہاں تک کا مطلع ایک ہے، نہ یہ کہ جہان بھر کے لوگ مطالع مختلف کے رہنے والے اختلاف مطالع کے اعتبار سے مسافت بعیدہ کی رویت ہلال پر عمل نہ کرنا، یہ بھی حدیث میں آ گیا ہے (اس جگہ حضور نے کریب والی حدیث ترمذی شریف سے نقل کر کے اس کا ترجمہ کیا پھر تحریر فرمایا) صحیح مسلم میں بھی ایسا ہی ہے اور امام نووی اس کی شرح میں لکھتے ہیں کہ رویت ہلال (ایک جگہ کی) سب لوگوں کے لئے عام نہیں ہوتی بلکہ ایسی مسافت قریبہ تک جہاں تک نماز قصر نہیں کی جاتی، خاص ہے۔ کہا گیا ہے کہ جہاں تک مطلع واحد ہو یا اقلیم کا اتفاق ہو، ان سب کو روزہ لازم ہوگا۔ نہیں تو نہیں۔

اسی میں طحطاوی حاشیہ درمختار سے ہے ص ۱۶: ''واطلق المصنف فشمل ما اذا كان بينهما تفاوت بحيث مختلف المطلع اولا و فصل بعض بالتفاوت وعدمه وحدا لتفاوت شهر فصاعدا اعتبار ابقصة سليمان عليه الصلاة والسلام''۔ ''مصنف نے مطلق کہا تو دونوں کو شامل ہو گیا آپس میں تفاوت اختلاف مطلع کی حیثیت سے ہو یا نہ ہو اور بعض نے تفاوت وعدم تفاوت اختلاف مطلع میں فرق کیا ہے۔ تفاوت کی حد ایک مہینے کی مسافت اور اس سے زیادہ میں ہے حضرت سلیمان علیہ السلام کی حکایت کے اعتبار سے۔ شامی رحمہ اللہ بھی مثل طحطاوی کے لکھنے کے بعد مسافت زمین کے متعلق دوسرا قول تاج تبریزی کا لکھتے ہیں کہ ۲۴ فرسخ سے کم میں اختلاف مطالع نہیں ہو سکتا پھر جواب استفتائے رویت ہلال ص ۲۳ فرمایا آیۂ شریفہ فمن شهد منكم الشهر سے قریب کی رویت پر اعتبار کرنا اور بعید کی رویت کو نا معتبر جاننا۔ جیسا کہ میں نے لکھا ہے، اس آیۂ شریفہ کی تفسیر میں قاضی ابوبکر

بن عربی مالکی نے بھی تفسیر احکام القرآن میں لکھا ہے: ''السابعة اذا اخبر مخبر عن روية بلد فلا يخلو ان يقرب اويبعد فان قرب فالحكم واحد وان بعد فقد قال قوم لاهل كل بلد رويتهم وقيل يلزمهم ذلك''۔ ''(اس آیت کے متعلق) ساتواں مسئلہ کو جب کوئی مخبر کسی شہر کی رویت ہلال سے خبر دے تو دو حال سے خالی نہیں یا وہ شہر قریب ہوگا یا دور۔ اگر قریب ہے تو ایک ہی حکم ہے یعنی چاند ہونا تسلیم ہوگا اور اگر دور ہے تو قوم نے کہا کہ ہر شہر والوں کے لئے ان کی رویت معتبر ہے۔ بعض کا قول ہے کہ چاند کو مان لینا ان کو ضرور ہوگا''۔

پھر جواب استفتائے رویت ہلال کے ص ۴ پر شرح ترمذی سے نقل فرمایا: ''قال القرطبی قال شيوخنا يعني المالكية اذا كانت روية الهلال ظاهرة بموضع ثم نقل الىٰ غيرهم بشهادة اثنين لهم الصوم انتهى قال الخطابى وبه قال اكثر الفقهاء واليه ذهب الشافعى واحمد ولكن المذكور فى كتب الشافعية ان ذلك فيما تقاربت البلاد و قال الحافظ وان تباعدت فلا يجب عندا كثرهم واوجبه ابو الطيب وحكاه البغوى عن الشافعى لكنه قال ابن عبدالبر اجمعوا علىٰ انه لا تراعى الروية فيما بعد عن البلاد كخراسان والاندلس نتهى''۔ ''قرطبی نے کہا ہمارے شیوخ مالکیہ نے کہا ہے کہ جب رویت ہلال کسی ایک جگہ ظاہر ہو جائے پھر (وہ خبر) دو شخص کی گواہی سے دوسروں کی طرف منتقل ہو تو ان پر روزہ واجب ہے انتہی۔ خطابی نے کہا کہ اکثر فقہا نے یہی کہا ہے اور امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ اسی طرف گئے ہیں انتہی۔ لیکن شافعیہ کی کتابوں میں مذکور ہے کہ یہ حکم اس وقت ہے کہ ایک شہر دوسرے سے قریب ہوں اور حافظ ابن حجر نے کہا کہ اگر دوسرے دور ہوں تو اکثر شافعیہ کے نزدیک واجب نہ ہوگا۔ ابو الطیب نے واجب کیا اور بغوی نے امام شافعی رحمہ اللہ سے اس کو حکایت کیا ہے لیکن ابن عبدالبر نے کہا کہ مالکیوں اجماع کیا ہے کہ دور کے شہروں میں رویت کی رعایت نہ کی جائے گی جیسے خراسان اور اندلس۔ انتہیٰ''۔

تیسرا قول: جو حنفیہ کا ظاہر المذہب ہے، یہ ہے کہ کسی ایک جگہ چاند دکھائی دینے سے سب جگہ کے لوگوں پر روزہ رکھنا اور روزہ کھولنا فرض ہو جاتا ہے مگر اس کے لئے شرط یہ ہے کہ اس جگہ چاند دیکھے جانے کا علم دوسری جگہ والوں کو بطریق موجب شرعی ہو جائے اور اگر بطریق موجب اس کا علم نہ ہوا بلکہ تار، ٹیلیفون، ریڈیو، اخبار یا حکایت یا اور کسی واہی تباہی ذریعہ سے اس کی اطلاع پہونچی تو اس کا اعتبار نہ کیا جائے گا۔ اس کا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔ دوسری جگہ کے لوگوں کو ۳۰ شعبان پورے کر کے روزہ رکھنا اور ۳۰ رمضان پورے کر کے عید کرنے کا حکم شرعی ہوگا۔

حضرت امیر شریعت اول رحمہ اللہ استفتائے رویت ہلال ص ۴ پر تحریر فرماتے ہیں: مسافت بعیدہ کی رویت ہلال کی نسبت درمختار میں ہے: ''واختلاف المطالع وروية نهارا قبل الزوال وبعده غير معتبر على

ظاهر المذهب وعليه اكثر المشائخ وعليه الفتوى بحر عن الخلاصة فيلزم اهل المشرق برؤية اهل المغرب اذاثبت عندهم رؤية اولئك بطريق موجب كما مرقال الزيلعي الاشبه ان يعتبرلكن قال الكمال الاخذبظاهر الرواية احوط"۔ " اور مطالع کا اختلاف اور دن کو چاند دیکھنا زوال کے پہلے اور بعد اس کے، سب نامعتبر ہے۔ ظاہر مذہب پر اور اکثر فقہا اسی بات پر ہیں اور اسی پر فتویٰ ہے۔ یہ خلاصہ سے بحر میں لکھا ہے تو مشرق کے لوگوں کو لازم ہوگا (روزہ یا افطار) مغرب والوں کے چاند دیکھنے سے جب اہل مشرق پر اہل مغرب کا چاند دیکھنا شرعی شہادت سے ثابت ہو جائے جیسا کہ گزرا۔ زیلعی نے کہا کہ اشبہ یہ ہے کہ اختلاف مطالع کا اعتبار کیا جائے لیکن کمال نے کہا کہ ظاہر روایت پر عمل کرنا زیادہ احتیاط کی بات ہے"۔

پھر ص ٨ پر علامہ شامی کی ردالمحتار سے دونوں قول (اختلاف وعدم اعتبار) ذکر کے نقل فرمایا: "وظاهر الرواية الثاني وهو المعتمد عندالمالكية والحنابلة لتعلق الخطاب عاما بمطلق الرويته في حديث صوموالرويته بخلاف اوقات الصلاة"۔ "اور ظاہر روایت نے ثانی کو لیا ہے (یعنی مطالع کا اعتبار کیا جائے گا ہمارے نزدیک یہی معتمد ہے اور مالکیوں اور حنبلیوں کے نزدیک بھی حدیث صوموالرویتہ میں رویت مطلق کے ساتھ خطاب عام ہونے کے سبب بخلاف نماز کے اوقات کے"۔

پھر جواب استفتائے رویت ہلال ص ٢٩ پر امام نووی شارح صحیح مسلم سے حدیث کریب کی شرح میں شوافع کا مسلک اختلاف مطالع کے معتبر ہونے کو بیان کر کے فرماتے ہیں: "وقال بعض اصحابنا نعم الرؤية في موضع جميع اهل الارض"۔ "اور لوگوں نے ہمارے کہا ہے کہ ایک مقام کی رویت عام ہوگی، کل زمین والوں کو یعنی عدم اعتبار اختلاف مطالع ظاہر المذہب حنفیوں اور مالکیوں اور حنبلیوں کا ہے اور شوافع کا مسلک اعتبار اختلاف مطالع ہے مگر یہ مسلک تمام شوافع کا نہیں ہے بلکہ بعض کا ہے اور بعضوں کا مذہب ائمہ ثلاثہ کے مطابق یہ ہے کہ ایک مقام کی رویت ہلال عام ہوگی کل زمین والوں کو"۔

پھر جواب استفتائے رویت ہلال کے ص ٣٤ پر ابوالطیب سندی کی شرح ترمذی سے نقل فرماتے ہیں: "وظاهر الرواية في مذهبنا انهٗ يثبت برؤية اهل بلده علىٰ اهل بلد اٰخرلعموم الخطاب في قوله صوموا امعلنا بمطلق الرؤية في قوله لرويته وبرؤية قوم يصدق اسم الرؤية فيثبت مايتعلق به من عموم الحكم فيعم الوجوب"۔ "اور ہمارے مذہب کی ظاہر روایت یہ ہے کہ کسی ایک شہر والوں کی رویت دوسرے شہر والوں پر ثابت ہو جائے گی صوموا میں عموم خطاب کے باعث لرویتہ میں اعلان مطلق رویت کے سبب ہے اور ایک قوم کی رویت سے رویت کا نام صادق ہو جاتا ہے تو جو کچھ اس کے متعلق ہوگا، عام حکم ہونے سے وہ بھی

ثابت ہو جائے گا اور وجوب عام ہو جائے گا''۔

اسی جواب استفتائے رویت ہلال کے ص ۴۱ پر ترمذی شریف کے دوسرے شارح سراج احمد رحمۃ اللہ سے نقل فرماتے ہیں: ''وظاهر المذهب عن ابی حنیفة انه اذاثبت فی مصرلزم سائرالناس فیلزم اهل المشرق برویة اهل المغرب و انما یلزمهم اذاثبت عندهم رویة اولئك بطریق موجب''۔ ''اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا ظاہر مذہب یہ ہے کہ جب کسی ایک شہر میں رویت ثابت ہو جائے تو سب لوگوں پر لازم ہو جائے گی تو اہل مشرق کی رویت اہل مغرب کو لازم ہوگی اور اس وقت لازم ہوگی جبکہ اول کی رویت ان کے نزدیک بطریق موجب ثابت ہو جائے''۔

پھر اسی جواب استفتائے رویت ہلال کے ص ۴۴ پر تحریر فرماتے ہیں: حنفیہ کا ظاہر مذہب یہ ہے کہ ایک جگہ کی رویت تمام اقالیم کے واسطے کافی ہے بشرطیکہ ثبوت اس کا بطریق موجب ہو جائے اور طریق موجب کی شرح یہ ہے:'' کان یتحمل اثنان الشهادة اویشهدا علی حکم القاضی اویستفیض الخبر بخلاف ماذا اخبران اهل بلده، کذا اوء ہ لانه حکایة حلبی''۔ ''دو شخص خود چاند دیکھنے کی گواہی دیں یا (رویت کی تصدیق پر) قاضی کے حکم دینے کی دو شخص گواہی دیں یا متواتر خبر آئے بخلاف اس کے کہ دو شخص خبر دیں کہ فلاں شہر کے لوگوں نے چاند دیکھا ہے، کیونکہ یہ حکایت ہے (اس کا اعتبار نہیں) حلبی (الی قولہ)، طریق موجب کی شرط نے تار برقی پر آنیوالی خبر کو اخبار کے پرچوں میں چھپی ہوئی خبروں کو جیسا کہ عام طور پر چھپتی ہیں۔ ریل کے سفر کرنے والے جنہوں نے خود نہ دیکھا ہو اور کسی شہر کے لوگوں کے دیکھنے کی خبر دیتے ہوں، یہ سب خبر حکایت میں شمار ہوں گی۔ اس لئے کہ ان میں سے کسی میں نہ اپنی رویت شہادت ہوتی ہے، نہ قاضی (یا بجائے قاضی کے کسی عالم) کے حکم کی شہادت ہوتی ہے جو قابل اعتبار ہو سکے۔ ایسی نا قابل اعتبار دور کی رویت کی خبر ملے بھی تو اس کا کچھ نفع نہیں اور حالت یہ ہے کہ اس طرح کی نا قابل اعتبار خبر وں پر عمل نہ کرنے والے سے لوگ جھگڑتے رہتے اور سند میں پیش کرتے ہیں کہ حنفیہ کا فتویٰ اسی پر ہے کہ اہل مشرق کی رویت پر اہل مغرب کو صوم وافطار واجب ہے اور بطریق موجب کی شرط کو نہیں دیکھتے، نہ اس کے معنی جانتے ہیں۔

الحمد للہ کہ سوال دوم کا جواب بھی حسب درخواست سائل حضرت امیر شریعت اول رحمہ اللہ کی تحقیق کی روشنی میں تحریر کیا گیا۔ ناظرین سولہ اقتباسات خصوصاً اخیر ص ۴۴ والی عبارت کو بغور پڑھیں اور اس پر عمل کریں۔ یہ آب زر سے لکھنے کے قابل ہے جن کو ذاتی رائے قرار دے کر رد کیا جاتا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

جواب سوال سویم: حضرت عزت حق سبحنہ تعالیٰ شانہ علمائے کرام فقہائے عظام کو بہترین جزائے خیر عطا فرمائے کہ کسی مسئلہ کو بھی مجمل مہمل نہیں چھوڑا بلکہ ایسی روشن تصریحات فرمادیں جس سے مسئلہ کا حل بہت آسانی سے ہو سکتا

ہے اور اس مسئلہ میں بھی کوئی الجھن کی بات نہیں رہی۔ سوال دوم کے جواب میں معلوم ہوا کہ اس باب میں علما کے تین قول ہیں:

قول اول: ہر جگہ کا چاند صرف وہیں کے لئے ہے، جہاں دیکھا گیا۔ دوسری جگہ اس کا حکم نہیں چل سکتا۔ اسی کی طرف قاسم، سالم، عکرمہ گئے ہیں۔ یہی مذہب اسحٰق کا ہے۔ اسی پر فتویٰ امیر جماعت اہل حدیث پٹنہ کا ہے۔

قول دوم: اختلاف مطالع کا اعتبار کر کے قرب و جوار کی رویت اگر شرعی طریقہ پر ثابت ہو جائے تو لیا جائے گا، دور کی رویت کا اعتبار نہ ہوگا، اس کا دوسرا حکم ہوگا۔ یہ مذہب بعض شافعیہ کا ہے اور احناف سے علامہ زیلعی، صاحب فیض، صاحب تجرید اور بعض مشائخ حنفیہ بھی اس کی طرف گئے ہیں اور حضرت امیر شریعت اول رحمہ اللہ اس قول کو ضعیف فرماتے ہیں۔ استفتائے رویت ہلال کے ص ۷ اپر علامہ شامی کی عبارت ”فقیل بالاول و اعتمدہ الزیلعی و صاحب الفیض وھو الصحیح عند الشافعیۃ“ کا ترجمہ کرنے میں کہا گیا ہے یعنی ضعیف قول ہے کہ پہلی بات لی جائے گی یعنی اعتبار کیا جائے گا۔ زیلعی اور صاحب فیض نے اس پر اعتماد کیا ہے اور خود بھی بعض دقتوں کو پیش نظر رکھ کر اسی کو پسند فرماتے ہیں اس دقت کو جواب استفتائے رویت ہلال من قول سوم، حنفیہ کا ظاہر مذہب یعنی عدم اعتبار اختلاف مطالع اور ایک جگہ کی رویت تمام اقالیم کے واسطے کافی ہونا بشرطیکہ ثبوت اس کا بطریق موجب ہو جائے لکھ کر اور طریق موجب کی شرح شامی سے بحوالہ حلبی نقل فرما کر تحریر فرماتے ہیں: ”طریق موجب کی شرح معلوم کرنے کے بعد جاننا چاہئے کہ بعید المسافت شہر کی رویت ہلال کی تصدیق اس شرط کے موافق کس قدر مشکل ہے“

قول سوم: اختلاف مطالع کا اعتبار نہ کیا جائے اور ایک جگہ کی رویت تمام اقالیم کے لئے لازم ہوگی بشرط ثبوت بطریق موجب ہو جائے۔ یہی مذہب عام احناف کا ہے، یہی ظاہر المذہب، یہی ظاہر الروایت ہے۔ یعنی ان مسائل سے ہے جو اصحاب مذہب یعنی امام ابوحنیفہ، امام ابو یوسف، امام محمد سے مروی ہے تو اسی کو ماننا اور حنفی عالم کو اسی پر فتویٰ دینا ضروری ہے۔

علامہ شامی رسم المفتی میں محقق ابن کمال پاشا سے ناقل کہ فقہا کے سات درجے ہیں۔ اول مجتہدین فی الشرع جیسے ائمہ اربعہ رضی اللہ عنہم۔ دوم مجتہدین فی المذہب جیسے صاحبین رضی اللہ عنہما۔ سوم مجتہدین فی المسائل جیسے امام خصاف، امام طحطاوی وغیرہما۔ چہارم مقلدین سے اصحاب تخریج جیسے امام رازی وغیرہ۔ پنجم مقلدین سے اصحاب ترجیح جیسے ابوالحسین قدوری صاحب ہدایہ وغیرہما۔ ششم طبقہ مقلدین سے جو اقویٰ، قوی، ضعیف اور ظاہر المذہب، روایت نادرہ میں تمیز پر قادر ہیں جیسے صاحب کنز، صاحب مختار وغیرہما۔ ہفتم طبقہ مقلدین جو ان باتوں پر قدرت نہیں رکھتے جیسے آجکل کے عام علما۔ انہیں کے بارے میں صاحب درمختار لکھتے ہیں: ”واما نحن فعلینا اتباع ما رجحوہ وصححوہ کما لو افتوا فی حیاتھم“۔ ”ہم مقلدین پر اتباع کرنا اس کا ہے جسے ان علما نے ترجیح دی اور جس کی

تصحیح کی جیسے وہ حضرات اگر زندہ ہوتے اور فتویٰ دیتے تو کیا ہماری مجال تھی کہ ہم ان کی مخالفت کرتے‘‘۔نہیں ہرگز نہیں تو جب انہوں نے ایسے اصول وضوابط مقرر فرمادیے تو ہمارا فرض مذہبی ومنصبی ہے کہ فتویٰ دیتے وقت انہیں کا لحاظ کریں اور عوام کو خوش کرنے کی کوشش میں نہ پڑیں۔

درمختار میں ہے:’’رسم المفتی ان ما اتفق علیہ اصحابنا فی الروایات الظاھرۃ یفتی بہ قطعاً‘‘۔ ’’جو مسئلہ ظاہر الروایت میں ہمارے ائمہ کا متفق علیہ ہے۔اس پر قطعاً فتویٰ دیا جائے گا‘‘۔کیونکہ وہ ائمہ ثلاثہ سے بروایت ثقات مروی ہے تو اس سے عدول کی کوئی وجہ نہیں ہوسکتی۔حضرت امیر شریعت اول رحمۃ اللہ کے استفتائے رویت ہلال میں درمختار کی عبارت اوپر گذری کہ انہوں نے بحر الرائق شرح کنز الدقائق علامہ زین بن نجیم ہے اور انہوں نے فتاویٰ خلاصہ سے قول سوم کو لکھا علیہ اکثر المشائخ، اسی پر اکثر مشائخ ہیں۔تو جس پر اکثر مشائخ ہوں ہماری کیا مجال کہ اس کی مخالفت کریں۔اسی میں ہے، وعلیہ المفتویٰ اسی پر علما کا فتویٰ ہے۔تو جس قول پر علمائے سابقین فتویٰ دے چکے، ہماری کیا مجال کہ اس کے خلاف فتویٰ دیں۔اسی کو ظاہر المذہب فرمایا پھر ظاہر المذہب سے عدول کا کسے حق ہے؟ اسی کو علامہ کمال نے الاخذ بظاھر الروایۃ احوط فرمایا یعنی ظاہر الروایت ہی کو لینے میں زیادہ احتیاط ہے پھر دوسرے قول کو لے کر بے احتیاطی کرنے کا کیا حق ہے۔اسی کو علامہ شامی نے فرمایا:ھو المعتمد عندنا ہمارے یعنی حنفیہ کے نزدیک یہی معتمد ہے۔پھر معتمد کو چھوڑ کر غیر اعتمادی قول کا لینا کہاں کا انصاف ہے اور یہ نہ صرف حنفیہ ہی کا معتمد بلکہ مالکیہ کا یہی مذہب ہے، حنبلیہ کا بھی یہی مذہب ہے اور بعض شوافع کا بھی یہی مسلک ہے پھر ایسے قول کو جو چاروں مذہب کا ہو چھوڑنے کی کون سی وجہ ہوسکتی ہے اور وہ بھی اسی حالت میں کہ ظاہر المذہب کے ترجیح کی علما تصریح فرماتے ہیں۔

علامہ شامی جلد اول ردالمحتار میں فرماتے ہیں:’’وفی وقف البحر فانہ اذا کان احد القولین ظاھر الروایۃ والاخیر غیرھا فقد صرحوا اجمالا بانہ لایعدل عن ظاھر الروایۃ‘‘۔ ’’بحر الرائق کی کتاب الوقف میں ہے: جب کسی مسئلہ میں دو قول ہوں۔ایک ظاہر الروایہ ہو اور دوسرا غیر ظاہر الروایہ (جیسا کہ اس مسئلہ میں ہے کہ قول سوم ظاہر الروایہ ہے اور قول دوم غیر ظاہر الروایہ بلکہ حسب تصریح حضرت امیر شریعت اول رحمۃ اللہ ضعیف ہے) تو علما نے مطلقاً تصریح فرمائی کہ ظاہر الروایہ سے عدول جائز نہ ہوگا۔

اسی میں ہے:’’فھو ترجیح ضمنی لکل ما کان ظاھر الروایۃ فلایعدل عنہ بلاترجیح صریح لمقابلہ‘‘۔ ’’تو یہ ترجیح ضمنی ہے ہر اس قول کے لئے جو ظاہر الروایہ ہو تو اس سے عدول جائز نہ ہوگا جب تک اس کے مقابل کی ترجیح صریح نہ ہو‘‘۔اور اس جگہ مقابل کی اصلا ترجیح نہیں بلکہ قیل سے تعبیر اس کے ضعف کی تصحیح ہے پھر ظاہر

الروایہ سے عدول کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟

علامہ شامی جلد اول ص ۵۱ پر تحریر فرماتے ہیں: ''و کذا یر جح اذا کان احدهما ظاهر الرواية''۔ " اسی طرح ترجیح دی جائے گی جب دو قول میں ایک ظاہر الروایہ ہو''۔ پھر فرماتے ہیں: ''و به صرح فی کتاب الرضاع من البحر حیث قال الفتوی اذا اختلف کان الترجیح لظاهر الرواية لماسیاتی ان الفتیا بالمرجوح جهل''۔ ''ظاہر الروایہ کی ترجیح کی تصریح علامہ ابن نجیم نے بحر الرائق کی کتاب الرضاع میں فرمائی کہ فتویٰ جب مختلف ہو یعنی دو قول ہوں اور دونوں مفتی بہ تو ظاہر الروایت کو ترجیح ہوگی۔ اس دلیل سے قریب آتی ہے کہ قول مرجوح پر فتویٰ دینا جہالت و نادانی ہے''۔

اور اس مسئلہ میں تو دوسرے قول پر اصلاً فتویٰ نہیں پھر ظاہر الروایہ کو چھوڑنے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے خصوصاً جبکہ فتویٰ بھی اسی قول پر ہے۔ درمختار کی عبارت اوپر گذری ''وعلیه الفتوی بحر عن الخلاصه'' پھر فرمایا: ''و فیه من باب الصرف اذا اختلف التصحيح وجب الفحص عن ظاهر الرواية والرجوع اليها''۔ ''جب مختلف ہو یعنی دو قول ہوں اور دونوں کو علما نے صحیح فرمایا ہو تو اس وقت دیکھنا چاہئے کہ ظاہر الروایہ کون ہے اور اسی کی طرف رجوع واجب ہے۔ تو اس جگہ دوسرے قول نے بھی تصحیح نہ کی بلکہ حضرت امیر شریعت اول رحمہ اللہ نے اس کے ضعیف ہونے کی تصریح فرما دی تو ظاہر الروایہ کو چھوڑ کر قول دوم اختیار کرنے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟

علامہ شامی جلد اول ردالمحتار میں فرماتے ہیں: ''ما خرج عن ظاهر الرواية فهو مرجوع عنه والمرجوع عنه لایجوز الاخذبه''۔ ''جو ظاہر الروایہ سے باہر ہے، وہ مرجوع عنہ ہے اور مرجوع عنہ کو لینا جائز نہیں''۔

درمختار میں ہے: ''ان الحکم والفتیا بالمرجوح جهل وخرق الاجماع''۔ ''حکم اور فتویٰ دینا قول مرجوح پر جہالت اور خلاف اجماع کرنا ہے''۔

علامہ شامی اس کی شرح میں فرماتے ہیں: ''اولیٰ من هذا بالبطلان الافتاء بخلاف ظاهر الرواية اذالم یصحح والافتا بالقول المرجوع عنه اه''۔ ''اور اس سے زیادہ باطل امر ظاہر الروایہ کے خلاف فتویٰ دینا ہے جب کہ اس کی تصحیح نہ کی گئی ہو اور قول مرجوع عنہ پر فتویٰ دینا ہے''۔

پھر علامہ شامی جلد ۲ ردالمحتار میں فرماتے ہیں: ''الواجب الرجوع الیٰ ظاهر الرواية عنه اختلاف الترجیح''۔ ''ترجیح کے اختلاف کی صورت میں ظاہر الروایہ کی طرف رجوع کرنا واجب ہے تو جب دوسرے قول کی اصلاً ترجیح نہ ہو تب تو ظاہر الروایت پر فتویٰ ضروری اور لازمی ہوگا''۔

نیز ردالمحتار جلد سوم میں فرماتے ہیں: ''اذا ذکر فی ظاهر الرواية حكم من دون ذکر خلاف کان

مقتضاه انه قول ائمتنا الثلثة"۔ "جب ظاہر الروایہ میں کوئی حکم مذکور ہو اور وہاں اس کا خلاف نہ مذکور ہو تو اس کا مقتضیٰ یہ ہے کہ یہ ہمارے ائمہ ثلاثہ امام اعظم، امام یوسف، امام محمد کا قول ہے"۔

پھر جلد رابع میں فرماتے ہیں: "لا یحل الافتاء بالمرجوح ولا ینفذ القضاء به"۔ "قول مرجوح پر کسی مفتی کو فتویٰ دینا اور کسی قاضی کو فیصلہ کرنا جائز نہیں اور اگر کوئی قاضی فیصلہ دے گا تو وہ نافذ نہ ہوگا"۔

پھر جلد پنجم میں فرماتے ہیں: "ماخالف ظاهر الرواية ليس مذهبا لا صحابنا"۔ "جو ظاہر الروایت کے خلاف ہو وہ ہمارے اصحاب کا مذہب نہیں"۔

ان تمام تصریحات صریحہ کے بعد واضح ہو گیا کہ ان تینوں اقوال میں قول سوم کو ترجیح ہوگی، اسی پر فتویٰ دینا ہوگا۔ یہی ہمارے ائمہ ثلاثہ کا مذہب ہے۔ اس کے سوا ہمارے اصحاب کا مذہب نہیں۔ اسی کی طرف رجوع واجب ،اس کے سوا دوسرے قول کو لینا اور اس پر فتویٰ دینا جہالت اور خرق اجماع ہے۔ واللہ تعالى اعلم بالصواب۔

جواب سوال چہارم: مولیٰ تعالیٰ بہتر سے بہتر جزائے خیر دے ہمارے علمائے کرام، فقہائے عظام کو کہ اپنے ذہن رسا سے ایسے اصول وقواعد بنائے، ایسی باتیں بتا گئے جو بعد کے شبہات وشکوک کے زہر کے لئے تریاق ہوں۔

درمختار جلد اول میں ہے: "ان الحکم الملفق باطل بالاجماع"۔ "حکم ملفق جس کی بنا دو مذہب یا دو اصول پر ہو بالاجماع باطل ہے"۔

علامہ شامی اس کی مثال دے کر توضیح فرماتے ہیں: "مثاله متوضی سال من بدنه دم ولمس امرأة ثم صلیٰ فان صحة هذه الصلوٰة ملفقة من مذهب الشافعی والحنفی والتلفیق باطل فصحته منتفية اه الخ"۔ "اس کی مثال یہ ہے کہ ایک باوضو شخص ہے جس کے بدن سے خون بہا اور اس نے کسی عورت کو بھی چھوا پھر نماز پڑھ لی تو اس کی نماز کی صحت امام ابوحنیفہ اور امام شافعی دونوں کے مذہب کی تلفیق سے ہو سکتی ہے یعنی ایک مسئلہ امام صاحب کا لیں اور ایک مسئلہ امام شافعی صاحب کا۔ عورت کے چھونے سے حنفیہ کے نزدیک وضو نہیں ٹوٹتا اور شافعیہ کے یہاں ٹوٹ جاتا ہے۔ تو اس مسئلہ میں امام صاحب کا قول لے اور خون نکلنے سے احناف کے نزدیک وضو ٹوٹ جاتا ہے اور شافعیہ کے یہاں نہیں ٹوٹتا ہے تو اس مسئلہ میں امام شافعی صاحب کی بات لے اور نماز پڑھ لے۔ اس ترکیب سے اس نماز کو صحیح جانے مگر چونکہ تلفیق باطل ہے اس لئے یہ نماز بھی کسی کے نزدیک صحیح نہ ہوگی۔ امام صاحب کے نزدیک اس وجہ سے کہ اس کے بدن سے خون نکلا اور خون نکلنے سے وضو جاتا رہا اور امام شافعی صاحب کے نزدیک اس وجہ سے کہ اس نے عورت کو چھوا اور شافعیہ کے نزدیک عورت کے چھونے سے وضو جاتا رہتا ہے تو اس شخص نے دونوں اماموں کے نزدیک بے وضو نماز پڑھی، اس لئے وہ نماز باطل ہوگی۔

اسی طرح یہ مسئلہ امام ابوحنیفہ اور اپنی جدت سے تلفیق ہے تو بدرجہ اولیٰ باطل ہوگا ورنہ اگر پوری بات امام صاحب کی لیں تو کوئی دقت نہیں اور اگر پوری بات اپنی لیں جب بھی کوئی دشواری نہیں۔ اس لئے امام صاحب کا مذہب جہاں یہ ہے کہ اختلاف مطالع کا اعتبار نہیں، اس لئے اہل مشرق کی رویت پر اہل مغرب کو روزہ رکھنا اور افطار کرنا واجب ہوگا، وہیں ان کا مذہب یہ بھی ہے کہ مشرق والوں کے چاند دیکھنے سے مغرب والوں پر کب روزہ افطار کا حکم ہوگا، جب کہ ان کا چاند دیکھنا مغرب والوں کو بطریق موجب ثابت ہو جائے۔ یہ نہیں کہ کوا کائیں کائیں کرتا جارہا ہے، کسی کی سمجھ میں آگیا کہ وہ کہہ رہا ہے دہلی میں چاند ہو گیا تو پٹنہ والوں پر روزہ رکھنا یا عید کرنا فرض ہو جائے گا بلکہ ابر و باد کی صورت میں رمضان کے لئے ایک معتبر شخص کی خبر اور ہلال عیدین میں دو عادل شخصوں کی شہادت ضرورت ہے جو خود چاند دیکھنے کی گواہی دیں یا رویت کی تصدیق پر قاضی کے حکم دینے کی گواہی دیں یا چاند دیکھنے کی جگہ سے متعدد جماعتیں آئیں اور سب یک زباں اپنے علم سے خبر دیں کہ وہاں فلاں دن بربنائے رویت روزہ ہوا یا عید کی گئی۔ جب ایسی گواہیاں گذریں گی تب چاند ثابت ہوگا ورنہ نہیں اور ہر دیندار جانتا ہے کہ اس دور آزادی و بے قیدی میں مطابق قواعد شرع مقبول الشہادہ شخص کا ملنا اور اس کا گواہی دینا کس قدر قلیل الوجود کبریت احمر کا حکم رکھتا ہے۔ فساق فجار کی کثرت ہے اور انہیں کے ذریعہ ایسی خبروں کی حکایت و روایت۔ اس لئے فقہائے کرام کے مذہب پر چاند کا ثبوت دوسری جگہوں کے لئے کس قدر مشکل ہے مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ فقہائے عظام کے ارشاد کو پس پشت ڈال دیں۔ اس لئے کہ اس کے مشکل اور دشوار ہونے کی وجہ سے الجھن کیا ہے۔ اس لئے کہ اگر اس شرط کے مطابق رویت ہلال ثابت نہ ہوگی تو یہاں عید کرنے، روزہ کھولنے کا حکم نہ دیا جائے گا جس طرح زنا کی شہادت کے لئے کالمیل فی المکحلہ کی گواہی دینا شرط ہے اور ہر شخص جانتا ہے کہ اس طرح دیکھنا اور وہ بھی نہ صرف ایک یا دو شخصوں کا بلکہ اکٹھے چار آدمیوں کا اور اس کی گواہی دینا کس قدر مشکل ہے مگر اس میں دقت ہی کیا ہے؟ اگر ایسی گواہی نہ گذرے گی قاضی مجرم نہ قرار دے گا، حد نہ لگائے گا۔ رمضان شریف کے چاند کے لئے اگر چہ عادل ہونا شرط نہیں، غیر فاسق ہونا کافی ہے اور ایسے لوگ اس زمانے میں بھی بہت ملیں گے مگر رمضان کے چاند کی گواہی دیتا ہی کون ہے؟ یہ ساری دینداری کا زور تو عیدین کے چاند کے لئے صرف کیا جاتا ہے اور ان اختراع کرنے والوں کے طور پر اس لئے کہ اگر چہ یہ لوگ ریڈیو تار ٹیلیفون کو مانتے ہیں اور ان کو بہ منزلہ شہادت جانتے ہیں۔ اسی لئے دوسرے علما سے پوچھتے ہیں "سمجھ میں نہیں آتا کہ ان تصریحات کے بعد تار اور ریڈیو کی خبروں پر اعتماد نہ کرنے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ لیکن ساتھ ساتھ وہ موافق مذہب احناف عدم اعتبار اختلاف کو نہیں مانتے اور نہ صرف اپنا بلکہ اپنے ساتھ اپنے استادوں کا بھی یہی خیال ظاہر کرتے ہیں کہ بہر حال دور دراز مقامات میں اختلاف مطالع کا لحاظ کرنا ہی پڑے گا تو ان کے طور پر دور دراز

مقامات کی خبر اختلاف مطالع کی وجہ سے قابل قبول نہ ہوگی تو مقصد ایک ہی رہا۔ فقہا کی تحریرات وتحقیقات ماننے والوں کے لئے دہلی وغیرہ دور کی خبریں جو ریڈیو، تار، ٹیلیفون کے ذریعہ آئی ہوں، غیر معتبر ہیں۔ اس لئے کہ ضرورت شہادت کی ہے اور یہ چیزیں خبر کے لئے موضوع ہیں، شہادت میں کارآمد نہیں۔ اس لئے کہ ان پر روزہ رکھنے اور عید کرنے کا حکم نہ دیا جائے گا اور روشن خیال مجتہدین وقت حضرات کے نزدیک بھی دہلی وغیرہ دور کی خبریں جو ریڈیو، تار، ٹیلیفون کے ذریعہ آئی ہیں غیر معتبر ہیں۔ اگر چہ ان کے نزدیک اس دور ترقی میں ریڈیو، تار، ٹیلیفون کے ذریعہ دنیا نے عوام کی سہولت کے سامان فراہم کئے ہیں۔ اس سے فائدہ نہ اوٹھانا اور لکیر کے فقیر بنے رہنا، خود کو سو برس پیچھے دھکیل دینے کے مرادف ہے۔ اس لئے اس کو ضرور ماننا چاہئے مگر وہ لوگ اختلاف مطالع کا اعتبار کرتے ہیں اور فقہا کی تصریح لاعبرۃ لاختلاف المطالع کو نہیں مانتے۔ ان کے نزدیک مطلع مختلف ہونے کی وجہ سے دہلی کی خبر ہمارے بہار کے لئے قابل اعتبار ولائق عمل دار آمد نہیں تو حکم بہر حال ایک ہی رہا کہ دہلی کی خبر ہلال تار، ٹرنک کال، ریڈیو کے ذریعہ معتبر نہ ہوگی واللہ تعالیٰ اعلم۔

جواب سوال پنجم: تحریرات سابق یہ امر روز روشن کی طرح واضح ہوگیا کہ ہلال عیدین میں شہادت گواہان عادل کی ضرورت ہے۔ نہ صرف خبر کی اور تا، ٹیلیفون، ٹرنک کال، ریڈیو وغیرہ خبر رسانی کے لئے موزوں ہیں، نہ شہادت کے لئے۔ اسی لئے جن لوگوں نے تار، ٹیلیفون وغیرہ ایجاد کئے، کبھی انہوں نے بھی فوجداری اور دیوانی کے مقدمات میں گواہوں کے لئے ان چیزوں کو قابل قبول نہ جانا۔ ایسے روشن خیال حضرات سے گزارش ہے کہ پہلے یہ نصیحت حکام وقت کو کریں کہ جب دنیا نے ترقی کرکے عوام کی سہولت کے لئے سامان فراہم کیا ہے، اس سے فائدہ نہ اٹھانا اور لکیر کے فقیر بنے رہنا خود کو سو برس پیچھے دھکیل دینے کے مرادف ہے۔ اس لئے آپ لوگوں کو چاہئے کہ مقدمات میں گواہوں کی حاضری لازم قرار نہ دیجئے۔ جی چاہے تو آئے ورنہ جہاں سے چاہے فون کردے یا تار دیدے یا جو اظہار دینا ہے، ریڈیو اسٹیشن پر جاکر وہیں سے نشر کردے۔ اس میں متخاصمین کا بہت روپیہ جو گواہوں کے لانے لے جانے میں صرف ہوتا ہے، بچ جائے گا۔ اگر کچہریوں میں اس کو رائج نہ کرسکیں تو الیکشن کا زمانہ قریب، ہے کوشش کرکے پہلے اسی میں جاری کرائیے کہ ووٹروں کو پولنگ اسٹیشن پر آنے کی ضرورت نہ پڑے۔ ہر شخص اپنے قریب کی جگہ سے فون کردے یا تار دیدے یا ریڈیو اسٹیشن پر جاکر بول دے کہ میں نے فلاں شخص کو ووٹ دیا، تب اس روشن خیالی کی حقیقت معلوم ہوجائے گی۔ جب کچہریوں کی شہادت میں ان ذرائع کو جاری کرلیں تب علمائے کرام کو نصیحت کریں اور لکیر کے فقیر بننے سے ان کو روکیں۔ افسوس کی بات ہے کہ دنیوی قانون میں ایک انچ کمی بیشی کی ہمت نہیں کرسکتے، ہر بات پر آمنا و صدقنا کہنے کے لیے تیار مگر شرعی مسائل میں مداخلت کے لئے کمربستہ۔ میری یہ غرض نہیں

کہ چونکہ دنیوی کچہریوں میں شہادت کے لئے یہ چیزیں مقبول نہیں، اس لئے ثبوت ہلال کے لئے ہم نہیں مانتے۔ جب کسی وقت کچہریوں کی شہادت میں قابل قبول سمجھی جائیں گی، ثبوت ہلال میں بھی معتبر ہوں گی بلکہ دکھانا یہ ہے کہ دنیوی کچہریوں میں شہادت کے قواعد و قانون بہت نرم ہیں پھر بھی یہ چیزیں شہادت کے لئے معتبر نہیں پھر شرعی مسائل جس کی شہادت کی شرطیں بہت سخت ہیں، ان میں کیونکر قابل اعتبار سمجھی جاسکتی ہیں۔ یہ فتویٰ کہ تار، ٹیلیفون، ریڈیو، ٹرنک کال وغیرہ برقی خبریں صرف خبر رسانی کے لئے ہیں، شرعاً ثبوت ہلال کی شہادت کے لئے معتبر نہیں۔ ہندوستان بھر کے مشاہیر علمائے سابقین و موجودین کی تحقیق ہے۔ اس وقت میرے پیش نظر چار تحریریں ہیں۔ انہیں کی مدد سے علمائے کرام کی تحقیقات کو پیش کرسکتا ہوں (۱) رسالہ مبارکہ ازکی الاہلال بابطال ما احدث الناس فی امر الہلال مصنفہ اعلیٰ حضرت امام اہل سنت مجدد مأتہ حاضرہ مؤید ملت طاہرہ سیدی و سندی، شیخی و مرشدی مولانا شاہ احمد رضا خاں صاحب فاضل بریلی قدس سرہٗ العزیز (۲) رسالہ جامع الاقوال فی رویت الہلال مرتبہ سید شاہ محمد حسین صاحب ارزانی شاہی برادر جناب سید شاہ حامد حسین صاحب سجادہ نشین درگاہ شاہ ارزان پٹنہ (۳) رسالہ نادر تحفہ جامعہ حبیبیہ (۴) جوابات استفتاعزیزی و تلمیذی مولوی سید شاہ محمد فرید الحق سلمہٗ ولیعہد سجادہ عمادیہ پٹنہ۔

(اس کے بعد رسالہ مبارکہ ازکی الاہلال اور ہندوستان کے ایک سو اکیانوے مشاہیر علما کی تصدیقات ہیں۔ ازکی الاہلال فتاویٰ رضویہ میں چھپ چکا ہے اور تصدیقات میں وہی عبارتیں ہیں جن کا تذکرہ ملک العلما کے فتوے میں آچکا ہے۔ اس لئے احقر نے انہیں یہاں سے خذف کردیا ۱۲ ساحل)

فقیر قادری محمد ظفر الدین رضوی غفرلہ کہتا ہے کہ یہ یوپی، سی پی سابق حال ام پی، بمبئی، بہار، بنگال، حیدر آباد، پنجاب وغیرہ کے مختلف اضلاع، مختلف مقامات، مختلف خیالات، مختلف اعتقادات اور اپنے وقت کے مشہور و مستند علمائے سابقین و معاصرین کی ایک سو اکیانوے تحریرات فتاویٰ و تصدیق ہیں، جن میں بالاتفاق حکم ہے کہ تار، ٹیلیفون، ریڈیو ٹرنک کال، اخبار، خطوط سے ثبوت ہلال نہیں ہوسکتا تاوقتیکہ رویت پر شرعی شہادت نہ ہو۔ ایک جگہ چاند ہونے سے دوسری جگہ روزہ، افطار، قربانی، نماز کا حکم دینا صحیح نہ ہوگا۔ بعض علمانے یہ فتویٰ دیتے ہوئے کہ ریڈیو کے ذریعہ شہادت اور اثبات رویت ہلال نہیں ہوسکتا، اتنا اور اضافہ کیا ہے: البتہ کسی عالم یا قاضی کے پاس شہادت رویت گذرے تو خود وہ عالم اس خبر کو ریڈیو کے ذریعہ نشر کرسکتا ہے، سرکاری آدمی یا غیر مسلم شخص اگر نشر کرے گا تو اس کا اعتبار نہ ہوگا، مگر مرکزی انجمن تبلیغ صداقت بمبئی کی طرف سے جامع مسجد مدنپورہ ۱۰ محرم الحرام بروز جمعہ ۱۳۷۱ھ کو دن

میں زیرِ صدارت حضرت محدث اعظم ہند مولانا الحاج شاہ سید محمد صاحب کچھوچھوی مدظلہ ایک عظیم الشان اجتماع ہوا جس میں الہ آباد، لکھنؤ، دہلی، فیض آباد، بریلی، مرادآباد، سنبھل، پیلی بھیت، مظفرپور، بہار، داناپور، گونڈہ، بہرائچ، نانپارہ، ناگپور، جبل پور، فتحپور، کانپور، بستی، رائے بریلی، بلیا، اعظم گڑھ، مبارکپور، بنارس، بھاگلپور و دیگر مقامات کے علمائے کرام ومفتیان عظام نے شرکت فرمائی۔ مزید دلائل شرعیہ کے تحت یہ طے فرمایا کہ ریڈیو کے ذریعہ رویت ہلال کی خبر یا شہادت تو غیر معتبر ہے ہی، اگر ریڈیو کے ذریعہ قاضی کے فیصلۂ رویت ہلال کا اعلان ہو تو وہ بھی غیر معتبر اور ناقابل عمل ہے۔ کیونکہ قاضی شرع کا فیصلہ اس کے حدود وقصاص ہی میں جاری و نافذ ہوگا اور ایسا قاضی واقعی قاضی شرع، عالم دین ہوگا اور وہ قاضی شرع کے جملہ فرائض انجام دے گا یا صرف چاند کی شہادت لیا کرے گا نیز یہ کہ وہ قاضی جو صرف چاند ہی کی شہادت لے گا اور اعلان کرے گا اور اس کی قضا آل انڈیا ہوگی، وہ ہندوستان میں ایک ہی ہوگا یا ہر شہر، ہر قصبے اور آبادی میں؟ کیونکہ یہ ہوتا ہے کہ ایک جگہ رویت ہلال ہوئی اور دوسری جگہ نہیں ہوئی تو جہاں رویت ہوئی وہاں آل انڈیا قاضی نہ ہوا تو رویت وہیں رہ گئی اور ہر شہر آبادی میں ایسے آل انڈیا قاضی کا ہونا قطعاً ناممکن۔ لہٰذا ریڈیو سے سنا ہوا رویت ہلال کا فیصلہ قاضی یا فیصلہ کا اعلان ہرگز ہرگز قابل قبول ولائق عمل نہیں ہے۔ ملاحظہ ہو روزنامہ خلافت بمبئی۔ ۱۸/۱۱ اکتوبر ۱۹۵۱ء

(فتویٰ جس پر ۵۱ مشہور ومستند علما نے دستخط فرمائے خلافت بمبئی ۱۴/ نومبر ۱۹۵۱ء)

الجواب: جہاں رویت ہلال کا شرعی ثبوت ہو، اصرف وہاں والوں پر روزہ، افطار، اضحیہ واجب ہے۔ ہدایہ وغیرہ میں ہے: ''الاصل بقاء الشهر فلا ينتقل عنه الا بدليل ولم يوجد''۔ فلہٰذا جہاں رویت ہلال کا شرعی ثبوت نہ ہو، اوہاں والوں کو یہ حکم دینا کہ روزہ رکھو یا افطار کرو یا قربانی کرو، نماز عید ادا کرو، خلاف شرع ہے اور قاضی کا حکم خلاف شرع قابل عمل نہیں ہوتا ہے۔ لہٰذا اگر کوئی قاضی اپنے شہر اور دیگر بلاد جہاں رویت ہلال کا ثبوت نہیں ہوا ہے، ان تمام مقامات کے لئے روزہ وافطار وغیرہ کا حکم دے تو اس کے حکم واعلان پر جہاں رویت ہلال کا ثبوت نہیں ہوا ہے، عمل نہ ہوگا، خواہ وہ قاضی ریڈیو سے حکم دے یا خود دوسرے بلاد میں جا کر خود حکم کرے۔ دوسری جگہ جب حکم دے گا تو اس۔ ے ثبوت شرعی کا مطالبہ ہوگا۔ بے ثبوت نہ اسے حکم کرنا جائز، نہ اس حکم پر عمل جائز۔

فتح القدیر شرح ہدایہ میں امام علامہ محقق علی الاطلاق فرماتے ہیں: ''الفرق بين رسول القاضي و كتابه حيث يقبل كتابه ولا يقبل رسوله فلان غاية رسوله ان يكون كنفسه وقدمنا انه لو ذكر مافي كتابه لذلك القاضي بنفسه لايقبله وكان القياس في كتابه كذلك الا انه اجيز باجماع التابعين على خلاف القياس فاقتصر عليه''۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ الفقیر ابو الفضل السید محمد افضل حسین مفتی دار العلوم مظہر اسلام بریلی۔
(اس فتوے پر اکیانوے علمائے کرام کی تصدیقات ہیں۔ جنہیں یہاں سے حذف کر دیا گیا ۲۱ ساحل)

ان تمام تحریرات، فتاویٰ وتصدیقات کی روشنی میں کالشمس فی نصف النہار واضح ہوگیا کہ اثبات ہلال کے لئے شہادت کی ضرورت ہے۔ رمضان شریف کے چاند کے لئے ابر وغبار کی حالت میں ایک شخص کی اگرچہ مستور الحال ہو اور عید الفطر کے چاند کے لئے دو عادل مرد یا ایک مرد عادل اور دو عادل عورتوں کی شہادت ضروری ہے۔ تار، ٹیلیفون، ریڈیو اور ٹرنک کال، اخبار، خطوط، افواہ بازار وغیرہ سے چاند ثابت نہیں ہوسکتا۔ یہی جمہور علمائے اسلام کا مفتی بہ قول ہے۔ ثبوت رویت کے بعد ریڈیو سے اعلان بھی محض خبر ہی خبر ہوگی۔ کسی صورت، کسی حالت میں حدود سے باہر کے مسلمانوں کے لئے وہ اعلان مثبت وملزم نہیں ہوسکتا ہے۔ مذکورہ بالا ایک سو اکیانوے فتاویٰ وتصدیقات کے علاوہ اور بھی علمائے کرام کی تحریرات وتصدیقات اس مسئلہ پر اور موجود ہیں مگر کتاب کی طوالت، ازدیاد حجم وضخامت و صرف کثیر طباعت واشاعت کی وجہ سے صرف اسی قدر پر اکتفا کیا۔ ماننے والے کے لئے اس قدر فتاویٰ وتصدیقات کا بیش قیمت ذخیرہ بہت کافی ہے۔ درخانہ کس ست یک حرف بس ست اور منکر متعصب ہٹ دھرم کے لئے نہ صرف ہندوستان بلکہ پاکستان، افغانستان، ترکستان، عرب، عجم سارے جہان کی تحریرات فتاویٰ وتصدیقات سب بیکار ہیں واللہ الہادی وھو تعالیٰ اعلم۔

ضمیمہ جواب سوال پنجم: صدق جدید لکھنؤ نمبر ۱۱ ۱۶ر جنوری ۱۹۵۲ء میں ایک مضمون ریڈیو اور رویت ہلال (ایک بیرسٹرایٹ لا اور سشن جج کے قلم سے) کی سرخی سے شائع ہوا ہے۔ مضمون قدرے طویل اور بہت مفید ہے۔ ایک حصہ اس کا عام انگریزی داں حضرات کے مطالعہ کے لئے اس جگہ نقل کیا جاتا ہے۔ ایک اچھی سی صحبت میں مجھ سے سوال کیا گیا کہ جب حساب سے چاند نکلنے کا سوال حل ہوسکتا ہے تو پھر عید کی بابت ہر سال یہ دبدھا کیوں؟ میں نے اپنے خیال کے مطابق کہا کہ کچہری کی تعطیلات کے نقشہ میں خود لکھا ہے کہ اعتبار رویت کا ہوگا، نہ کہ چاند نکلنے کے حساب کا۔ سوال ہوا کہ جب تار اور ٹیلی فون موجود ہے تو پھر ہر جگہ کے لئے الگ رویت کا سوال کیوں پیدا ہوتا ہے؟ میں نے کہا کہ جہاں عام طور پر رویت منائی جاتی ہے تو کوئی نزاع نہیں رہتی ہے اور جہاں نزاع ہوتی ہے تو اس کی مہذب صورت کسی معتبر ہستی مثلاً قاضی کا فیصلہ ہے اور وہ بھی ایک Democrettic طریقہ سے کہ مقدمہ پیش ہو، مانے ہوئے شہادت کے اصول برتے جائیں، گواہ معتبر ہوں وغیرہ۔ تیسرا سوال ہوا کہ کیوں نہ ایک جگہ کے قاضی کا فیصلہ سارے ملک میں ریڈیو سے نشر ہوجائے تو مان لیا جائے۔ میں نے کہا کہ لکھنؤ کا جج ایک مقدمہ میں ڈگری دیتا ہے تو اس کو وہ خود دہلی میں نافذ نہیں کرسکتا۔ وہ ڈگری جب دوسرے جج کے نزدیک ثابت ہوجاتی ہے تو وہ اس کو اپنے

حکم سے بلاچون وچرا نافذ کر دیتا ہےاور زمانہ حال کے قانون میں بھی ریڈ، یوتار، ٹیلیفون کا اعتبار حاضری عدالت کے سمن تک کی ضرورت کے لئے نہیں کیا گیا ہے، نہ کہ کسی حکم یا ڈگری کے نفاذ کے لئے۔ آجکل کے قانون شہادت میں بھی اگر کوئی ٹیلیفون پر شہادت دینا چاہے تو نہیں لی جائے گی اور اس بابت احکام بہت سخت ہیں کہ کسی عدالت کا حکم تار، ٹیلیفون پر نقل کیا جائے تو اس کا اعتبار نہ کیا جائے خواہ وہ کسی حاکم ہی کی زبانی کیوں نہ ہو، احکام خواہ کیسے ہی اہم ہوں، معطل رہتے ہیں جب تک باضابطہ طریقہ پر منتقل نہ ہوں۔ البتہ ہوتا ہے تو اعتبار حلف نامہ کا ہوتا ہے یا معتبر گواہ کے حلف کا وہ بھی خاص مقررہ صورتوں میں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ ریڈیو اور تار جس کی چیزیں ہیں، وہی ان پر اعتبار کرنا نہیں چاہتا، نہیں چاہ سکتا تو اس زمانہ میں دنیا کو اصول قانون کے نئے تصورات پیدا کرنا، بہت نرالی سی بات معلوم ہوتی ہے۔ اس مضمون کی تمہید بھی بہت دلچسپ طریقہ سے شروع کی ہے۔ فتویٰ اور فقہی مسائل پر کوئی رائے دینا تو میرے لئے چھوٹا منہ بڑی بات ہے لیکن محض علمی نقطۂ نظر سے یہ عرض کرنے کی جرأت ہوتی ہے۔ اگر ریڈیو کے سے عالمگیر نظام کو اس ضمن میں مان لیا گیا تو پھر شاید رمضان کبھی ۳۰ روزوں کا ہوا کرے گا اور پھر ٹیلیفون نے کیا قصور کیا ہے؟ اس پر تو جانے بوجھے لوگوں کی آواز بھی پہچانی جا سکتی ہے۔ شملہ، سری نگر، کھٹمنڈو وغیرہا کے لوگ اگر طے کر لیں کہ کم از کم ہندوستان میں رمضان کی ۳۰ رنہ آنے پائے تو ہر ممکن جنتری لغو ہو سکتی ہے اور کیا عجیب کہ جلد ہی وہ وقت بھی آجائے کہ اس اعلان کا کام یو این او کے سپرد کیا جائے جو ریڈیو سے زیادہ معتبر ادارہ ہوگا اور اس کا اعلان اسلامی دنیا بلکہ ہر دنیا کے لئے زیادہ قابل قبول ہو گیا الخ۔

جواب سوال ششم: ہر واقف کار جانتا ہے کہ جمعیت علمائے ہند ایک سیاسی جماعت ہے اور سیاست ہی کے لئے اس کی وضع وتشکیل ہوئی تھی۔ اس نے آج تک جو کچھ کام کیا من حیث جماعت اسی دائرہ میں قدم رکھتے ہوئے کیا۔ اگرچہ حصول مقصد انگریزوں کی ہندستان سے روانگی اور حکومت ہند پر ہنود کے تسلط کے بعد بظاہر سیاست سے علیحدہ ہو گئی ہے لیکن زمانہ دراز سے مجلس بازی، رزولیشن سازی کی جو عادت پڑ گئی ہے ۱۸ و ۱۹ ر اگست کے جلسہ میں بھی وہی روش اختیار کی۔ اخباروں سے معلوم ہوتا ہے کہ جمعیت علمائے ہند کے ۳۵ افراد مراد آباد میں جمع ہوئے لیکن انہوں نے عالمانہ طرز پر عالم ہونے کی حیثیت سے کوئی فتویٰ تحریر نہ کیا، جس کے حکم کو قرآن شریف، حدیث شریف، فقہ کی عبارات سے مدلل کرتے بلکہ سیاسی طرز پر رزولیشن سازی سے کام لیا اگرچہ شرط در شرط کے ساتھ مشروط کرنے کی وجہ سے وہ رزولیشن علمائے محققین کے فتویٰ کے خلاف نہیں، لیکن عوام کو دھوکا اور ہر سال عیدین کے موقع پر ایک جھگڑے کا نیا سامان پیدا کر دیا کہ ہر عید میں جھگڑا ہوا اور لطف یہ کہ فریقین کے ہاتھوں میں جمعیت العلما ہی کا فیصلہ ہو اور دونوں اسی قرارداد سے سند پکڑے ہوئے سر پھٹول کر رہے ہوں۔

مجلس نے جو طے کیا ہے اس کے الفاظ یہ ہیں: ''مجلس نے بالاتفاق طے کیا کہ اگر ریڈیو کے ذریعہ آنے والی خبر کے متعلق یہ اطمینان ہو جائے کہ جس جگہ سے ریڈیو کی خبر دی جارہی ہے، وہاں کے علما نے چاند ہونے کی باقاعدہ شہادت لے کر چاند ہونے کا حکم کر دیا ہے، خبر دینے والا بھی متعین ہو کہ کوئی مسلم معتمد خبر دیتا ہو تو اس اعلان پر اعتماد کر کے دوسرے مقامات پر بھی چاند ہو جانے کے حکم پر عمل کیا جانا جائز ہے اور تمام ہندوستان کے شہروں اور قصبوں میں متعین ذمہ دار جماعات اس کے موافق حکم کریں تو ان پر عمل کیا جائے۔ یہ حکم تمام ہندوستان اور پاکستان کے لئے ہے''۔ بظاہر دیکھنے میں یہ فیصلہ ہے اور اخبار والوں نے بھی اس کو فیصلہ ہی سمجھا۔ اسی لئے مراد آباد کے اس اجتماع کو جو ۱۴ و ۱۵ ذیقعدہ ۱۳۷۰ھ مطابق ۱۸-۱۹/ اگست ۱۹۵۱ء کو ہوا بہت مبارک قرار دیا'' کہ جس طرح اس پیچیدہ صورت حال کا فیصلہ اطمینان بخش اور سکون افزا ہوا جو آنے والے انتخابات کی ہماہمی کے سبب سے پیدا ہو رہی تھی، اس طرح اس مسئلہ (ریڈیو) کے متعلق بھی اطمینان بخش فیصلہ علمائے کرام نے صادر فرما دیا''۔ حالانکہ گہری نگاہ سے دیکھا جائے تو اس مجلس نے نہ کوئی حکم بتایا نہ فیصلہ صادر کیا بلکہ قضیہ شرطیہ کے طور پر عوام کے لئے دل خوش کن بات کر دی۔ اس لئے کہ ہر شخص جانتا ہے کہ ان کانت الشمس طالعۃ فالنہار موجود یعنی اگر آفتاب طلوع ہو تو دن موجود ہوگا، کہنے والا ہرگز نہ حکم ایجابی وجود نہار کا دیتا ہے، نہ حکم سلبی عدم نہار کا۔ یعنی نہ وہ یہ کہتا ہے کہ دن ہے، نہ کہ کہتا ہے کہ دن نہیں ہے بلکہ ایک گول مول بات کہہ کر وقت ٹالنا چاہتا ہے، بعینہ یہی حالت اس فیصلہ کی ہے۔ اس فیصلہ کی ابتدا بھی جملہ شرطیہ سے ہے اور نہ صرف ایک شرط بلکہ شرط در شرط بالائے شرط کے ساتھ اس کو مشروط کیا کہ اگر ریڈیو کے ذریعہ آنے والی خبر کے متعلق یہ اطمینان ہو جائے۔ الخ۔ ہر شخص جانتا ہے کہ یہ فیصلہ کسی عامی شخص کا نہیں، نہ عوام کی پنچایت کا بلکہ جمعیت العلما کے تین درجن مولویوں کا متفقہ فیصلہ اور وہ بھی مشروط بشرائط جسے اخبار الجمعیہ سنڈے ایڈیشن اور دوسرے اخباروں نے دوسطری سرخی کے ساتھ شائع کیا ہے:

''رویت ہلال کا اعلان اور شرعی نقطہ نظر۔ چند شرطوں کے ساتھ ریڈیو کے اعلان پر عمل کیا جاسکتا ہے''۔

اس سرخی نے بتایا کہ ریڈیو کے ذریعہ آئی ہوئی خبر جمعیت علمائے ہند کے نزدیک بھی شہادت کی حیثیت نہیں رکھتی، خود اسی مضمون میں ہے: ''ریڈیو کے ذریعہ جو اعلان کیا جاتا ہے، اس کے متعلق یہ تو ظاہر ہے کہ اس کو شہادت کی حیثیت نہیں دی جاسکتی، نہ اعلان کرنے والا اس کو شہادت کے طور پر پیش کرتا ہے، نہ شرعی قانون شہادت کی شرطیں اس میں پائی جاتی ہیں۔ اس اطلاع کو اگر خبر کی حیثیت دی جائے تب بھی وہ موجودہ صورت میں قابل اعتماد نہیں۔ کیونکہ خبر دینے والا ایک ایسا شخص ہوتا ہے جس کو نہ سننے والے جانتے ہیں اور نہ اس میں وہ شرطیں موجود ہوتی ہیں جو شرعی نقطہ نظر سے ایسی خبروں کے لئے ضروری ہیں۔ علاوہ ازیں وہ صرف ایک شخص کی خبر ہوگی جس کی بنا پر کسی خاص صورت کے

علاوہ عام طور پر رویت ہلال کا فیصلہ نہیں کیا جاسکتا۔

اس عبارت سے صاف ظاہر کہ ریڈیو کی خبر کی حیثیت شہادت کی نہیں بلکہ خبر کی ہے اور خبر بھی شخص واحد کی جو نہ جامع شرائط ہے، نہ سننے والے اس کو جانتے ہیں تو اس کو شہادت کی حیثیت ہرگز نہیں دی جاسکتی بلکہ بعد شہادت فیصلہ و حکم علما کا اس کے ذریعہ صرف اعلان کیا جاسکتا ہے تو اس کی حیثیت ایک ڈگڈگی یا نقارہ کی سی ہوئی اور اناؤنسر اس کے ذریعہ نشر کرنے والا ہوا اور وہ بھی چند شرطوں کے ساتھ مشروط اور ہر شخص مشروط حکم کے متعلق جانتا ہے کہ اس کی حیثیت خواب میں سلطنت کرنے والے شخص کی ہے۔ جب تک خواب دیکھ رہا ہے سلطنت کے پورے سامان ہیں، آنکھ کھلی تو ہو کا میدان۔ یہی حالت مشروط حکم کی ہے اگر شرط پائی گئی حکم برقرار دموجود ورنہ ہباء منثور۔ اذا فات الشرط فات المشروط اور جب کہ ایک شرط نہیں چند شرطوں کے ساتھ حکم مشروط تو سب شرطوں کا پایا جانا ضرور ورنہ حکم بے سیاہ مرچ کا کافور ہوگا۔

اہل علم حضرات بنظر غائر ملاحظہ فرمائیں۔ یہ فیصلہ تین ٹکڑوں پر مشتمل ہے:

اول اگر ریڈیو کے ذریعہ آنے والی خبر کے متعلق یہ اطمینان ہو جائے کہ جس جگہ سے ریڈیو کی خبر دی جاتی ہے، وہاں کے علما نے چاند ہونے کی باقاعدہ شہادت لے کر چاند ہونے کا حکم دیا ہے۔ اس میں چھ شرطیں ہیں۔ اگر ایک بھی منتفی تو حکم معدوم یعنی (۱) اگر ریڈیو سے خبر آئی مگر علما نے حکم نہیں کیا تو ریڈیو کی خبر نا قابل اعتبار (۲) اگر علما نے حکم بھی کیا لیکن بغیر شہادت لئے کسی کے قول پر اعتماد کر کے حکم کیا جب بھی ریڈیو کی خبر نا قابل اعتبار (۳) اگر شہادت بھی لی لیکن باقاعدہ شہادت نہ لی جب بھی ریڈیو کی خبر نا قابل اعتبار (۴) اگر باقاعدہ شہادت بھی لی گئی لیکن علما نے شہادت نہ لی بلکہ معززین کے باقاعدہ شہادت لینے پر علما نے حکم کیا، جب بھی ریڈیو کی خبر نا قابل اعتبار (۵) اگر علما نے شہادت باقاعدہ لی مگر وہاں کے علما نے لی، نہ جس جگہ سے ریڈیو کی خبر دی جارہی ہے بلکہ دوسری جگہ کے علما نے باقاعدہ شہادت لے کر حکم کیا جب بھی ریڈیو کی خبر نا قابل اعتبار (۶) اگر وہیں کے علما نے جہاں سے ریڈیو میں اعلان کیا گیا ہے، باقاعدہ شہادت لی اور حکم کیا لیکن سننے والے کو اس کا اطمینان نہ ہوا، جب بھی ریڈیو کی خبر نا قابل اعتبار۔ غرض پہلے ٹکڑے کی رو سے ان چھ شرطوں کی تحقیق ضروری ہے ورنہ رویت ہلال کے متعلق ریڈیو کی خبر کا کوئی وزن نہ ہوگا۔

دوم دوسرا ٹکڑا یہ ہے کہ خبر دینے والا بھی متعین ہو کہ کوئی مسلم معتمد خبر دیتا ہو تو اس اعلان پر اعتماد کر کے دوسرے مقامات میں بھی چاند ہو جانے کے حکم پر عمل کیا جانا جائز ہے۔ یعنی انہیں چھ شرطوں پر بس نہیں بلکہ ان کے ساتھ ساتھ ساتویں یہ ہے کہ خبر دینے والا متعین ہو۔ اگر کوئی شخص خاص اس کام کے لئے متعین ہو، جب بھی ریڈیو کی خبر نا قابل اعتبار۔ اس لئے ضروری ہے کہ ہر ریڈیو اسٹیشن پر ایک ایک آدمی اس کام کے لئے متعین کیا جائے۔ کیا معلوم

کہاں چاند نظر آئے اور کہاں کی اطلاع سے کہاں روزہ رکھنے، روزہ کھولنے، عید کرنے کا حکم دیا جائے؟ کلکتہ کی خبر سے دہلی والوں پر یا لکھنؤ کی خبر سے مدراس والوں پر دیہات کی خبر سے شہر والوں پر یا شہر کی خبر سے دیہات والوں پر حکم روزہ افطار کا ہوگا تو ہر جگہ ریڈیو اسٹیشن قائم کیا جانا اور ریڈیو اسٹیشن پر ایک آدمی خاص اس کام کے لئے متعین ومقرر کئے بغیر چارہ نہیں (۸) اور صرف متعین ہونا بھی کافی نہیں بلکہ خبر دہندہ کا مسلم ہونا ضرور ورنہ ریڈیو کی خبر نا قابل اعتبار (۹) اور صرف مسلمان ہونے ہی سے کام نہیں چلتا بلکہ خبر دہندہ کو معتمد بھی ہونا ضرور ورنہ ریڈیو کی خبر نا قابل اعتبار۔ ہر شخص جانتا ہے کہ ہندوستان کے طول وعرض میں مذہبی اختلافات کس قدر ہیں اور ہر شخص اپنے ہی ہم مذہب شخص کو معتمد ومستند سمجھتا ہے۔ کیا سنی عالم کے پاس شہادت رویت گذرے اور اس بنا پر ریڈیو سے اس نے اعلان کیا تو اسے شیعہ صاحبان مان لیں گے یا شیعہ مجتہد کے نزدیک رویت کا ثبوت ہوا اور وہ ریڈیو پر اعلان کرے تو اس کو سب سنی معتمد مستند سمجھ کر مان لیں گے پھر سب سننے والوں کا معتمد ہونا کس قدر دشوار ہے؟

سوم پھر تیسرا پیراگراف ملاحظہ کیجئے اور تمام ہندوستان کے شہروں اور قصبوں میں متعین ذمہ دار جماعت اس کے موافق حکم کریں تو ان پر عمل کیا جائے۔ یہ حکم تمام ہندوستان اور پاکستان کے لئے ہے۔ یعنی ان نو شرطوں کے بعد دسویں (۱۰) شرط یہ بھی ہے کہ تمام ہندوستان کے شہروں اور قصبوں یعنی اگر تمام ہندوستان کے شہروں، قصبوں میں حکم نہ کیا بلکہ بعض ہندوستان کے شہروں قصبوں میں حکم کیا جب بھی ریڈیو کی خبر نا قابل اعتبار (۱۱) اسی طرح اگر تمام ہندوستان کے شہروں میں حکم کیا لیکن قصبوں میں حکم نہ کیا، جب بھی ریڈیو کی خبر نا قابل اعتبار (۱۲) علیٰ ہذا اس کے برعکس تمام قصبوں میں حکم کیا لیکن تمام شہروں میں حکم نہیں کیا جب بھی ریڈیو کی خبر نا قابل اعتبار (۱۳) بعد میں اگر تمام دیہات کے متعین ذمہ دار جماعات نے حکم کیا جب بھی ریڈیو کی خبر نا قابل اعتبار کہ شرط تمام ہندوستان کے شہروں قصبوں میں حکم کی ہے، نہ دیہات میں (۱۴) اسی طرح اگر پاکستان کے تمام شہروں، قصبوں دیہات میں ذمہ دار متعین جماعات نے حکم کیا جب بھی ریڈیو کی خبر نا قابل اعتبار کہ شرط تمام ہندوستان کی ہے، نہ پاکستان کی۔ اگر چہ حکم ہندوستان کا پاکستان کو بھی ماننا ضروری ہوگا ملاحظہ ہو اخیر کا فقرہ "یہ حکم تمام ہندوستان پاکستان کے لئے ہے" (۱۵) پھر ان شرطوں کے ساتھ متعین ذمہ دار جماعات کو بھی لحاظ رکھنا چاہئے یعنی اگر تمام ہندوستان کے شہروں قصبوں میں حکم کیا لیکن غیر معین جماعات نے حکم کیا جب بھی ریڈیو کی خبر نا قابل اعتبار (۱۶) متعین جماعات نے حکم کیا لیکن وہ ذمہ دار نہ تھی جب بھی ریڈیو کی خبر نا قابل اعتبار (۱۷) حکم تمام ہندوستان کے شہروں قصبوں میں متعین ذمہ دار جماعت نے کیا جب بھی ریڈیو کی خبر نا قابل اعتبار کہ شرط جماعات بصیغہ جمع ہے نہ جماعت بصیغہ واحد (۱۸) ان تمام شرطوں کے بعد تمام گھاٹیوں سے گذرنے پر بھی ریڈیو کی خبر سے چاند ثابت ہو کر بحکم صوموا لرویتہ وافطروا لرویتہ یہاں بھی

رویت کا حکم ہو کر روزہ رکھنا یا افطار کرنا ضروری نہ ہوگا بلکہ عمل کیا جاسکتا ہے یعنی اگر کوئی عمل کرلے تو مضائقہ نہیں۔ یہ خلاصہ اس متفقہ فیصلہ کا ہے جسے ۳۵ علمائے جمعیت علما ہند نے مراد آباد میں ۱۸-۱۹/اگست کو پاس کیا ہے جو سب کچھ ہے اگر سرسری نگاہ سے دیکھا جائے اور جو گہری نگاہ سے دیکھا جائے تو کچھ بھی نہیں۔ میرے خیال میں یہ فیصلہ لسان العصر اکبر الہ آبادی کے اس شعر کا مصداق ہے۔

دیکھو اسے تو سب کچھ، سوچو تو کچھ نہیں ہے
ہے وہم نقش ہستی ہر چند دل نشیں ہے

ہاں یہ ضرور ہوا کہ عوام خوش ہو گئے کہ ریڈیو کے ذریعہ اعلان پر عمل کرنے کا علما نے چند شرطوں کے ساتھ فتویٰ دیدیا لیکن جب عید الفطر یا عید اضحیٰ کے چاند کے متعلق کسی جگہ کا ریڈیو بولے گا تو..... ہوئے بس است کے مطابق ایک جماعت ریڈیو سے ہی عید کرنے کے لئے تیار ہو جائے گی اور اپنے دعوے کے ثبوت میں اسی فیصلہ کو پیش کرے گی۔ دوسری جماعت کہے گی یہ اعلان قابل اعتبار نہیں، اس لئے کہ علما نے تو ان شرطوں کے ساتھ فیصلہ کیا ہے۔ وہ کہاں پائی گئیں (۱) اس پر کہاں اطمینان ہوا کہ جس جگہ سے ریڈیو کی خبر دی جارہی ہے، وہاں کے علما نے چاند ہونے کی باقاعدہ شہادت لے کر چاند ہونے کا حکم دیا ہے (۲) یہ نشر کرنے والا کون شخص ہے؟ ہم تو اسے جانتے ہی نہیں (۳) پھر کیا معلوم کہ مسلم ہے یا غیر مسلم؟ (۴) مسلم بھی ہے تو کس مذہب و مشرب کا ہے؟ ہمیں اس پر کس طرح اعتماد ہو کہ وہ شرعاً مقبول و قابل وثوق ہے؟ (۵) یہ سب مان لیں پھر تمام ہندوستان کے شہروں، قصبوں میں متعین ذمہ دار جماعات نے اس کے موافق کب حکم کیا ہے جو حسب شرائط فیصلہ یہ اعلان قابل اعتبار ہو؟ شرطوں پر عمل کے متعلق عوام کی حالت اگر جمعیت علمائے ہند کے حضرات معلوم کرنا چاہیں تو مولوی اشرف علی صاحب کی کتاب امداد الفتاویٰ ملاحظہ فرمائیں اور ان کے تلخ تجربہ سے سبق حاصل کریں۔ اس لئے کہ یہ ۳۵ حضرات جن کا فیصلہ اخبار والے اچھال رہے ہیں اور عوام شد و مد کے ساتھ پیش کر رہے ہیں، اکثر ان کے شاگرد کی حیثیت رکھتے ہیں اور بہتیرے شاگرد کے شاگرد کی حیثیت کے ہوں گے۔ شاید ہی گنے چنے حضرات ان کے مساوی اور برابری کی حیثیت کے ہوں تو جب ان کو اپنا مشروط فتویٰ عوام کی بے احتیاطیوں اور ان کی وجہ سے شرور و فتن پیدا ہونے کی وجہ سے کہ عوام ان قیود و شرائط کو ملحوظ نہیں رکھ سکتے، واپس لینا پڑا۔ اس لئے ان ۳۵ علمائے جمعیت العلما ہند سے نہایت ہی مخلصانہ گذارش ہے کہ مولوی اشرف علی صاحب کے تجربہ سے آپ حضرات بھی فائدہ اٹھائیں اور اس فیصلہ کو واپس لیں ورنہ کچھ دنوں کے بعد ہر جگہ جنگ و جدل، نزاع، سر پھٹول اسی فیصلہ کی وجہ سے دیکھ کر اس سے رجوع کرنا ضرور ہوگا۔

امداد الفتاویٰ کی عبارت درج ذیل ہے: ''اس کے قبل بندہ نے تار کو خط یا طبل و مدفع یعنی توپ پر قیاس کر کے اس باب میں ایک تقریر لکھی تھی جس میں قبول تار میں کچھ تفصیل اور بعض شرائط کے ساتھ تقیید تھی مگر اس سال

یعنی ۱۳۲۷ھ کی رویت شوال کے متعلق تاروں پر عمل کرنے میں بے علموں اور کم علموں نے بے احتیاطیاں کیں اور ان سے جو فتن وشرور پیدا ہوئے ،ان کو دیکھ کر تجربہ ہوا کہ عوام ان قیود وشرائط کو ملحوظ نہیں رکھ سکتے اور نیز اخبار متواترہ سے تحقیق ہوا کہ تار میں مختلف اقسام کی غلطی اور دھوکہ بھی زیادہ محتمل ہے۔ لہذا خط سے بھی ادون ہے کہ خط میں اس کے طرز سے کچھ تو شناخت کاتب کی ہوتی ہے پھر بھی الخط یشبہ الخط بعض احکام میں کہا گیا ہے اور تار میں تو اس کی بھی کوئی علامت نہیں اور نیز طبل سحر و مدفع افطار سے بھی اضعف ہے کیونکہ ان کی ضرب ایک جماعت حاضرین کی مشارکت سے ہوتی ہے جس میں جرأت تعمد خدع کی ابعد ہے، تار میں یہ بھی نہیں۔ ان امور پر نظر کر کے سد اللذرائع وحسما للمادہ ،اس تفصیل سے رجوع کر کے اب یہ حکم متعین سمجھتا ہوں کہ اس باب میں تار کی خبر اصلا قابل اعتبار ولائق عمل نہیں واللہ اعلم ۔۳ ذیقعدہ ۱۳۲۷ھ"۔

بالجملہ بمضمون السعید من وعظ بغیرہ، لوگوں کو اس تجربہ سے سبق لینا چاہئے اور ہرگز مناسب نہیں کہ عوام کے سامنے کوئی مشروط فیصلہ یا حکم پیش کریں۔ اس لئے کہ عوام بے احتیاطی سے کام لیں گے اور شرائط کا لحاظ نہ کریں گے بلکہ جو بات ان کی خواہش کے مطابق ہوگی، کر گذریں گے اور علما کے سر سارا الزام ڈالیں گے اور اسی فیصلہ کا سہارا پکڑیں گے۔ واللہ یقول الحق وھو یھدی السبیل وھو الھادی وھو الموفق واللہ تعالیٰ اعلم وعلمہ جل مجدہ اتم و احکم۔

☆☆☆☆☆

مسئلہ مرسلہ حافظ عبدالکریم صاحب از علی گڑھ ۲۵ محرم الحرام ۱۳۲۳ھ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ روافض کہتے ہیں کہ روزہ کو رات میں افطار کرنا چاہئے اور یہ حوالہ دیتے ہیں " ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّیَامَ اِلَی الَّیْلِ"۔ ان کو کیا جواب دیا جائے؟ اور افطار کا وقت کون ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب

رات میں افطار سے اگر یہ مراد ہے کہ جب دن ختم ہو جائے اور رات آ جائے ،اس وقت افطار کرنا چاہئے تو یہ بے شک حق ہے۔ اور یہی مفاد آیت کریمہ ہے اور یہی اہلسنت و جماعت کا مذہب وعمل ہے۔ دن کے ختم ہونے اور رات کے داخل ہو جانے میں بیچ میں کوئی وقفہ نہیں۔ ایک آن واحد دونوں میں مشترک ہے۔ مگر یہ روافض کا مذہب نہیں ہے۔ ان کے نزدیک جب تک ایک حصہ معتد بہ رات کا نہ گذر جائے ،افطار جائز نہیں۔ ان سے یہ پوچھا جائے کہ لیل سے مراد اول لیل لیتے ہو یا آخر یا اس کے وسط کا کوئی حصہ؟ ثالث غیر متعین ہے۔ نہ آیت کریمہ سے کچھ پتہ چل سکتا ہے کہ گھڑی بھر رات گذرے مراد ہے یا ایک پہر یا دو پہر۔ ثانی بداہۃً باطل۔ ورنہ معنی یہ ہوں گے کہ ساری رات گذر جائے ،دوسرے دن کے صبح کو افطار کرو۔ لاجرم شق اول متعین ، کہ آغاز لیل ہونے تک روزہ پورا کرو، اور یہی مذہب اہلسنت کا ہے۔ روافض کا یہ قول

بے باک شریعت مطہرہ پر افترا ہے۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: ”اذا اقبل اللیل من ھھنا و غربت الشمس فقد افطر الصائم۔“

نیز فرماتے ہیں: ”لا یزال الناس بخیر ما عجلوا الفطر۔“

رہا اس کا حوالہ دینا اور اپنے زعم میں آیت قرآنیہ کو اپنا مؤید سمجھنا، سو یہ خیال خام، بلکہ نقش بر آب ہے۔ اس کا جواب یہ کہ غائت اگر جنس ماقبل سے ہو تو تحت حکم مغیا داخل ہوگا۔ مثل مرفقین وکعبین کے بوجہ جنس مغیا ہونے، داخل حکم مغیا یعنی غسل ہے اور اگر غائت غیر جنس مغیا ہو تو نہیں داخل ہوگا۔ اور یہاں صورت ثانیہ ہے۔ والتفصیل فی کتب الاصول من شاء فلینظر الیہ۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

☆☆☆☆☆

مسئلہ از بنارس محلہ مدنپورہ مرسلہ مولوی عبد الرحمان ۶ ر جمادی الاولی ۱۳۲۳ھ

زید کہتا ہے کہ دعا ”اللھم لك صمتُ وبك اٰمنتُ وعلیك توكلتُ وعلیٰ رزقك افطرت“ میں سب صیغہ ماضی کے ہیں۔ اور ماضی دعا میں مستقبل کے معنوں میں ہو جاتی ہے۔ تو یہ سب صیغے مستقبل کے معنی میں ہوں گے۔ اور عمرو کہتا ہے کہ وہ جو کتابوں میں لکھا ہے، اس کا مطلب تو یہ ہے کہ جس ماضی کے ساتھ اپنے کو یا غیر کو دعا کی جاتی ہے، نہ یہ کہ جو صیغے کہ دعا میں بولے جاتے ہیں۔ خواہ بغرض ماضی، ان سب سے مستقبل کے معنی لئے جائیں۔ تو ان دونوں میں قول صحیح کس کا ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب

بے شک عمرو سچا ہے زید کا قیاس محض فاسد ہے۔ قائل کا مقصود ان الفاظ سے دعا کرنا نہیں ہوتا۔ رہا لفظ افطرت سو اگر قبل افطار پڑھا تو البتہ معنی استقبال محتمل ہے۔ ورنہ اس میں بھی خبر مقصود ہوتی ہے۔ واللہ اعلم۔

☆☆☆☆☆

مسئلہ از کیمپ میرٹھ، کوٹھی خان بہادر، مرسلہ منشی میر محمد ۶ ر ربیع الاول ۱۳۳۵ھ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ برخوردار حبیب محمد نے سترہ برس ۵ ماہ ۴ یوم کی عمر میں اس جہانِ فانی سے بعالمِ جاودانی رحلت کی۔ ایام حیات میں نماز مرحوم پابندی کے ساتھ نہیں پڑھتے تھے۔ لہذا میں چاہتا ہوں کہ کل نمازوں کا کفارہ جس قدر سن بلوغ سے ایام وفات تک قضا ہوں یا جس قدر واجب ہوں، ادا کروں۔ براہ نوازش کتب فقہ وحدیث سے ٹھیک تعداد وایام تعداد کفارہ یومیہ وکل کفارہ سے کس قدر ہوا، معزز کیجئے۔ مرحوم کے سات سال کی عمر سے کبھی رمضان شریف کے روزے قضا نہیں ہوئے۔ البتہ امسال بحالت بیماری یک ماہ کے روزہ قضا ہوئے، ان کا کفارہ کیا ہوگا؟ پیدائش مرحوم ۶ ر شوال ۱۳۰۶ھ ہوئی بوقت ۷ بجے شام اور وفات ۱۰ ر ذی الحجہ بوقت ۳ ر بجے کے ہوئی۔ بینوا وتوجروا۔

الجواب

حسب تصریح فقہاء کرام ہر نماز، ہر روزہ کا فدیہ، گیہوں خواہ اس کے آٹے یا ستو کے نصف صاع اور جو اور اس کے ستو اور آٹے سے ایک صاع ہے۔

درمختار میں ہے: ”لو مات وعلیہ صلوات فائتۃ واوصیٰ بالکفارۃ یعطی لکل صلاۃ نصف صاع من بُر کالفطرۃ وکذا حکم الوتر والصوم۔“

اسی میں ہے: ”یجب نصف صاع من بر او دقیقہ او سویق وصاع من تمر او شعیر اھ“

سنن ونفل کا کفارہ نہیں کہ وہ مکملات ہیں۔ دن رات میں صرف وتر وفرائض خمسہ کے چھ کفارہ، جس کے تین صاع گیہوں، چھ صاع جو ہوئے۔ صاع عربی پیمانہ ہے، ہمارے بلاد میں مروج نہیں۔ لہذا اس کا حساب سیروں سے عام فہم ہے۔

فاقول وباللہ التوفیق: صاع دو سو ستر تولے، نیم صاع اس کا نصف ایک سو پینتیس تولے، تولہ بارہ ماشے، ماشہ ۸ رتی، رتی آٹھ چاول کا ہوتا ہے۔ اور انگریزی روپیہ سکہ رائجہ سوا گیارہ ماشے ہیں۔ پس چہارم صاع کی مقدار آٹھ سو دس ماشے یعنی ساڑھے سرسٹھ تولے ہوئے اور نیم صاع ایک سو پینتیس تولے اور اس انگریزی روپیہ سے ایک سو چوالیس روپیہ بھر ہوئے۔ انگریزی سیر کہ بنگال وہندوستان وپنجاب کے اکثر شہروں میں مروج ہے، اسی روپیہ بھر یعنی پچہتر تولے کا ہے۔ اس سیر سے ایک صاع کے ساڑھے تین سیر اور ڈیڑھ چھٹانک اور دسواں حصہ چھٹانک کا ہوا۔ تو فدیہ یومیہ نماز کا ۳ صاع گندم یعنی دس سیر...... چھٹانک ہوا یعنی چار روپے بھر اوپر پونے گیارہ سیر۔ اور ہر ماہ کے کہ ۳۰ دن کا ہو، آٹھ من چار سیر ہوئے۔ اور حسب تصریح علماء عظام سال قمری کبھی تین سو پچپن دن سے زائد نہیں ہوتا۔ تو سال بھر کے پچانوے من چونتیس سیر ہوئے۔ پس اگر مدت بلوغ معلوم ہے تو ان سترہ سال ۲ ماہ ۴ دن سے اس قدر نکال کر باقی کا فدیہ سال ماہ یوم سے حساب کر کے ادا کریں۔ اور اگر معلوم نہیں تو اقل مدت بلوغ کہ مرد کے لئے ۱۲ برس ہے، نکال کر باقی ۵ سال ۲ ماہ ۴ دن کے چار سو چھیانوے من اکیس سیر تین چھٹانک، اور پانچواں حصہ چھٹانک کا کفارۂ نماز میں ادا کریں۔ خواہ بازار کے نرخ سے اس قدر کی قیمت دیں۔

رہے انتیس کفارے روزے کے کہ رمضان ۱۳۲۴ھ ۲۹ ہی دن کا ہوا، اس کی دو صورتیں ہیں۔ اگر ایسا مرض جس میں روزہ مضر تھا یا روزے کی طاقت نہ تھی، شروع ماہ مبارک سے آخر تک برابر مستمر رہا۔ اور شوال تک بھی کوئی دن ایسا نہ پایا جس میں روزے کا امکان ہوتا۔ جب تو ان روزوں کا فدیہ اصلاً لازم نہیں۔ اگر شروع رمضان سے ۶ شوال تک کچھ دن ایسے پائے جس میں روزہ رکھنا مضر نہ ہوتا اور اس کی طاقت تھی، تو ایسے جتنے دن ہوئے، ان کا کفارہ وہی فی روزہ نیم صاع کے حساب سے یعنی چار روپے بھر اوپر پونے دو سیر کے ادا کریں۔ یہ سب فدیے کسی فقیر مصرف زکوٰۃ پر تصدق کریں۔

درمختار میں ہے: ”فان ماتوا فیہ ای فی ذلک العذر فلا تجب علیہم الوصیۃ بالفدیۃ لعدم ادراکہم عدۃ من ایام اخر ولو ماتوا بعد زوال العذر وجبت الوصیۃ بقدر ادراکہم عدۃ من ایام اخر۔“ واللہ تعالیٰ اعلم۔

(سوال دستیاب نہ شد)

الجواب

طریقش آن ست کہ حساب کنند سالہای عمر میت را وادنیٰ مدت در مرد دوازدہ سال و در زن نہ سال است، وضع کنند۔ باقی را مقابل ہر شش نماز واجب شبانہ روز کہ سہ صاع کامل گیرند و ماہہا کامل سی روز اعتبار کنند تا فدیہ نمازہائے یکساں کہ سی وصد وشصت روز است، یکہزار و ہشتاد صاع حاصل آید۔ مگر از آنجا کہ سال قمری بیش از سہ صد و پنجاہ و پنج یوم نمی شود، فدیہ سال کامل یک ہزار شصت و پنج صاع از گندم شد و پانزدہ صاع فدیہ رمضان افزائند، ہمگی فدیہ تمام سال یک ہزار و ہشتاد صاع شود و زناں را اگر عادت حیض معلوم بود فبہا ورنہ از پیش بلوغ تا عمر پنجاہ سال یا بہر عمر کہ حیضش منقطع شدن معلوم باشد، بہر ماہ سہ روز کم کنند۔ ہمیں طریق سالہائے تمام عمر را حساب کنند۔ حاصل آنرا موافق قیمت آں وقت اگر ارزانی شود مبلغ مشخص نمودہ والا پس ہر قدر کہ غلہ شدہ باشد بفقراء ہر کہ مصرف زکوٰۃ باشد، دہند۔ واما فی زماننا کہ رغبت عامہ کسان در امور شرعیہ فاترست یا بوجہ قلت استطاعت قدر مذکور ادا نتوانند کہ تیسرش آنست کہ قدرے گندم یا جو وغیرہا کہ میسر شود۔ منجملہ باین نام بفقراء دہند واو قبول کردہ اینہا را بدہد۔ باز بہماں نام دہند و ہمچنیں مکرر کنند تا آنکہ فدیہ نماز و روزہائے بتمام وکمال ادا شود۔

امام بزازی در فتاوی خود فرمایند: ''ان لم یکن لہ مال یستقرض نصف صاع ویعطیہ المساکین ثم یتصدق بہ المسکین علی الوارث ثم الوارث الی المسکین ثم وثم حتی یتم لکل صلوۃ نصف صاع کما ذکرنا۔'' ہکذا فی البحر الرائق والخلاصۃ والہندیۃ والطحطاوی علی مراقی الفلاح وابی السعود علی المسکین والملتقط والبرجندی والدر المختار وغیرہما من معتمدات الاسفار۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

☆☆☆☆☆

کتاب النکاح ۵

مسئلہ مرسلہ مولوی ظہور الحسن رامپوری مدرس مدرسہ محمدیہ راندیر ۲۵؍رجب ۱۳۲۴ھ

درنکاح ایجاب وقبول کہ رکن است اگر بجائے قبول الحمد للہ گفت وقبول کردم وغیر آن از الفاظ قبولیہ نگفت۔ دریں صورت نکاح نافذ خواہد شد یانہ؟ بینوا وتوجروا۔

الجواب

نہ۔ فی الهندية: "سئل نجم الدين عمن قال لامرءة خویشتن را بہزار درم کابین بمن بزنی وادی فقالت بالسمع والطاعة قال ينعقد النكاح۔ ولو قالت سپاس دارم لاينعقد۔ لان الاول اجابة والثانی وعد كذا فی المحيط۔" والله تعالیٰ اعلم۔

☆☆☆☆☆

مسئلہ مرسلہ سید محمد ظہور احمد، بیتھو شریف ضلع گیا ۶؍صفر المظفر ۱۳۲۳ھ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ چوری سے نکاح درست ہے یا نہیں؟ یعنی وکیل بالنکاح اور شاہدین جانتے ہوں یا ایک ایسا شخص اور سوائے ان تین کے جانتے ہوں اور بعد نکاح بھی اخفاء منظور ہو اور یہ مقصود ہے کہ حمل نہ رہے، جو افشائے نکاح ہو یا یہ بات کہ فلانہ عورت سے بذریعہ نکاح جو تعلق ہے، ظاہر نہ ہو۔ بینوا وتوجروا۔

الجواب

عورت جو چھپا کر نکاح کرنا چاہتی ہے، اگر نابالغہ ہے تو ظاہر کہ بغیر اولیاء کے نکاح نافذ نہیں۔

درمختار میں ہے: "وهو ای الولی شرط صحة نكاح صغير ومجنون ورقيق۔"

ردالمحتار میں ہے: "فلا يصح الا بولی۔"

اور اگر بالغہ ہے اور اس کے لئے کوئی ولی نہیں یا جس سے نکاح کرنا چاہتی ہے، وہ اس کا کفو ہے یعنی نسب یا مذہب یا چال چلن یا پیشہ یا کسی بات میں ایسا کم نہ ہو کہ اس سے نکاح اس عورت کا ہونا اس کے اولیا کے لئے باعث ننگ وعار ہو یا کفو بھی نہیں نہ تو اس عورت کے ولی کو اس کی اطلاع ہے اور وہ یہ جان کر کہ یہ شخص اس کے ساتھ اس نکاح پر راضی ہے تو ان دونوں صورتوں میں نکاح ہو جائے گا۔ جبکہ دو مرد یا ایک مرد، دو عورتیں ایجاب وقبول دونوں کو ایک جلسہ میں کرادیں اور اتنا سمجھیں کہ یہ نکاح ہو رہا ہے۔ اور اگر یہ صورت نہیں بلکہ اس عورت نابالغہ کے اولیا موجود ہوں، جس سے نکاح کرتی ہے یہ کفو نہیں اور اولیاء کو خبر نہ کی گئی، یا وہ راضی نہیں یا راضی ہوئی لیکن انہیں کفو نہ ہونا معلوم نہیں، تو سرے سے نکاح ہوگا ہی نہیں۔ اور صورت اولیٰ جس سے نکاح ہو جائے گا، اس میں بھی ایسا اخفاء ناپسند وخلاف شرع ہے۔

حضور اقدس ﷺ فرماتے ہیں: ''اعلنو ھذاالنکاح واجعلوہ فی المساجد واضربوا علیہ بالدفوف۔'' ''نکاح کا اعلان کرو، اسے (تبرکاً) مسجد میں کرو، اس پر دف بجاؤ''۔ رواہ الترمذی عن عائشۃ رضی اللہ عنھا والامام احمد فی مسندہ وابن حبان فی صحیحہ والطبرانی فی الکبیر وابو نعیم فی الحلیۃ والحاکم فی المستدرک عن ابن الزبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حدیث شریف میں ہے: ''فصل ما بین الحلال والحرام الدف والصوت فی النکاح۔'' ''زنا اور بیوی سے مجامعت میں فرق دف اور صوت ہے کہ زنا چھپکے چھپکے کیا جاتا ہے اور نکاح اعلان کے ساتھ''۔ رواہ احمد والترمذی والنساء وابن ماجہ۔

شرعۃ الاسلام میں ہے: ''والسنۃ فی النکاح الاعلان ای الا ظہار لیقع الفصل بینہ وبین السفاح۔''

درصورت جواز نکاح یہ قصد کہ ولادت نہ ہو، مستلزم ہے عزل کو یعنی وقت جماع فرج سے باہر انزال۔ عورت اگر حرہ ہو (اور بیشک یہاں سب کی عورتیں ایسی ہیں) تو بے ان کے اذن جائز نہیں۔ عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے: ''نھیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان یعزل عن الحرۃ الا باذنھا۔'' اور اگر وہ بھی راضی ہو تو ایک عبث فعل ہے۔

حضور اقدس ﷺ سے عزل کے بارے میں پوچھا گیا۔ فرمایا: ''ما من کل الماء یکون الولد واذا اراد اللہ خلق شیٔالم یمنعہ شیٔ۔''

بلکہ ناپسند اور مقصود شرع کے خلاف ہے۔ حدیث شریف میں ہے، رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں: ''تزوجوا الودود الودود فانی مکاثر بکم یوم القیمۃ۔'' نکاح فی نفسہ کوئی بری چیز نہیں کہ ظاہر نہ کیا جائے۔ حضور اقدس ﷺ فرماتے ہیں: ''النکاح من سنتی فمن رغب عن سنتی فلیس منی۔'' نکاح میری سنت ہے، جو اس سے اعراض کرے وہ مجھ سے نہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

☆☆☆☆☆

مسئلہ از شہر کہنہ...... ۸ر جمادی الثانی ۱۳۲۳ھ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ عمرو کے نکاح میں اپنی پھوپھی زاد بھائی کی لڑکی اور ماموں زاد بھائی کی لڑکی آسکتی ہے یا نہیں؟ بینوا وتوجروا۔

الجواب

عمرو کے نکاح میں بے شک آسکتی ہے۔ قال اللہ تعالیٰ: "وَأُحِلَّ لَكُم مَّا وَرَاءَ ذَٰلِكُمْ۔ (النساء:۲۴) درست ہے نکاح کرنا سوائے ان محرمات منصوصہ کے" واللہ تعالیٰ اعلم۔

☆☆☆☆☆

مسئلہ از فرید پور، بریلی مرسلہ قاضی محمد صلاح الدین ۱۲/ جمادی الآخرۃ ۱۳۲۳ھ

چہ می فرمائند علمائے دین اندریں صورت کہ زید بحالت مجرد، ایک عورت مسماۃ ہندہ، بیوہ سے شادی کی اور ہندہ اپنے ساتھ ایک لڑکا عمرو لائی۔ عمرو کی وفات کے بعد عمرو کی بیوہ سے زید کی شادی جائز ہے یا نہیں؟ بینوا وتوجروا۔

الجواب

بلاشبہ عمرو کی بیوہ بیوی کا نکاح زید کے ساتھ جائز ہے۔ قال اللہ تعالیٰ: "وَاُحِلَّ لَکُمْ مَاوَرَاءَ ذٰلِکُمْ۔(النساء:۲۴)" اور ان کے سوا جو رہیں، وہ تمہیں حلال ہیں۔" (کنزالایمان)

منحۃ الخالق میں ہے: "ولا تحرم بنت زوج الام وامہ ولا ام زوجۃ الاب ولا بنتھا ولا ام زوجۃ الابن ولا بنتھا ولا زوجتہ ولا زوجۃ الاب رملی۔" واللہ تعالیٰ اعلم۔

☆☆☆☆☆

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ ایک شخص نے نکاح کیا۔ اس عورت کے ہمراہ ایک لڑکی سات برس کی تھی اور اس شخص کے ایک لڑکا تھا۔ پہلی بیوی سے دس برس کا، اب وہ لڑکی اور لڑکا دونوں جوان ہو گئے۔ اب وہ شخص اور وہ عورت باہم لڑکی اور لڑکے کا نکاح کرتے ہیں، جائز ہے یا نہیں؟ بینوا وتوجروا۔

الجواب

بلاشبہ جائز ہے۔ نکاح آپس میں درست ہے۔ قال اللہ تعالیٰ: "وَاُحِلَّ لَکُمْ مَاوَرَاءَ ذٰلِکُمْ۔(النساء:۲۴)" اور ان کے سوا جو رہیں، وہ تمہیں حلال ہیں۔" (کنزالایمان)

بحرالرائق میں ہے: "تحل اخت اخیہ نسبا بان یکون لہ اخ من اب او اخ من امہ فانہ یجوز لہ التزوج بھا ھکذا فی شرح الکنز والتبیین والملا مسکین۔" واللہ تعالیٰ اعلم وعلمہ اتم واحکم۔

☆☆☆☆☆

مسئلہ مسئولہ از شہر......۳۰/ ذیقعدہ ۱۳۲۳ھ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ایک شخص کی زوجہ نے انتقال کیا اور شخص مذکورہ کی خواہش یہ ہے کہ اپنی سگی بھتیجی بہو سے جو کہ بیوہ ہے عقد کرنا چاہتا ہے۔ ازروئے شرع شریف درست ہے یا نہیں؟ بینوا وتوجروا۔

الجواب

اگر کوئی وجہ حرمت رضاعت یا قرابت سے نہیں تو اس شخص کا نکاح اپنی بھتیجی بہو سے درست ہے قال اللہ تعالیٰ: "وَاُحِلَّ لَکُمْ مَاوَرَاءَ ذٰلِکُمْ (النساء:۲۴) اور حلال کی گئی تمہارے لئے ماسوا محرمات منصوصہ کے۔ اور ظاہر ہے کہ محرمات منصوصہ سے بھتیجی بہو نہیں۔ والمسئلۃ لاتخفی علیٰ من لہ عقل سلیم وفوق کل ذی علم علیم واللہ تعالیٰ اعلم۔

جواب صحیح اور مجیب نجیح ہے واللہ اعلم فقیر الیٰ القدیر وصی احمد قادری مدرس مدرسۃ الحدیث پیلی بھیت محلہ میر خاں

مسئلہ مرسلہ حافظ نبی بخش محافظ دفتر سرائے خادم ۷ ربیع الثانی شاہجہاں پور ۱۳۲۳ھ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ ایک طوائف غیر مذہب نے اپنا نکاح مسلمان کے ساتھ بلا مسلمان ہوئے کیا۔ ایک ماہ تک اس کے مکان پر رہی اور کھانا پینا بھی شمول رہا۔ بعد ایک ماہ، زید کے یہاں سے نکل کر بکر کے ساتھ نکاح کرلیا۔ قبل نکاح ثانی کے اس کوکلمہ شریف پڑھایا گیا اور نماز بھی پڑھائی گئی۔ اسلام میں مذہب امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک شرع شریف میں وہ نکاح اول یعنی زید کے ساتھ اور نکاح ثانی یعنی بکر کے ساتھ ان دونوں میں کوئی نکاح درست ہے یا نہیں؟ اگر کوئی درست نہیں ہوا، تو اب شرع شریف کے نزدیک کس طرح پر درست ہوسکتا ہے یا نہیں؟ بینوا وتوجروا۔

الجواب

طوائف کا، اگر وہ کتابیہ تھی اور اس نے اپنا نکاح زید کے ساتھ قبل قبول مذہب اسلام کرلیا تو یہ نکاح صحیح ہوگیا۔ لعدم المانع۔ اس کے بلا طلاق وموت زید جو نکاح بکر سے کرلیا، یہ نکاح درست نہیں اور نہ ہوا۔ قال اللہ تعالی جل وعلا: "وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَاءِ" (النساء: ٢٤) ''اور حرام ہیں شوہر دار عورتیں۔'' (کنز الایمان)

جلالین میں ہے: ''وحرمت علیکم ای ذوات الازواج من النساء من قبل مفارقة ازواجهن "یعنی اور حرام کی گئیں تم پر شوہر دار عورتیں قبل مفارقت ازواج ان کے۔ اگر وہ عورت مشرکہ تھی تو بلا مسلمان ہوئے اس کا نکاح زید سے درست نہ ہوا۔ قال اللہ تعالی: "وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ (البقرة: ٢٢١) اور نہ نکاح کرو مشرکات سے جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں۔ اس صورت میں بعد اسلام جو نکاح اس نے بکر سے کیا، وہ صحیح ہوا۔ لخلوھا من الازواج و المسئلة مشهورة۔ واللہ تعالی اعلم۔

☆☆☆☆☆
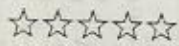
بحضور جناب زبدة العارفین وقدوة السالکین، خاتم المحدثین، وارث علوم سید المرسلین، اعلیٰ حضرت استاذنا ومرشدنا صاحب قبلہ ادام فیوضہم علینا وعلی سائر المسلمین آمین

پس از تقدیم آداب وقدم بوسی معروض خدمت بابرکت میں یہ ہے کہ بہت دن گذر گیا ہے کہ ایک خط مندرج ایک سوال کے ارسال خدمت کیا گیا تھا۔ مگر شومی بخت سے جواب نہیں دیا گیا۔ لہذا بار دیگر عرض کرتا ہوں۔

سوال: ایک شخص نے ایک آدمی کو اس وعدے سے کہ اپنی لڑکی کی شادی کر دیں گے، اپنے گھر میں لایا اور کہا کہ تم میرے گھر داماد رہو! مگر میرے گھر کا کام کما حقہ انجام دینا ہوگا۔ دین مہر کذا وکذا پر جانبین سے قواعد قرار ٹھیک ہوئی ۔تم جو میرے گھر میں کام کروگے، اس سے مہر ادا کیا جائے گا۔ مگر یہ بات معلوم نہیں تھی کہ ناکح پر بہت روپیہ قرض تھا۔ جب کہ اتنا روز گذرا، قرض خواہوں نے تقاضہ شروع کیا۔ اب دلہن کے باپ نے اپنی طرف سے اس کا قرض کچھ ادا کیا اور کچھ باقی رہا۔ پھر جب کچھ دن گذرے تو ناکح کہتا ہے کہ اب نکاح کرادو۔ دلہن کا باپ کہتا ہے، تم میرے پا

س آئے، اتنا اتنا قرض تھا تم پر، میں نے تمہارا قرض ادا کیا۔ اس وقت میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ تم کچھ روپیہ کہیں سے لاؤ تب شادی ہو جائے گی۔ انہوں نے بہت تلاش کیا اور قرض چاہا مگر آگے کا مقروض تھا، کہیں سے کچھ نہیں پایا۔ پھر دلہن کے باپ نے کہا کہ تھوڑا دن میرے پاس ٹھہرو، میرے پاس کچھ روپیہ ہو جائے، تب تمہاری شادی کرا دیں گے، مگر وہ نہ مانا۔ دوسرے ایک آدمی سے مل کر رات کو اس لڑکی کو چرا کر لے بھاگا اور مشورہ دینے والے کے گھر میں رکھا۔ لے جانے کے بعد دلہن کے باپ نے اس کے پاس رو رو کر کہا کہ مجھ کو شرم مت دینا، میرے گھر میں آؤ، میں بخوشی نکاح کرا دوں گا۔ جب دلہن نے یہ بات سنی تب یہاں سے دوسری جگہ لے جا کر دونوں چھپ رہے۔ تو دلہن کے باپ نے پولس کو خبر کر دی۔ قریب دو مہینہ بعد میاں بی بی دونوں پکڑے گئے۔ حاکم کے پاس مقدمہ دائر ہوا۔ تو آ کر فیصلہ یہ ہوا کہ لڑکی کو اپنے والدین کے حوالہ کیا جائے اور اس کو محبوس ڈیڑھ مہینہ کیا اور دولہا کے پاس نہ گھر رہنے کو نہ جگہ گھر باندھنے کو۔ نہ طعام ایک وقت کا موجود ہے اور نہ ایک کوڑی مول لینے کو ہے۔ ایسا مفلس اور نادار شخص ہے۔ ایسے آدمی کو ایک لڑکی کیوں کر دی جائے، نہ ایک کپڑا دے سکتا ہے۔ پس دلہن کے باپ نے دوسرے آدمی کو کہ اس کے پاس دو سو روپیہ موجود ہے، اس سے نکاح کرا دیا۔ تب ظاہر ہوئی یہ بات کہ جو چرا کر لے گیا تھا، اس وقت میاں جن نے نکاح پڑھوایا تھا مگر جس وقت کہ مقدمہ دائر تھا، اس وقت کسی نے یہ بات نہیں کہی اب جب کہ نکاح دوسرا ہو گیا۔ جو لوگ شاہد اور وکیل تھے، کہتے ہیں کہ نکاح اس سے ہو گیا تھا مگر لڑکی سے قبل نکاح ثانی کے ہم دو تین آدمیوں نے بہت پوچھا اور بار بار استفسار کیا لیکن وہ برابر انکار ہی کرتی رہی کہ نکاح نہیں ہوا۔ ایک دفعہ ایک عورت سے اقرار کرتے سنا ہوں مگر اپنے کان سے نہیں سنا اور یہ بات پھر پوچھی گئی تھی۔ مہر میں کچھ تعین کیا گیا تھا یا نہیں؟ کچھ کپڑا بھی نقد دیا تھا یا نہیں؟ برابر کہا کہ نہیں۔ واقعہ بھی یہی تھا کہ اس نے کچھ نہیں دیا۔ حاکم برہما تھا۔ لڑکی چودہ برس سن کی تھی۔ برہما قانون میں نابالغ ٹھہرایا، نابالغ اپنے اختیار سے نکاح نہیں کر سکتی ہے۔ مگر از روئے شرع محمدی، موافق مذہب حنفی کے لڑکی بالغہ ہے۔ خوب ظاہر، اس میں کچھ شک نہیں۔ اب لڑکی کے والدین کہتے ہیں کہ اگر اس سے نکاح ہو گیا ہو، تا ہم اس کو لڑکی نہیں دیں گے۔ چونکہ اس کو نہ گھر ہے، نہ جگہ گھر باندھنے کی ہے اور نہ روزی ایک روز کی موجود ہے۔ اور نہ وہ ایک کپڑا دے سکتا ہے، ایسے آدمی کو لڑکی کیسے دی جائیگی؟ بالفرض اگر دی بھی جائے تو وہ کیا کھلائے گا اور کہاں رکھے گا؟ اس سے اگر نکاح ہوا ہے تو فسخ کر دوں گا، چونکہ وہ میرا کفو نہیں ہو سکتا ہے۔ اب یہ مسئلہ میرے پاس آیا ہے۔ مگر میں کیا جواب دوں، ساکت ہوں، کچھ جواب نہیں نکلتا ہے۔ اب آنحضور خوب تحقیق کر کے، عبارت کتب تحریر فرما کر بندہ کے پاس ارسال فرمائیں۔ اگر صورت فسخ ہو تو صحیح اگر نہ ہو تو صحیح۔

جواب مرسلہ مولوی واعظ الدین بنگالی پنجم محرم الحرام ۱۳۲۴ھ

مولانا المکرم وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ! اس شخص کی حالت جو لڑکی کو لے گیا تھا اور دعوی نکاح کرتا ہے، جس طرح کہ سوال میں مرقوم ہے، بہت قرض دار ہے، نہ گھر رہنے کا، نہ چاول کھانے کا، نان نفقہ، خور و نوش سے عاجز ہے۔ نہ طعام ایک وقت کا موجود ہے، نہ کوڑی مول لینے کو، نہ ایک جوڑا کپڑا دے سکتا ہے، نہ مہر معجل و نہ مہر مؤجل ادا

کرسکتا ہے۔تو فی الواقع اس لڑکی کا قصور نہیں، کہ کفائت میں معتبر کفائت فی المال بھی ہے۔یعنی وہ ایسا ہو کہ مہر ونفقہ دے سکے۔عالمگیری میں ہے:"وهو ان يكون مالكا لمهر والنفقةوهي المعتبر في ظاهر الرواية حتى ان من لايملكها اولا يملك احدها حتى لا يكون كفاءً كذا في الهدايه۔"

پس جب کہ وہ اس کا کفو نہیں۔تو اگر لڑکی چودہ سال کی بالغہ ہے، قطع نظر اس سے کہ عورت نکاح کا انکار کرتی ہے۔ چونکہ ولی سے اجازت نہ ملی، بغیر اس کی رضا کے نکاح کرلیا بطور خود تو موافق مذہب مفتیٰ بہ نکاح سرے سے ہوا ہی نہیں، محض باطل ہے۔اور موافق ظاہر الروایۃ کے اگر چہ صحیح ہے، مگر ولی کو حق فسخ حاصل ہے۔حاکم سے کہہ کر تفریق کراسکتا ہے۔

"امرءة زوجت نفسها من غير كفو صح النكاح في ظاهر الرواية وروى الحسن عن ابي حنيفة ان النكاح لا ينعقدو به اخذ كثير من مشائخنا كذا في المحيط۔"

تبیین میں ہے:"من نكحت غير كفو فوق الولي لما ذكرنا والنكاح ينعقد صحيحاً في ظاهر الرواية۔"

حاشیہ علامہ شلبی میں ہے:"اما على الرواية المختارة للفتوىٰ لايصح العقد اصلاً اذا كانت زوجت نفسها منها۔"

درمختار میں ہے:"ويفتى في غير الكفء بعدم جوازه اصلاًوهو المختار للفتوى لفساد الزمان" (الدر المختار، باب الولی:۳/۵۶)

عقود دریہ میں ہے:سئل في امرءة يريد الزوج بلا رضا ابيها وهو غير كفو كيف احكم في ذلك ؟

الجوب:اذا نكحت بلا رضاء ابيها فرق القاضي بينهما بطلب الولي وهذا ظاهر الرواية عن ائمتناولكن المروى عن الحسن عن ابي حنيفة رضي الله تعالىٰ عنهما بطلان النكاح من غير كفؤ وبه اخذ كثير من مشائخنا قال شمس الائمة وهذا اقرب الىٰ الا حتياط والاحوط سدّ باب التزوج عن غير كفوء ۔قال الامام فخر الدين الفتوىٰ علىٰ قول حسن في زماننا۔ في البحر المفتىٰ به رواية الحسن عن الامام ابي حنيفة من عدم انعقاده اصلاًاذا كان لها ولي ولم يرض قبل فلا يفيد الرضاء بعده اه مختصرا۔"

مفتیٰ بہ روایت حسن کی امام صاحب سے ہے کہ نکاح سرے سے ہوا ہی نہیں، کہ عالمگیریہ اور درمختار میں اور صاحب ہدایہ اور خلاصہ اور قاضی خاں میں "مختار للفتوىٰ" اور علامہ شلبی نے " الرواية المختارة للفتوىٰ" ایضاح میں "وعليه الفتوى" فرمایا۔هكذا في فتح الله المعين وتبيين وبزازيه وخزانة المفتيين۔ والله تعالىٰ اعلم۔

بلاشبہ جواب صواب ہے واللہ تعالیٰ اعلم۔فقیر سراپا تقصیر وصی احمد حنفی سنی قادری مدرس مدرسہ الحدیث واقع پیلی بھیت محل منیر جان۔

☆☆☆☆☆

مسئلہ مرسلہ مولوی عبدالرؤف از ملک بنگال شوبہ پور ضلع نواکھی ۲۴ محرم الحرام ۱۳۲۳ھ

ماقولکم ایھا العلماء، وارث الانبیاء رحمنا الله ببرکاتکم اندریں مسئلہ کہ زید، زوجہ خودراسہ طلاق داد۔ بعدازاں برائے آوردن درنکاح خود عمرو را بران کلام مقرر و معین نمودہ کہ تو زوجہ مطلقہ مرا بعد از انقضائے عدت بنکاح آوردہ بعد از دو یک شب زن مذکورہ راسہ طلاق بدہ۔ عمرو برآں قول مقرر گشتہ، آں زن را بنکاح آوردہ بحسب قرار آں زن راسہ طلاق بداد۔ آں نکاح صحیح است یا نہ؟ و برائے زوج اول حلال است یا نہ؟ اگر علماء عوام الناس رابراں فعل ترغیب بدہند مجرم خواہند شد یا نہ؟ و مصداق قول رسول اللہ ﷺ لعنة الله علی المحلل و المحلل له براو شاں صادق آید یا نہ؟ بادلہ شرعیہ قویہ بمطابق مذہب حنفیہ بیان فرمائید و عنداللہ اجرش بگیرند۔

الجواب

اللھم ارنا الحق حقا و الباطل باطلاً سبحنك لاعلم لنا الا ما علّمتنا نکاح عمرو با زوجہ زید منکوحہ بنکاح صحیح بشرط تحلیل مثل آنکہ گوید، تزوجت علی ان احللك نزد فقیہ اقدم، امام اعظم، سراج الملۃ والدین والائمۃ ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ مکروہ است، وممنوع وگناہ است۔ وہمیں مذہب اہل علم از اصحاب کبار عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ وعثمان بن عفان وعبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم واز تابعین احبار امام سفیان ثوری وابن مبارک است وامام شافعی، واحمد ہم قائلش شدہ اند۔

درہدایہ است: "واذا تزوجھا بشرط التحلیل فالنکاح مکروہ۔" اگر ازاں مطلق بشرط تحلیل نکاح کرد، نکاحش مکروہ است۔ ھکذا فی التبیین والبحر وشرح الوقایہ وفتح اللّٰہ المعین قال فی الدر المختار وکرہ التزوج للثانی (تحریما) درردالمحتار تحت قولہ وکرہ التزوج للثانی است: کذا فی البحر یعنی در بحر ہم کراہتیش مرقوم است۔ لکن اگر تحلیل آں زن برزوج اول عندالعقد محض منوی ومضمر داشت۔ کما ھو المستفاد من ظاھر السوال وشرط در عقد نکرد، مستحق لعن نخواہد شد۔

فی العنایہ، لو اضمر ذلك فی قلبه لم یتحقق اللعن، ورنہ مکروہ است بلکہ آں مرد ان شاء اللہ تعالیٰ ماجور خواہد شد۔ کما فی البحر والتبیین درقہستانی از مضمرات ست (کہ آنرا علامہ ابن عابدین شامی شارح در مختار تحت قولہ لایکرہ کردہ: بل یحل فی قولھم جمیعاً بلکہ بالاتفاق حلال است مراورا۔ باز نکاح بشرط تحلیل اگرچہ گناہ است، فامادر حصول تحلیل آں مرزوج اول را نہ اشتباہ است چوں عمرو بالغ یا مراہق کہ مثلش جماع می تواند کرد، آں را بعد وطی طلاق داد۔ بعد انقضائے عدت برزوج اول بلاشبہ حلال است ہے۔ لوجود الدخول فی النکاح الصحیح۔ در ہدایہ است: فان طلقھا بعد وطیھا حلت للاول پس اگر آں مرد، آں زن را بعد وطی طلاق داد، برزوج اول حلال است۔ فی الدر المختار: "کرہ بشرط التحلیل وان حلت للاول لصحة النکاح وبطلان الشرط فلا یجبر علی الطلاق کما حققه الکمال۔"

"نکاح بشرط تحلیل مکروہ است اگرچہ آن زن برائے شوی حلال شد بسبب صحت نکاح وبطلان این شرط۔ پس زوج ثانی اگرچہ بشرط طلاق درعقد آوردہ باشد برطلاق جبرنکردہ شدہ۔ چنانچہ امام کمال ابن ہمام تحقیق فرمودہ است۔"

وعلمائے کہ برتزویج بشرط تحلیل ترغیب دہند، لاجرم بمضمون الدال علی الشی کفاعلہ اثم ومصداق حدیث لعن رسول اللہ ﷺ الحدیث خواہند شد، احتراز باید کردواز شان علماء پس بعیداست کہ نکاح برائے اجتماع زوجین کردہ می شود، برائے تفریق راترغیب دہند نسأل اللہ العفو والعافیۃ۔ واللہ تعالی اعلم

☆☆☆☆☆

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ نابالغ کا نکاح اس کا باپ کرسکتا ہے یانہیں اور ماں کومنع کرنے کا حق ہے یانہیں اور ولی کون کون ہیں؟

الجواب

بلاشبہ جائز ہے۔ کنزالدقائق میں ہے:"وللولی انکاح الصغیر و الصغیرۃ۔""یعنی جائز ہے نکاح کردیناولی کوصغیراورصغیرہ کا"۔ اورعصبہ بہ ترتیب ارث ہے۔ یہاں تک کہ اقرب کے ہوتے ابعد مجوب ہے۔

ہدایہ میں ہے:"والترتیب فی العصبات فی ولایۃ النکاح کالترتیب فی الارث والابعد محجوب با الاقرب۔"

پس جب کہ باپ نکاح کرنا چاہتا ہے ماں منع نہیں کرسکتی اور باپ کا نکاح کردینا جائز ہے۔ واللہ اعلم وعلمہ اتم واحکم۔

☆☆☆☆☆

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اندریں مسئلہ کہ اگرولی غیرجابردخترک نابالغہ رابنکاح زید داد۔ بعدازبلوغ آں دخترک بروفق شرع برفسخ نکاح قادراست یانہ؟ نیزبرتقدیراول نزدمحمد وابوحنیفہ بعض ازشرائط فسخ نکاح قضائے قاضی پست۔ لہذامعترض گویدکہ دریں دیار بوجہ عدم قاضی نہ دخترک پس ازبلوغ برفسخ نکاح قادرنیست ۔بدلیل عقلی ونقلی ایں اعتراض درست شودیانہ؟ بینواوتوجروا۔

الجواب

زبانی سائل معلوم شدکہ نکاح ہذا بموجودگی اب نمودہ وپدرش بمجلس نکاح حاضرنبودوبعداستماع خبرجلسہ اولی سکوت کردہ نجلسۂ ثانیہ اوکردوبراں راضی شد۔ پس برتقدیرصدق مستفتی نکاح مذکورباطل محض است۔ اصلاروئے صحت ندارد۔وفی الدر:"فلو زوج الا بعد حال قیام الاقرب توقف علیٰ اجازتہ اہ الیٰ ان اجاز جازو الا فلا واذالم یجزلم یجز۔" یعنی اگرولی ابعدوقت موجودگی ولی اقرب نکاح کرد۔ براجازت موقوف خواہدماند۔ پس اگر اجازت دادنکاح صحیح ودرست شدوگرردکردباطل است ۔ پس چوں اجازت نہ دادوردکرد، ناجائزباطل است۔ وسکوتش

بہ مجلس اول ہم نیست کہ رضا صراحۃً و دلالۃً مثل قبض مہر یا فرستادن دختر خود را نزد ولی وغیر ذلک درکار است۔

قال العلامة الشامی فی حواشیه: "(قوله توقف علیٰ اجازته) تقدم ان البالغة لوزوجت نفسها غیر کفو فللولی الاعتراض مالم یرض صریحا او دلالة لقبض المهر ونحوه فلم یجعلوا سکوتها اجازة والظاهر ان سکوته ههنا کذالك فلا یکون سکوته اجازة لنکاح الا بعد وان کان حاضرا فی مجلس العقد ومالم یرض صریحا او دلالة تامل۔"

واما جواب این آمد کہ صورت فسخ بودی چگونہ کردہ شدی پس از آنجا کہ در عامۂ بلاد ہند بوجہ سلطنت مسلمانان، قاضی شرع مفقود و حکم عنقاء دارد، چارہ کار ایں بود کہ زوجہ معاملہ مذکورہ را پیش حکم برد کہ او بعد ثبوت بمواجہ شوہر تفریق کند۔ فان الحکم کالقاضی کل مالیس بحد ولا قود ولا دیة کما نص علیه فی عامة الکتب للمذهب۔

مگر تحکم بلا رضائے فریقین نتواں شد۔ اگر زوج تن برضا ندہد، حکم حکم مقبول نیفتد و در زمان فقدان سلطان اسلام، قضاۃ ہر کہ از علمائے سنت اعلم وافقہ و اہل باشد، دریں چنیں امور قائم مقام او می باشد۔ می رسید کہ پیش آں عالم رفتی و از کار خود سخن گفت و عالم بعد ثبوت مواجہت شوہر تفریق فرمودے۔ فاما ایں معاملہ دریں دیار پیش نمی رود۔ اگر بعد تفریق عالم زن تحکم شوہر نمی گرفتہ خود را بزنی دیگر دہد۔ شوہر بہ کچہری ہا ناشی می تواں شد۔ پس اولیٰ آنکہ بریاستہ اسلامیہ نزد قاضی وے کہ مجاز عام من جانب نواب باشد، تفریق خواہد۔ بتفریقش نکاح فسخ خواہد شد۔ اینجا دقت ہمیں است کہ تقاضہ محل الغائب روانیست و ریاست را بر شہر کہ سائل قلم بردار نیست ولایت کرا خواہد داد۔ فاما بسبب معاہدہ کہ میاں ریئسان وانگریزاں است، آناں بالجبر بذریعہ کلکٹر ایں ظلمت می توانند کرد و گوا ہیم نتوانند پیش اعلم بلد معاملہ بپایاں رسانند تا عنداللہ تفریق حاصل نشود تا آنکہ آں زن گوید کہ تفریق یافتہ ام بلکہ از سر مقدمہ پیش کند کچہری ہا نبہ...... شرع اند۔ چوں ثابت شود کہ ولی ابعد بے اجازت اقرب تزویج کرد و اقرب رونمود، حکم برو خواہند داد و ایں حکم مطابق آں حکم خواہد شد۔ والله تعالیٰ اعلم۔

اصاب المجیب جزاه القریب جز الا یثیب عبده المذنب احمد رضا خاں القادری۔

☆☆☆☆☆

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ ہندہ بالغہ کا نکاح اس کے بھائی نے بلا رضامندی اس کے اور بلا قبول اس کے، زید سے کر دیا۔ اور حیلہ سے زید کے مکان پر بھائی لے گیا اور جس وقت نکاح کی خبر ہندہ نے سنی فوراً وہاں سے چلی آئی۔ یہ نکاح درست ہے یا نہیں؟

الجواب

صورت مسئولہ میں حسب بیان سائل معلوم ہوا کہ ہندہ بالغہ ہے۔ لہذا بغیر رضا اس کے اور بلا اجازت اس کی ہرگز درست نہیں۔ یہ نکاح نہیں ہوا۔ ولایت جز نابالغہ پر کسی کو حاصل نہیں واللہ اعلم۔ محمد یسین

بیشک نکاح نہیں ہوا کیونکہ عورت نابالغہ کا نکاح بدون اس کے اذن کوئی بھی نہیں کرا سکتا۔ قال النبی ﷺ: "لا

تنکح الایم حتی تستامر ولا تنکح البکر حتی تستاذن۔" الحدیث متفق علیه ۔ وعن حسناء بنت خدام ان اباها زوجها وهی ثیب (ای بالغة)فکرهت ذالك فاتت رسو ل ﷺ فرد نکاحها رواه البخاری ۔

حرره العبد الضعیف محمود غفرله

یہ جواب غلط ہے۔سوال میں صرف اتنا ہے کہ ہندہ بالغہ کا نکاح اس کے بھائی نے بغیر اس سے اجازت لئے زید سے کرادیا۔ جب ہندہ کو خبر ہوئی، فوراً چلی آئی۔ اس پر یہ کہنا کہ ہرگز نکاح درست نہیں اور بیشک یہ نکاح نہ ہوا، محض غلط ہے۔ نکاح ضرور درست ہے اور ضرور ہو گیا۔ اجازت نہ لینے سے اس قدر ہوا کہ نکاح فضولی قرار پایا۔ پھر نکاح فضولی صرف درست نہیں بلکہ صحیح ومنعقد ہے۔ ہاں اس کا نفاذ اجازت پر موقوف رہتا ہے۔ اگر اجازت دیدے نافذ ہے، چاہے رد کرے تو باطل ہے۔ پر یہاں کوئی کلمہ بھی مذکور نہیں۔ صرف اتنا ہے کہ وہ سن کر فوراً چلی آئی۔ چلا آنا ممکن ہے کہ بر بنائے عدم رضا ہو یا بر بنائے شرم وحیا ہو، محتمل بات سے خواہی نخواہی رد قرار دینا، محض جہالت ہے۔ اس کا جواب مستند یہ ہے کہ نکاح صحیح سمجھا جائے گا اور ہو گیا۔ اور اس کا نفاذ اجازت ہندہ پر موقوف ہے۔ واللہ اعلم۔

☆☆☆☆☆

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ کے بارے میں کہ زید نے ہندہ کو نابالغہ میں شادی کیا اور ہندہ کے والدین نہیں تھے۔ نانا نانی نے پرورش کیا اور ان کو ولی مان شادی دلایا۔ اور ہندہ کا اس وقت سے لے کر وقت شادی تک کوئی واسطہ نہیں رہا۔ اور ہندہ نے از شادی تا بعد بلوغیت آمد ورفت کا سلسلہ جاری رکھا۔ تقریباً شادی کو ڈیڑھ سال ہو رہا ہے......... ہوئی ہے اور اس کے نانا نے ان کو آنے سے باز رکھا ہے......... وقت شادی ان کے چچا کی موجودگی پر میں نے ولی بن کر شادی دلایا۔ لہٰذا نکاح منسوخ ہے۔ آپ سے درخواست ہے کہ یہ بتائیں کہ نکاح ہوا یا نہیں؟ سوال کا جواب مفصل دیں۔ (نام ندارد)

الجواب

بیان سائل سے معلوم ہوا کہ ہندہ کی شادی کو ڈیڑھ سال ہوئے۔ شادی کے چھ ماہ بعد وہ بالغہ ہوئی اور شادی کے دن سے اس وقت تک شوہر سے راضی اور اس نکاح سے خوش ہے۔ اور سوال میں یہی ہے کہ "ہندہ نے از شادی تا بعد بلوغیت آمد ورفت کا سلسلہ جاری رکھا"۔ اس لئے یہ نکاح کہ ولی بعید نے پڑھایا اور ہندہ نے بعد بلوغ پسند کیا، انکار نہ کیا، جائز وثابت ہے۔

ہدایہ میں ہے: "وان زوجهما غیر الاب والجد فلکل منهما الخیار اذا بلغ ،ان شاء اقام علی النکاح وان شاء فسخ ۔"

ہندہ کے نانا کا اس کو شوہر کے پاس آنے سے روکنا سخت گناہ اور "یُفَرِّقُوْنَ بَیْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ" (البقرة:۲: ۱۰۲) میں داخل ہے۔ اور یہ بے معنی دلیل پیش کرنا کہ "وقت شادی ان کے چچا کی موجودگی پر میں نے ولی

بن کر شادی دلایا لہٰذا نکاح منسوخ ہے'' عجیب بے عقلی اور گناہ کا اعادہ کرنا ہے۔ اگر چچا کی موجودگی میں نانا کے نکاح پڑھانے سے نکاح نہیں ہوتا تو کیا اس نے اپنی نواسی کو زنا کرانے کے لئے زید کے حوالہ کیا تھا۔ اس کے نانا کو چاہئے کہ خدا سے ڈرے اور میاں بیوی میں تفرقہ کا باعث اور اپنے کو مورد طعن نہ بنائے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

محمد ظفر الدین قادری رضوی غفرلہ

صدر مدرس جامعہ لطیفیہ بحر العلوم کٹیہار۔ ۱۱؍ ذی یقعدہ بروز یکشنبہ ۱۳۵۱ھ

☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ زید فضولی نے ہندہ بالغہ، باکرہ کا نکاح خالد سے بلاتعین دو گواہ باجازت باپ ہندہ کے بعوض مبلغ اکیس ہزار روپیہ (جو کہ مہر مثل سے نصف کم سے قریب ہے) ایک جماعت عام میں کر دیا۔ زید یا پدر ہندہ نے خود ہندہ سے نہ قبل نکاح اجازت لی تھی اور نہ بعد نکاح اطلاع دی۔ مگر ہندہ کو قبل سے خبر تھی کہ آج خالد سے میرا نکاح ہے اور جب دوسرے اجنبی لوگوں نے نکاح کی خبر ہندہ کو دی تو ہندہ چپ رہی اور انکار نہیں کیا اور خلوت صحیحہ بھی ہوگئی۔ ایسی صورت میں نکاح ہوگیا یا تجدید نکاح کی ضرورت ہے؟ بینوا بالکتاب توجروا یوم الحساب

الجواب واللہ الموفق للصواب۔

الجواب: اس صورت میں نکاح ہندہ کی صریح اجازت پر موقوف ہے۔ لہٰذا لازم ہے کہ ہندہ سے صاف لفظوں میں منظوری نکاح کا اقرار کرا لیا جائے ورنہ ابدالآباد زنا ہوتا رہے گا اور اولاد ولد الحرام قرار پائے گی جیسا کہ ہدایہ میں ہے:

''واذا استاذنها الولی فسکتت او ضحکت فهو اذن بقوله ﷺ البکر تستامر فی نفسها فان سکتت فقد رضیت اه قال وان فعل هذا غیر الولی لم یکن رضاء حتی تتکلم به لان هذا السکوت نقلة الالتفات الیٰ کلامه فلم یقع دلالة علیٰ الرضا ولو وقع فهو محتمل والاکتفاء بمثله للحاجة والحاجة فی حق غیر الاولیاء بخلاف اذا ما کان المستامر رسول الولی لانه قائم مقامه انتهی۔''

اگر یہ کہا جائے کہ خلوت صحیحہ سے بڑھ کر اور رضامندی کے لئے صراحت کی کیا ضرورت ہے؟ تو جواب یہ ہے کہ احکام شرعیہ کی تکمیل ضروری ہے اور بلا تصریح کے محض وطی ہو جانے سے صحت نکاح کا حکم نہیں دے سکتے ہیں کیونکہ شیوع جہالت کا زمانہ ہے اور جہل شرعاً عذر نہیں واللہ اعلم۔ اور جب کہ نکاح ہذا مجمع عام میں ہوا ہے، دو گواہوں کے تعین نہ ہونے سے کوئی حرج نہیں ہے۔ اور جبکہ نکاح ہذا موقوف ہے تو صرف تصریح اذن سے نافذ ہو جائے گا، دوبارہ نکاح پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اور جبکہ ہندہ کے باپ نے مہر مثل سے کم پر اجازت دی ہے تو ولی کو فسخ نکاح کا حق ہی نہ رہا واللہ اعلم بالصواب۔

نمقه المسکین ابو المظفر محمد سعید الدین عفی عنه المدرس الاول فی المدرسة العزیزیه

بین السوال والجوب عجب اضطراب مشوش قلب واقع ہے۔ سوال میں زید نکاح پڑھانے والے کو فضولی بتایا گیا ہے اور فضولی وہ شخص ہے جو مامور بانشائے عقد نہ ہو اور جواب میں یہ عبارت ''اور جبکہ ہندہ کے باپ نے مہر مثل سے کم پر اجازت دیدی ہے تو ولی کو فسخ نکاح کا حق بھی نہ رہا'' جو سوال کے اندر داخل نہیں ہے، جواب کو مفید اطمینان ہونے سے مانع ہوتی ہے کیونکہ یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ آیا باپ کی طرف سے یہ اجازت زید کو حاصل ہوئی تھی اور اسی اجازت کی بناء پر انشاء عقد ہوا؟ اگر یہی صورت ہے تو فضولی نہیں ٹھہرتا بلکہ مامور منجاب اب ہوا۔ فانّی یصح ھذا الجواب یا یہ کہ یہ اجازت باپ سے بعد از انشاء عقد خبر پہونچنے پر پیرایہ رضا میں صادر ہوئی، اس صورت میں گو جواب از روئے عبارت صاحب ہدایہ صحیح ہوسکتا ہے لیکن محل نظر ضرور ہے۔ فقط کتبہ علی نعمت الظواری رحمت زید باری

(سوال مطول و مفصل)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ ہندہ بالغہ باکرہ کی منسوب خالد سے ایک سال سے تھی۔ اور ہندہ اور ہندہ کے باپ وغیرہ کو معلوم تھا کہ آج ہندہ کا نکاح ہے۔ لیکن ہندہ کا باپ چار کوس پر تھا۔ ہندہ کے باپ نے اکبر کے نام سے خط لکھا۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ میں بیمار ہوں۔ پیادہ روی سے مجبور ہوں، سواری ملتی نہیں ہے۔ میں تو چاہتا تھا کہ تاریخ بڑھادی جاتی تاکہ میری بھی شرکت ہوتی۔ مگر جب کہ عورتوں نے تاریخ مقرر کرلی ہے تو انجام ہی ہونا ضرور ہے۔ زید وہاں موجود ہے بعوض مبلغ اکیس ہزار روپیہ نکاح کردے۔ لڑکی میری دانستہ بالغہ ہے، اس کی بھی اجازت لے لے اور احمد آرندہ خط کو زبانی ہدایت بھی ایسی کردی۔ زید ہندہ کے باپ کا حرف پہچانتا تھا بلا اجازت اکبر خط پڑھ کر احمد آرندہ خط کا زبانی بیان سن کر بلالینے ثبوت شہادت، زید نے بعوض مبلغ اکیس ہزار روپیہ (جو کہ مہر مثل سے نصف کم کے قریب ہے) ایک مجمع عام میں بلانامزد کرنے دو گواہ کے، ہندہ کا نکاح خالد سے کردیا۔ زید یا پدر ہندہ نے خود ہندہ سے قبل نکاح اجازت نہیں لی تھی اور نہ بعد نکاح خود زید یا کسی دوسرے شخص خاص نے ہندہ کو نکاح کی خبردی۔ مگر جب نکاح ہوگیا تو گھر باہر شور وغل مچ گیا کہ نکاح ہوگیا، نکاح ہوگیا۔ جس وقت تواتر سے نکاح کی خبر ہندہ کے گھر پہونچی (ہندہ بھیڑ میں تھی) صریح لفظوں میں اقرار یا انکار نہ کیا اور خلوت صحیحہ بھی ہوگئی۔ ہندہ خالد سے راضی ہے اور ہندہ کے باپ کو بھی کوئی کلام نہیں ہے۔ ایسی صورت میں نکاح صحیح ونافذ ہوگیا یا تجدید نکاح وتصریح اذن ہندہ کی ضرورت ہے اور بالفرض اسی صورت میں اگر ہندہ کے باپ کا خط نہیں آتا اور زبانی ہدایت بھی نہیں ہوتی تو کیا جواب ہوگا؟

(انتباہ) مانحن فیہ، میں امورات خمسہ مفصلہ ذیل پر ضرور دلیل شافی ہونی چاہئے:

(۱) اجازت بالکتابت جائز ہے یا نہیں؟ اگر جائز ہے تو اس صورت میں زید وکیل منجانب پدر ہندہ قرار پائے گا یا نہیں؟ خانیہ وغیرہ میں مصرح ہے کہ اگر ولی نے بلا اجازت اپنی لڑکی بالغہ کا نکاح پڑھادیا تو یہ نکاح لڑکی کی رضا پر موقوف ہے۔ اگر بالغہ ہے تو سکوت بھی رضا ہوگا جیسا کہ عند الاستیذان سکوت رضا پر محمول ہے۔ پس اگر زید وکیل پدر ہندہ قرار پاتا ہے تو اس کے نکاح پڑھادینے پر سکوت، رضا پر محمول ہوگا یا نہیں؟ اور اگر بالفرض زید وکیل نہیں بلکہ فضولی قرار دیا